زیر نظر حضرت آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد چہارم

مترجم

سید صفدر حسین نجفی

اشاعت

ادارہ علم کی راہ پر (?)

حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور، پاکستان

زیر نظر: استاد محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد چہارم

ترجمہ:
سید صفدر حسین نجفی

اثرِ نگارش:
اہلِ قلم کی ایک جماعت

حوزۂ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور، پاکستان

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب	تفسیر نمونہ (جلد ۴)
زیر نظر	استاد محقق آقائے ناصر مکارم شیرازی
مترجم	سید صفدر حسین نجفی
کتابت	دارالکتابت حضرت کیلیانوالہ (گوجرانوالہ)
ناشر	جامعۃ المنتظر ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور
طابع	منظور اعجاز پریس دربار مارکیٹ لاہور
تعداد اشاعت	۲۲۰۰
تاریخ اشاعت	جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ
ایڈیشن	اول
ہدیہ	۶۰ روپے

ملنے کا پتہ

مکتبۃ الرضا ۔۲۔ دیو سماج روڈ ۔ لاہور

فون نمبر ۳۱۲۸۱۵

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحیم

Marfat.com

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین محترم !

سلام و رحمت

الحمد للہ، ایک منزل اور طے ہوگئی۔ دورِ حاضر کی عظیم تفسیر ــــ تفسیر نمونہ ــــ کی چوتھی جلد کا اُردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

قرآن ــــ خدا کا اپنے بندوں سے آخری کلام ہے، پروردگار کی وحی کی صورت میں اپنے بندوں سے آخری گفتگو ہے اور رہتی دنیا تک قرآن مرکزِ پرکارِ ہدایت ہے۔ یہ وہ عجیب کتاب ہے جو ہر دَور کے انسان سے اُس کی سطح فکر کے مطابق کلام کرتی ہے۔ جوں جوں انسانی تحقیقات ترقی کر رہی ہیں کلامِ الٰہی کے مخفی جوہر انسانوں کے سامنے اور کھلتے جا رہے ہیں ــــ پردے ہٹ رہے ہیں ــــ حقائق آشکار ہو رہے ہیں ہاں البتہ اس کے لیے قرآن کے حقیقی شاگردوں سے وابستگی کی ضرورت ہے۔ وہ حقیقی شاگرد جو منبعِ وحی و رسالت سے متمسک ہوں ــــ جو الٰہی ہدایت کے دسترخوان کے خوشہ چیں ہوں ــــ جو صاحبانِ بصیرت ہوں ــــ جو دنیا کے بدلتے ہوئے رنگ و آہنگ پر نظر رکھتے ہوں ــــ جن کی نگاہ گذشتہ ادوار سے سفر کرتی ہوئی دورِ حاضر تک پہنچی ہو ــــ جو قرآن کو سیکھنے اور سکھانے، تعلیم و تعلم کی کتاب سمجھیں ــــ جو تعصب سے پاک، تنگ نظری سے دُور، صاف دل اور پاک باز ہوں ــــ تاکہ قرآن سے فرد اور معاشرے کا پورا پروگرام اخذ کر سکیں۔

الحمد للہ ــــ تفسیر نمونہ ــــ ایسے ہی شاگردانِ قرآن کی محنتوں اور عرق ریزیوں کا خوبصورت نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر طبقے اور ہر مکتبِ فکر میں مقبولیت حاصل کر رہی ہے اور اس کی شہرت وقت کی بادِ نسیم کے دوش پر پاکیزہ خوشبو کی طرح پھیل رہی ہے۔ ہر قاری ایک جلد پڑھنے کے بعد فوری طور پر اگلی جلد کا تقاضا کرتا ہے۔

ہم آپ سے اس خواہش کا تکرار کرتے ہیں کہ اپنی آراء اور تجاویز سے ہمیں ضرور نوازتے رہیں۔ یقین رکھیے کہ آپ کی ہر رائے، تجویز اور تنقید ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہے۔

چوتھی جلد کے ابتدائی مرحلے میں ہمیں جناب پروفیسر ناصر بلوچ کا تعاونِ قلم حاصل رہا ہے۔ ہم ان کے ممنون ہیں۔

خدمتِ قرآن کے اس راستے میں توفیقاتِ الٰہی کے بغیر سفر ناممکن ہے، تمام حمد و ستائش اُسی کے لیے زیبندہ ہے ــــ درود و سلام ہے صاحبِ رسالت خاتم النبیّین پر جن پر یہ کتاب اتری ــــ جو حق و باطل میں فرق کرنے والی ہے ــــ اور درود و سلام ہے اہلِ بیتِ رسولؐ پر جو معدنِ ہدایت اور ترجمانِ قرآن ہیں۔

ملتمس دُعا

انچارج ــــ مکتبۃ الرضا

لاہور

Marfat.com

اِھداء

" مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان "

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش

تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

Marfat.com

یہ تفسیر

حسبِ ذیل علماؤ مجتہدین کی باہمی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے داؤد الہامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے اسد اللہ ایمانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبد الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

Marfat.com

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱ تفسیر مجمع البیان تالیف ———— مشہور مفسر طبرسی
۲ تفسیر تبیان تالیف ———— عظیم و فقید عالم شیخ طوسی
۳ تفسیر المیزان تالیف ———— علامہ طباطبائی
۴ تفسیر صافی تالیف ———— ملا محسن فیض کاشانی
۵ تفسیر نور الثقلین تالیف ———— عبد علی بن جمعہ حویزی
۶ تفسیر برہان تالیف ———— سید ہاشم بحرانی
۷ تفسیر روح المعانی تالیف ———— علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸ تفسیر المنار تالیف ———— محمد رشید رضا (تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ)
۹ تفسیر فی ظلال القرآن تالیف ———— سید قطب
۱۰ تفسیر قرطبی تالیف ———— محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱ اسباب النزول تالیف ———— ابو الحسن علی بن متویہ واحدی نیشاپوری
۱۲ تفسیر مراغی تالیف ———— احمد مصطفیٰ مراغی

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس تفسیر کے لکھنے کا بنیادی مقصد :

اس تفسیر کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ فارسی زبان میں قرآن مجید کی ایک ایسی تفسیر مہیا کی جائے جو خواص و عوام کے لیے مفید ہو۔ ایسی تفسیر جس کی زبان رواں ہو۔ ایسی تفسیر جس میں پیچیدہ علمی اصطلاحات، مفسرین کے اختلافات، ادھر اُدھر کے بکھرے ہوئے اقوال کی بھرمار نہ ہو۔ ایسی تفسیر جو مختلف علوم کی ترقی کی روشنی میں قرآن سے نئی معلومات فراہم کرسکے۔

ایسی تفسیر جس میں تاریخی قرائن، شان نزول اور ہادیان اسلام سے مروی محکم احادیث سے استفادہ کیا جائے جو اسلامی مصادر و منابع سے ہم تک پہنچی ہیں۔

ایسی تفسیر جو تفسیر ہونے کے علاوہ اسلام کے اصول و فروع کے بارے میں نئے سوالات، دورِ حاضر کے مسائل اور مختلف اعتراضات بھی پیشِ نظر رکھے اور ایسے مسائل کا حل بھی پیش کرے۔

الحمد للہ اس تفسیر کی ابتدائی جلدیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ جلد ہی اُن کی پہلی، دوسری اور تیسری اشاعت ختم ہوگئی۔ یہ گرم جوشی نشاندہی کرتی ہے کہ ایسی آسان اور جدید طرز پر لکھی گئی تفسیر کی دین سے آگاہ طبقوں میں کس قدر پیاس موجود تھی یہی بات سبب بنی کہ بعد والی جلدوں میں زیادہ دقتِ نظر اور دیکھ بھال سے کام لیا جائے لہٰذا ہم نے ایسا ہی کیا۔ مطالب کی جمع و ترتیب میں بھی تجدید نظر کی گئی ہے۔ اگر آپ پہلی اور دوسری تیسری جلد کا موازنہ کریں تو آپ کو واضح پیش رفت دکھائی دے گی[۱] مباحث کو اب زیادہ ہم آہنگ اور کامل تر کر دیا گیا ہے۔ صاحبانِ نظر اور مختلف طبقات کے احباب نے اس کی جتنی قدردانی اور نشر و اشاعت کی تشویق کی ہے اس نے ہمیں اور ولولہ عطا کیا ہے اگرچہ پہلے بھی اور آج بھی اس راہ میں بہت سی مشکلات حائل ہیں۔ البتہ تشویق و تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید بھی ہو رہی ہے اور شاید ہم نے تنقید سے تعریف کی نسبت زیادہ فائدہ اٹھایا ہو یہی وجہ ہے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ بعد والی جلدوں کی تیاری میں اسے پیشِ نظر رکھیں۔ ہماری بڑی سعادت ہوگی اگر دیگر صاحبانِ نظر اس کے مطالعہ کے بعد اس کے کسی نقص کی نشاندہی کریں ہم انہیں اطمینان دلاتے ہیں کہ نقائص و عیوب کے بیان پر کسی تعصب سے کام نہیں لیں گے اور ہم اعتراضات اور یاددہانیوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کریں گے اور یقیناً ان سے استفادہ کریں گے۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ تفسیر قرآن جیسے ناپیدا کنار سمندر سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے ایک کمک ثابت ہوگی اور ہو سکتا ہے قرآن کی زندہ اور عمیق تعلیمات موجودہ افسوسناک صورتِ حال سے مسلمانوں کی نجات کا باعث بن جائیں اور مسلمان کوئی قدم اٹھا سکیں۔

توقع ہے کہ اس سے مراکزِ اسلامی میں تحریک و آگاہی پیدا ہوگی اور وہ دورِ حاضر میں اپنے کندھوں پر پڑی ہوئی اسلامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے مؤثر قدم اٹھائیں گے اور بالخصوص نوجوان نسل کا قرآن سے رشتہ زیادہ محکم ہو سکے گا۔

ناصر مکارم شیرازی

قم ـــ یکم رجب ۱۳۹۶ ہجری

---

[۱] جیسا کہ بتایا جا چکا ہے تفسیر نمونہ جلد اول پر نظرثانی کی گئی تھی اور ہم نے اسی نظرثانی شدہ جلد کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ (مترجم)

Marfat.com

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
سورہ نساء		آیت ۷۸، ۷۹	۳۸
آیت ۷۱	۲۷	کامرانیوں اور شکستوں کا سرچشمہ	۴۰
آیت ۷۲، ۷۳	۲۸	ایک اہم سوال کا جواب	۴۱
آیت ۷۴	۳۰	آیت ۸۰، ۸۱	۴۲
مومنین کو جہاد کے لیے آمادہ کرنا	۳۰	آیت ۸۲	۴۴
آیت ۷۵	۳۱	اعجاز قرآن کی زندہ مثال	۴۵
انسانی جذبوں کو مظلوموں کی مدد کے لیے ابھارا گیا ہے	۳۲	چند اہم نکات	۴۵
چند اہم نکات	۳۲	آیت ۸۳	۴۶
۱۔ اسلامی جہاد کے دو ہدف	۳۲	افواہیں پھیلانا	
۲۔ معاشرے میں آزادیٔ فکر و نظر	۳۳	غلط خبریں اور افواہیں پھیلانے کے نقصانات	۴۷
۳۔ یاور سے پہلے رہبر	۳۳	آیت ۸۴	۴۸
۴۔ بارگاہ الٰہی میں دست نیاز	۳۳	شانِ نزول	۴۸
آیت ۷۶	۳۳	ہر شخص اپنے فرائض کا جواب دہ ہے	۴۹
آیت ۷۷	۳۵	کلام خدا میں "عسیٰ" اور "لعل" کے معنی	۵۰
شانِ نزول	۳۵	آیت ۸۵	۵۱
وہ جو صرف باتیں کرنا جانتے ہیں	۳۶	اچھے یا بُرے کام کی تحریک دلانے کا نتیجہ	۵۱
چند اہم نکات	۳۷	آیت ۸۶	۵۴
۱۔ صرف نماز اور زکوٰۃ کا تذکرہ کیوں؟	۳۷	احترام محبت	۵۴
۲۔ مکہ میں حکم زکوٰۃ	۳۷	سلام عظیم اسلامی تحیہ ہے	۵۵
۳۔ مکہ اور مدینہ میں مختلف لائحہ عمل	۳۷	آیت ۸۷	۵۷

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
آیت ۸۸	۵۸
شانِ نزول	۵۹
آیت ۸۹	۶۰
ایک سوال کا جواب	۶۱
آیت ۹۰	۶۲
شانِ نزول	۶۲
صلح کی پیش کش کا استقبال	۶۳
آیت ۹۱	۶۴
شانِ نزول	۶۴
طرفین سے ساز باز رکھنے والوں کی سزا	۶۵
آیت ۹۲	۶۵
شانِ نزول	۶۶
قتلِ اشتباہ کے احکام	۶۷
چند اہم نکات	۶۸
۱۔ خسارے کی تلافی کے لیے احکام	۶۸
۲۔ مسلمانوں میں دیت سے صرفِ نظر	۶۹
۳۔ غیر مسلموں کے لیے دیت کا پہلے تذکرہ	۶۹
۴۔ اسلامی پیمانوں کی طبعی بنیاد	۶۹
۵۔ غلطی کی سزا	۶۹
آیت ۹۳	۷۰
شانِ نزول	۷۰
قتلِ عمد کی سزا	۷۱
کیا انسانی قتل ابدی سزا کا موجب ہے	۷۱
قتل کی اقسام	۷۳
قتلِ عمد	۷۳
قتلِ شبیہ	۷۴
قتلِ اشتباہ	۷۴
آیت ۹۴	۷۴
شانِ نزول	۷۴
اسلامی جہاد مادی پہلو نہیں رکھتا	۷۶
ایک سوال اور اس کا جواب	۷۶
آیت ۹۵، ۹۶	۷۷
چند اہم نکات	۷۹
۱۔ بلاغت کا ایک پہلو	۷۹
۲۔ درجہ اور درجات	۷۹
۳۔ جہاد کی انتہائی تاکید	۷۹
آیت ۹۷، ۹۸، ۹۹	۸۱
شانِ نزول	۸۱
چند اہم نکات	۸۳
۱۔ روح کی استقامت	۸۳
۲۔ روح قبض کرنے والے ایک یا ایک سے زائد فرشتے	۸۳
۳۔ مستضعف کون ہے	۸۴
آیت ۱۰۰	۸۵
ہجرت اسلام کا ایک اصلاحی حکم	۸۵
اسلام اور ہجرت	۸۶
آیت ۱۰۱	۸۸
نماز مسافر	۸۹
آیت ۱۰۲	۹۲
شانِ نزول	۹۲
چند اہم نکات	۹۴
۱۔ نماز خوف ہر دور میں ہو سکتی ہے	۹۴

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۲۔ دورانِ نمازخوف مسلح رہنے کے حکم میں فرق	۹۴
۳۔ مال ومتاع کی حفاظت	۹۴
۴۔ نماز باجماعت کی اہمیت	۹۴
نماز خوف کی کیفیت	۹۵
آیت ۱۰۳	۹۵
فریضۂ نماز کی اہمیت	۹۵
ایک سوال اور اُس کا جواب	۹۶
آیت ۱۰۴	۹۷
شانِ نزول	۹۷
ہر ہتھیار کے مقابلے میں اس جیسا ہتھیار	۹۷
آیت ۱۰۵، ۱۰۶	۹۹
شانِ نزول	۹۹
خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرو	۱۰۰
آیت ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹	۱۰۲
آیت ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲	۱۰۴
جرمِ تہمت	۱۰۶
آیت ۱۱۳	۱۰۷
انبیاء کا سرچشمۂ عصمت	۱۰۸
آیت ۱۱۴	۱۰۹
سرگوشیاں	۱۱۰
آیت ۱۱۵	۱۱۲
شانِ نزول	۱۱۲
اجماع کی حجیت	۱۱۳
آیت ۱۱۶	۱۱۴
شرک ناقابلِ معافی گناہ	۱۱۵
آیت ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱	۱۱۶
شیطانی سازشیں	۱۱۷
آیت ۱۲۲	۱۱۹
آیت ۱۲۳، ۱۲۴	۱۲۰
شانِ نزول	۱۲۱
سچے اور جھوٹے امتیازات	۱۲۱
ایک سوال کا جواب	۱۲۲
آیت ۱۲۵، ۱۲۶	۱۲۳
خلیل کسے کہتے ہیں	۱۲۴
آیت ۱۲۷	۱۲۵
حقوقِ نسواں کے بارے میں مزید گفتگو	۱۲۶
آیت ۱۲۸	۱۲۷
شانِ نزول	۱۲۷
صلح بہتر ہے	۱۲۸
آیت ۱۲۹، ۱۳۰	۱۲۹
ایک سے زیادہ شادیوں کے لیے عدالت شرط ہے	۱۳۰
ایک اہم سوال کا جواب	۱۳۱
آیت ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴	۱۳۲
آیت ۱۳۵	۱۳۵
عدالتِ اجتماعی	۱۳۶
آیت ۱۳۶	۱۳۸
شانِ نزول	۱۳۸
آیت ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹	۱۳۹
ہٹ دھرم منافقین کا انجام	۱۴۰
آیت ۱۴۰	۱۴۱
شانِ نزول	۱۴۲
بُری مجلس میں نہ بیٹھو	۱۴۲
چند اہم نکات	۱۴۲

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
آیت ۱۴۱	۱۴۳
منافقین کی صفات	۱۴۳
آیت ۱۴۲، ۱۴۳	۱۴۵
منافقین کی پانچ صفات	۱۴۵
آیت ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶	۱۴۷
آیت ۱۴۷	۱۴۹
خدا کی سزا انتقامی نہیں	۱۴۹
آیت ۱۴۸، ۱۴۹	۱۵۰
اسلام کے چند اخلاقی احکام	۱۵۰
ظالم سے درگزر اس کی تقویت کا سبب نہیں؟	۱۵۱
آیت ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲	۱۵۳
انبیاء میں فرق نہیں ہے	۱۵۳
گناہ اور سزا میں تناسب	۱۵۴
آیت ۱۵۳، ۱۵۴	۱۵۵
شان نزول	۱۵۶
یہودیوں کی بہانہ سازی	۱۵۶
دو اہم نکات	۱۵۸
آیت ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸	۱۵۸
یہودیوں کی کچھ اور کارستانیاں	۱۵۹
مسیح قتل نہیں ہوئے	۱۶۰
آیت ۱۵۹	۱۶۳
ایک سوال اور اس کا جواب	۱۶۵
آیت ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲	۱۶۶
یہودیوں میں سے صالح اور غیر صالح افراد کا انجام	۱۶۷
چند اہم نکات	۱۶۷
۱۔ یہودیوں کے طیبات کی حرمت	۱۶۷

مضمون	صفحہ نمبر
۲۔ کیا یہ حرکت عمومی تھی؟	۱۶۸
۳۔ سود کی حرمت قبل از اسلام	۱۶۸
یہودیوں میں سے اہلِ ایمان	۱۶۸
آیت ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶	۱۶۹
چند اہم نکات	۱۷۱
۱۔ اسلام تمام ادیان کی خوبیوں کا امتزاج ہے	۱۷۱
۲۔ آسمانی کتب کی اقسام	۱۷۱
۳۔ اسباط سے کیا مراد ہے	۱۷۲
۴۔ انبیاء پر نزولِ وحی کی کیفیت	۱۷۲
آیت ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹	۱۷۳
آیت ۱۷۰	۱۷۴
آیت ۱۷۱	۱۷۵
خیالی تثلیث	۱۷۶
تثلیث اور الوہیت مسیح کا ابطال	۱۷۶
۱۔ عیسیٰ مریم کے بیٹے ہیں	۱۷۶
۲۔ عیسیٰ خدا کے رسول ہیں	۱۷۷
۳۔ عیسیٰ خدا کا کلمہ ہیں	۱۷۷
۴۔ عیسیٰ روح ہیں	۱۷۷
تثلیث۔ عیسائیت کی سب سے بڑی کج روی	۱۷۹
تثلیث کے بارے میں چند اہم نکات	۱۷۹
۱۔ اناجیل میں عقیدۂ تثلیث نہیں ہے	۱۷۹
۲۔ عقیدۂ تثلیث خلافِ عقل ہے	۱۸۰
۳۔ خدا ہر لحاظ سے یکتا ہے	۱۸۰
۴۔ خدا انسانی لباس میں کیونکر ممکن ہے	۱۸۱
۵۔ پُرفریب تشبیہیں	۱۸۱
۶۔ ایک اور اشتباہ	۱۸۲

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
آیت ۱۷۲، ۱۷۳	۱۸۲
شانِ نزول	۱۸۳
عیسیٰ خدا کے بندے ہیں	۱۸۳
دو اہم نکات	۱۸۴
۱۔ استنکفوا اور استکبروا	۱۸۴
۲۔ ملائکہ انکارِ عبادت نہیں کرتے	۱۸۴
آیت ۱۷۴، ۱۷۵	۱۸۵
نورِ مبین	۱۸۵
آیت ۱۷۶	۱۸۶
شانِ نزول	۱۸۷
بہن بھائی کی میراث کے چند احکام	۱۸۸
سورۂ مائدہ	۱۸۹
سورہ مائدہ کے مضامین	۱۹۱
آیت ۱	۱۹۲
ایفائے عہد ضروری ہے	۱۹۲
چند اہم نکات	۱۹۴
۱۔ ایک فقہی قاعدہ	۱۹۴
۲۔ ایفائے عہد کی اہمیت	۱۹۴
آیت ۲	۱۹۷
ایک آیت میں آٹھ احکام	۱۹۸
نیکی میں ساتھ دینا ضروری ہے	۲۰۰
آیت ۳	۲۰۲
گوشت کے استعمال میں اعتدال	۲۰۶
دین کس روز اپنے کمال کو پہنچا	۲۰۷
ایک اہم سوال اور اس کا جواب	۲۱۱
اضطراری کیفیت میں حرام گوشت کا حکم	۲۱۳
آیت ۴	۲۱۳

مضمون	صفحہ نمبر
شانِ نزول	۲۱۴
حلال شکار	۲۱۴
"تعلمونهن مما علمکم الله" میں چند نکات	۲۱۵
آیت ۵	۲۱۶
اہلِ کتاب کا کھانا کھانا اور ان میں شادی بیاہ کرنا	۲۱۶
غیر مسلم عورتوں سے شادی	۲۱۹
آیت ۶	۲۲۱
جسم اور روح کی پاکیزگی	۲۲۲
وضو اور تیمم کا فلسفہ	۲۲۶
غسل کا فلسفہ	۲۲۶
آیت ۷	۲۲۹
خدا سے باندھے گئے پیمان	۲۲۹
آیت ۸، ۹، ۱۰	۲۳۱
قیام عدالت کا تاکیدی حکم	۲۳۱
عدالت ایک اہم اسلامی حکم	۲۳۲
آیت ۱۱	۲۳۴
آیت ۱۲	۲۳۶
آیت ۱۳	۲۳۹
یہودیوں کی تحریفات	۲۴۰
کیا خدا کسی کو سنگدل بناتا ہے	۲۴۱
آیت ۱۴	۲۴۲
دائمی دشمن	۲۴۲
چند اہم نکات	۲۴۲
۱۔ "اغرینا" کا مفہوم	۲۴۴
۲۔ "عداوت" اور "بغضاء" کا مفہوم	۲۴۴
۳۔ کیا یہودیت اور عیسائیت ہمیشہ موجود رہیں گی	۲۴۴

Marfat.com

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۲۴۵	آیت ۱۵، ۱۶	۲۷۵	آیت ۳۵
۲۴۷	آیت ۱۷	۲۷۵	توسل کی حقیقت
۲۴۸	کیسے ممکن ہے کہ مسیح خدا ہو؟	۲۷۷	قرآن اور توسل
۲۵۰	آیت ۱۸	۲۷۸	روایاتِ اسلامی اور توسل
۲۵۳	آیت ۱۹	۲۸۰	چند قابلِ توجہ باتیں
۲۵۴	ایک سوال اور اس کا جواب	۲۸۱	آیت ۳۶، ۳۷
۲۵۵	آیت ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶	۲۸۲	آیت ۳۸، ۳۹، ۴۰
۲۵۶	بنی اسرائیل اور سرزمینِ مقدس	۲۸۳	چور کی سزا
۲۶۳	آیت ۲۷، ۲۸، ۲۹	۲۸۴	چند اہم نکات
۲۶۳	روئے زمین پر پہلا قتل	۲۸۴	۱۔ چور کو سزا دینے کی شرائط
۲۶۵	چند اہم نکات	۲۸۵	۲۔ ہاتھ کاٹنے کی مقدار
۲۶۵	۱۔ آدمؑ کے بیٹوں کے نام	۲۸۵	۳۔ کیا یہ سخت سزا ہے
۲۶۵	۲۔ "قربان" کا مفہوم	۲۸۶	ایک اعتراض کا جواب
۲۶۵	۳۔ قبولیت کی دلیل کیا تھی	۲۸۶	آیت ۴۱، ۴۲
۲۶۶	۴۔ ظلم کا پہلا سرچشمہ حسد ہے	۲۸۸	شانِ نزول
۲۶۶	آیت ۳۰، ۳۱	۲۸۹	دوست اور دشمن کے درمیان فیصلہ
۲۶۶	ظلم پر پردہ پوشی	۲۹۲	آیت ۴۳
۲۶۹	آیت ۳۲	۲۹۳	آیت ۴۴
۲۶۹	انسانی رشتہ	۲۹۵	آیت ۴۵
۲۷۱	آیت ۳۳، ۳۴	۲۹۶	قصاص اور درگزر
۲۷۲	شانِ نزول	۲۹۸	آیت ۴۶
۲۷۳	لوگوں کے جان و مال پر حملہ کرنے والوں کی سزا	۳۰۰	آیت ۴۷
۲۷۳	چند اہم نکات	۳۰۰	وہ جو قانونِ الٰہی کے مطابق حکم نہیں کرتے
۲۷۳	۱۔ خدا اور رسول سے جنگ کرنے سے کیا مراد ہے	۳۰۱	آیت ۴۸
۲۷۳	۲۔ ہاتھ پاؤں کاٹنے کا کیا مطلب ہے	۳۰۳	آیت ۴۹، ۵۰
۲۷۳	۳۔ کیا چاروں سزائیں اختیاری ہیں	۳۰۴	شانِ نزول

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
ایک سوال اور اس کا جواب	۳۰۵	۵۔ آیت میں "ولایت بالفعل" کا ذکر ہے؟	۳۲۲
آیت ۵۱، ۵۲، ۵۳	۳۰۶	۶۔ حضرت علیؑ نے اس آیت سے خود استدلال کیوں نہیں کیا	۳۲۲
شانِ نزول	۳۰۷	۷۔ قبل اور بعد کی آیات سے آیۂ ولایت کا ربط	۳۲۳
عیزوں پر تکیہ	۳۱۰	۸۔ ایسی قیمتی انگشتری کہاں سے آئی تھی؟	۳۲۳
آیت ۵۴	۳۱۱	آیت ۵۶	۳۲۴
آیت ۵۵	۳۱۴	آیت ۵۷، ۵۸	۳۲۵
شانِ نزول	۳۱۵	شانِ نزول	۳۲۵
آیۂ ولایت	۳۱۵	اذان اسلام کا عظیم شعار ہے	۳۲۷
احادیث، مفسرین اور مورخین کی شہادت	۳۱۷	اذان وحی کے ذریعے پہنچی	۳۲۸
اعتراضات کا جواب	۳۱۹	آیت ۵۹، ۶۰	۳۲۹
۱۔ "اَلَّذِیْنَ" جمع کا صیغہ ہے۔	۳۱۹	شانِ نزول	۳۳۰
۲۔ حالتِ رکوع میں زکوٰۃ؟	۳۲۰	آیت ۶۱، ۶۲، ۶۳	۳۳۲
۳۔ لفظ "ولی" کا مفہوم	۳۲۱	آیت ۶۴	۳۳۵
۴۔ حضرت علیؑ پر واجب زکوٰۃ	۳۲۱	آیت ۶۵، ۶۶	۳۳۸

Marfat.com

تفسیر نمونہ

جلد چہارم

کا آغاز ـــــــ

سورہ نساء کی آیۃ ۷۱ سے ہوتا ہے ۔

جس میں

جہادِ اسلامی کے بارے میں مختلف مباحث ہیں ـــــ اور

مسلمانوں سے بیدار رہنے کا تقاضا ہے ۔

اور اس کا اختتام ـــــــ

سورہ مائدہ کی آیت ۶۶ پر ہوتا ہے ۔

جس میں

احکامِ الٰہی پر عمل کے خوشگوار نتیجے کی خبر دی گئی ہے ۔

یہ تفسیر ـــــ قرآن پر ایک تازہ تحقیق ہے ـــــ جس میں عہدِ حاضر کی ضروریات، تقاضوں، سوالات اور مختلف مکاتبِ خیال کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔

Marfat.com

۷۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝

ترجمہ

۷۱۔ اے ایمان والو (دشمن کے مقابلے میں) اپنی آمادگی کی حفاظت کرو اور متعدد دستوں میں یا اجتماعی دستہ کی صورت میں (موجود حالات کے مطابق) دشمن کی طرف پیش قدمی کرو۔

تفسیر

"حذر" بروزن "خضر" بیداری تیار رہنے اور خطرے کے مقابلے میں چوکس اور مستعد رہنے کے معنی میں ہے۔ بعض اوقات یہ لفظ اس وسیلہ اور ذریعہ کے معنی میں بھی آتا ہے جس کی مدد سے خطرے کا مقابلہ کیا جا سکے۔ "ثبات" ثبہ (بروزن گنہ) کی جمع ہے۔ غیر منظم اور منتشر دستوں کے معنی میں لیا گیا ہے۔ قرآن مجید مندرجہ بالا آیت میں تمام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے انھیں اپنے اجتماع اور وجود کے تحفظ کے لیے دو احکام اور ہدایات دیتا ہے۔ پہلے کہتا ہے اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو، بڑی باریک بینی سے دشمنوں اور ان کے جاسوسوں پر نظر رکھے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان کی طرف سے غافل ہو کر کسی خطرے سے دوچار ہو جاؤ (یا ایھا الذین اٰمنوا خذوا حذرکم) اس کے بعد حکم دیتا ہے کہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے مختلف طریقوں اور تکنیکوں (TECHNIQUES) سے استفادہ کرو اور متعدد دستوں کی صورت میں یا اکٹھے ہو کر دشمن کو زیر کرنے نکل پڑو (فانفروا ثبات او انفروا جمیعًا) جہاں مختلف دستوں اور بکھری ہوئی ٹولیوں کی صورت میں حرکت کرنا ضروری ہو وہاں اسی طریقے سے آگے بڑھو اور جہاں یہ امر لازمی ہو کہ سب ایک متحد لشکر کی صورت میں دشمن کے مقابلے پر نکلیں، وہاں اجتماعیت سے غفلت نہ برتو ——— بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں "حذر" کی تفسیر صرف اسلحہ کے معنی میں کی ہے حالانکہ حذر کے وسیع معنی ہیں اور اس کا مفہوم اسلحہ تک محدود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں خود اسی سورہ کی آیہ ۱۰۲ میں واضح دلیل موجود ہے جہاں حذر اسلحہ سے مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے جہاں خدا فرماتا ہے

ان تضعوا اسلحتکم وخذوا حذرکم

کوئی حرج نہیں کہ ضرورت کے وقت نماز کے موقع پر میدان جنگ میں اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دو۔ لیکن حذر یعنی نگرانی اور آمادگی پر مستعد رہو۔

یہ آیت جامع ہے اور اپنے اندر تمام پہلو لیے ہوئے ہے۔ تمام مسلمانوں کے لیے اس میں ہر عہد اور ہر دور کے مطابق حکم موجود ہے

Marfat.com

کہ اپنی امنیت کی حفاظت اور اپنی سرحدوں کے دفاع کے لیے ہمیشہ مستعد رہو۔ اور ایک قسم کی مادی و معنوی آمادگی ہمیشہ تمہاری جمعیت پر غالب و حاکم رہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ "حذر" کا معنی اس قدر وسیع ہے کہ جو ہر قسم کے مادی روحانی اور معنوی وسیلہ اور ذریعہ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہر وقت اور ہر زمانے میں دشمن کی حیثیت، اس کے ہتھیاروں کی نوعیت اور جنگی طور طریقوں سے باخبر ہوں اور اپنی تیاری کے معیار کے ساتھ ساتھ دشمن کے اسلحہ کی تعداد اور کارکردگی کو جانتے ہوں۔ کیونکہ یہ تمام مذکورہ باتیں دشمن کی طرف سے خطرہ کی پیش بندی اور "حذر" کے مفہوم کو سمجھنے میں مؤثر ہیں۔

دوسری طرف اپنے دفاع کے لیے ہر طرح کی مادی و روحانی تیاری ناگزیر ہے۔ یہ تیاری تعلیمی، اقتصادی اور افرادی قوت کی فراہمی کے حوالے سے بھی مکمل ہونا چاہیے۔ اسی طرح جدید اسلحہ کی فراہمی اور اس کے استعمال کے طور طریقوں سے آگاہی بھی ضروری ہے۔

یہ امر مسلّم ہے کہ مسلمانوں نے اگر صرف اسی ایک آیت کو اپنی زندگی پر منطبق کرلیا ہوتا تو اپنی تمام تاریخ میں کبھی شکست اور ناکامی کا مُنہ نہ دیکھتے۔ جیسا کہ اوپر والی آیت میں اشارہ ہے کہ جنگ کے مختلف طور طریقوں سے استفادہ کرتے ہوئے کبھی جمود اور دقیانوسیت کا شکار نہ ہونا، بلکہ وقت اور مقام کے تقاضوں اور دشمن کی حیثیت دیکھتے ہوئے قدم اٹھانا چاہیے۔ جہاں دشمن کی حالت اس قسم کی ہے کہ وہاں مختلف دستوں کی صورت میں اس کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے تو اس طریقے سے استفادہ کرو اور دشمن کے مقابلہ میں ہر دستہ کی مخصوص حکمت عملی ہو اور جہاں ضرورت ہو کر سب منظم ہو کر ایک حکمت عملی کے مطابق حملہ کریں تو وہاں ایک ہی صف میں کھڑے ہوجائیں۔ یہاں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بعض افراد جو اصرار کرتے ہیں کہ اپنی اجتماعی جنگوں میں سب مسلمان ایک ہی طریقہ کو اپنائیں اور ان کی تکنیکوں میں کسی قسم کا فرق نہیں ہونا چاہیے، ان کا مؤقف درست نہیں۔ ویسے بھی یہ بات منطق اور تجربے کے خلاف ہے اور اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی ہے اور شاید اوپر والی آیت اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کرتی ہو حقیقی مقاصد و اہداف کے حصول کے لیے یہ ایک اہم کلیہ ہے۔

ضمنی طور پر "جمیعًا" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے تمام مسلمان بغیر کسی استثناء کے شرکت کریں اور یہ حکم کسی معین دستے سے مخصوص نہیں ہے۔

۷۲۔ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ○

۷۳۔ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ○

Marfat.com

ترجمہ

۷۲۔ تمھارے درمیان کچھ (منافق) لوگ ہیں کہ وہ خود بھی کاہل ہیں اور دوسروں کو بھی سست بناتے ہیں اگر کوئی مصیبت آپہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ہم پر احسان کیا کہ ہم مجاہدین کے ساتھ نہیں تھے کہ ہم (اس مصیبت) کو دیکھتے۔

۷۳۔ اگر کوئی مالِ غنیمت تمھیں مل جائے تو ٹھیک، حالانکہ تم میں اور ان میں کوئی مودت و دوستی نہیں۔ پھر بھی وہ بالکل اس طرح سے کہتے ہیں، کاش! ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے اور نجات اور عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوتے۔

تفسیر

دشمن کے مقابلہ میں جہاد اور تیاری کے عمومی حکم کے بعد کہ جو گذشتہ آیت میں بیان ہوا ہے اس آیت میں منافقین کی کی ایک جماعت کی حالت بتاتے ہوئے اللہ فرماتا ہے: یہ دوچہروں والے افراد جو تمھارے درمیان ہیں پوری کوشش کرتے ہیں کہ حق کی راہ میں لڑنے والوں کی صفوں میں شریک ہونے سے بچ جائیں۔

(و ان منکم لمن لیبطئن)[۱، ۲]

لیکن جب مجاہدین میدان جنگ سے واپس آتے ہیں یا میدان جنگ کی خبریں انھیں ملتی ہیں۔ اگر مسلمانوں کو شکست یا شہادت نصیب ہوئی ہو تو وہ مسرت و انبساط سے کہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں کتنی بڑی نعمت دی ہے۔ ہم یہ دلخراش منظر دیکھنے کے لیے ان کے ساتھ نہیں تھے۔

فان اصابتکم مصیبۃ قال قد انعم اللہ علی اذ لم اکن معھم شھیداً۔

لیکن اگر انھیں یہ خبر ملے کہ حقیقی مومنین کامیاب ہوگئے ہیں اور نتیجے میں مالِ غنیمت ان کے ہاتھ لگا ہے تو یہ منچلے بیگانوں کی طرح حسرت و یاس سے کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی مجاہدین کے ساتھ ہوتے اور ہمیں بھی بڑا حصّہ (مالِ غنیمت کا) ملتا۔ جیسے مومنین سے تو ان کا کوئی ربط ہی نہ ہو۔

---

۱ یہ بات توجہ طلب ہے کہ اوپر والی آیت میں خطاب مومنین سے ہے لیکن بات منافقین سے کہی جارہی ہے۔ باوجود اس کے کہ "منکم" کی تعبیر کے ساتھ انھیں مومنین کا جزو شمار کیا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ منافقین ہمیشہ مومنین کے درمیان ہی رہتے تھے اور ظاہراً انھی میں شمار ہوتے تھے۔

۲ لیبطئن مادہ بطئو (بروزن قطب) چلنے میں کاہلی اور سستی کے معنی میں ہے اور اہل لغت اور مفسرین کی ایک جماعت کے بقول لازم اور متعدی دونوں معنی رکھتا ہے یعنی چلنے میں بھی کاہل اور سست ہیں اور دوسروں کو بھی اس کام میں شریک کرتے ہیں شاید اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ باب تفصیل میں ہے لہٰذا صرف متعدی والا معنی رکھتا ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کبھی اپنے آپ کو اور کبھی دوسروں کو کاہلی اور سستی پر ابھارتا ہے؟

Marfat.com

ولئن اصابکم فضل من اللہ لیقولن کان لم تکن بینکم وبینہ مودۃ
یالیتنی کنت معھم فافوز فوزاً عظیماً۔

اگرچہ اوپر والی آیت میں مالِ غنیمت کا ذکر نہیں ہوا، لیکن واضح ہے کہ جو راہ خدا میں شہادت کو ایک بلا اور مصیبت تصور کرتا ہے اور شہادت کا شعور نہ رکھنے کو خدا کی نعمت تصور کرتا ہے، اس کے نزدیک صرف مادی اور جنگی غنائم کا حصول عظیم کامیابی اور فتح ہے۔ یہ دو رُخے افراد جن کے متعلق افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہر معاشرے میں تھے اور ہیں، وہ حقیقی مومنین کی کامیابیوں اور شکستوں سے اپنے قیافے فوراً بدل لیتے ہیں۔ غم و آلام میں کبھی ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ مصیبت اور مشکل میں ان کے ہم قدم نہیں ہوتے لیکن اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کی صورت میں انھیں (مالِ غنیمت) ملے اور حقیقی مومنین جیسے امتیازات انھیں حاصل ہوں۔

۷۴۔ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ○

ترجمہ

۷۴۔ وہ لوگ جنھوں نے دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے بیچی ہے انھیں چاہیے کہ خدا کی راہ میں جنگ کریں اور جو شخص راہ خدا میں جنگ کرے اور قتل ہو جائے یا غالب آجائے تو ہم اسے اجر عظیم دیں گے۔

تفسیر

مومنین کو جہاد کے لیے آمادہ کرنا

گذشتہ آیات میں منافقین کو مومنین کی صفوں سے جدا کر کے دکھایا گیا ہے اس آیت میں اور اس کے بعد آنے والی چند آیات میں صاحب ایمان افراد کو اثر انگیز دلائل کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ یہ آیات ایک ایسے زمانے میں نازل ہوئی ہیں جب طرح طرح کے اندرونی اور بیرونی دشمن اہل اسلام کو ڈرا دھمکا رہے تھے ایسے میں ان آیات کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے جن میں مسلمانوں کی روح جہاد کو ابھارا گیا ہے۔ آیت کی ابتدا میں خدا فرماتا ہے: راہ خدا میں وہ افراد جنگ کریں جو دنیا کی پست مادی زندگی کا دوسرے جہان کی ابدی اور جاوداں زندگی سے تبادلہ کرنے کو تیار ہیں۔

(فلیقاتل فی سبیل اللہ الذین یشرون الحیٰوۃ الدنیا بالاٰخرۃ)

یعنی صرف وہ لوگ حقیقی مجاہدین کہلا سکتے ہیں جو اس بات کے لیے آمادہ ہوں اور انھوں نے بجا طور پر یہ جان لیا ہو کہ مادی دنیا کی

Marfat.com

زندگی جیسا کہ لفظ دنیا (بمعنی پست تر) سے ظاہر ہوتا ہے ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لیے باعزت موت کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن جو لوگ مادی زندگی کو گراں بہا اور خدائی و انسانی مقدس اہداف و مقاصد سے بالاتر سمجھتے ہیں وہ کبھی اچھے مجاہد نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد آیت کے ذیل میں فرماتا ہے: "ایسے مجاہدین کا انجام واضح ہے کیونکہ وہ شہید ہو جائیں گے یا دشمن کو تباہ کر دینگے اور ان پر غالب آجائیں گے اور دونوں صورتوں میں ہم انھیں اجر عظیم دیں گے"۔

(ومن یقاتل فی سبیل اللہ فیقتل او یغلب فسوف نؤتیہ اجرًا عظیمًا)

یہ مسلم ہے کہ ایسے جانبازوں کی لغت میں شکست کا وجود نہیں ہے وہ دونوں صورتوں میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہیں یہی ایک جذبہ اس امر کے لیے کافی ہے کہ دشمن ان کے لیے کامیابی کے وسائل فراہم کرے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسے دشمنوں پر تیزی سے غلبہ حاصل ہوا جو تعداد، سازوسامان اور جنگی تیاریوں کے لحاظ سے ان کے مقابلے میں کئی گنا بالادستی رکھتے تھے۔ اس کا محرک یہی ناقابلِ شکست جذبہ تھا۔ یہاں تک کہ غیر مسلم علماء جنھوں نے رسول اللہ کے زمانے اور آپ کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی تیز رفتار کامیابیوں پر بحث کی ہے انھوں نے بھی اس جذبے کو ان کی پیش رفت کا محرک قرار دیا ہے۔

مغرب کا ایک مشہور مؤرخ رقمطراز ہے[1]

"نئے مذہب کی برکت اور جن انعامات کا آخرت میں وعدہ کیا گیا تھا، ان کی وجہ سے وہ موت سے بالکل نہیں ڈرتے تھے اور دوسرے جہان کو چھوڑ کر اس زندگی کی ان کی نظر میں کوئی حقیقت نہ تھی، لہٰذا وہ اس زندگی سے محبت کرنے سے اجتناب کرتے تھے"۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں قرآن کی دوسری بہت سی آیات کی طرح اس جہاد کو مقدس قرار دیا گیا ہے جو "فی سبیل اللہ" یعنی خدا کی راہ میں ہو، بندگان خدا کی نجات کا ذریعہ ہو، اصولِ حق و انصاف کی خاطر ہو اور پاکیزگی و تقویٰ کے لیے ہو، نہ کہ وہ چنگیزی توسیع پسندی، تعصب اور استعماری و سامراجی مقاصد کے لیے لڑی جائیں۔

۷۵۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۝

ترجمہ

۷۵۔ کیوں تم خدا کی راہ میں ان مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے کہ (جو ستمگروں کے ہاتھوں) کمزور کر دیئے گئے

[1] تاریخ تمدن اسلام و عرب ـــــ گوستاولبون صفحہ ۱۵۵

Marfat.com

ہیں جنگ نہیں کرتے وہ (ستم زدہ) افراد جو کہتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس شہر (مکہ) سے نکال لے جہاں کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے ایک سرپرست بھیج اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی یار و مددگار بھیج۔

تفسیر

انسانی جذبوں کو مظلوموں کی مدد کے لیے ابھارا گیا ہے

گذشتہ آیت میں مومنین کو جہاد کی دعوت دی گئی ہے لیکن خدا و قیامت پر ایمان اور سود و زیاں کے استدلال کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس آیت میں انسانی جذبات و احساسات کی بنیاد پر جہاد کی طرف دعوت دیتے ہوئے کہتا ہے، کیوں تم راہ خدا میں اور مظلوم و بیکس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے جو ستم گروں کے چنگل میں گرفتار ہیں جنگ نہیں کرتے کیا تمہارے انسانی جذبات اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ خاموش بیٹھے رہو اور ان رقت انگیز مناظر کو دیکھتے رہو۔

(وما لکم لا تقاتلون فی سبیل الله و المستضعفین[1] من الرجال و النساء و الولدان)

اس کے بعد مومنین کے احساسات کو ولولہ انگیز بنانے کے لیے کہتا ہے: یہ مستضعفین وہی لوگ ہیں جو گھٹے ہوئے ماحول میں گرفتار ہو چکے ہیں اور ہر جگہ سے ناامید ہو گئے ہیں لہذا دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس ظلم و ستم کے ماحول سے انھیں نجات دے۔

(الذین یقولون ربنا اخرجنا من هذه القریة الظالم اهلها)

نیز اپنے خدا سے یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ وہ ایک ولی و سرپرست ان کی حمایت کے لیے بھیج دے

(واجعل لنا من لدنک ولیا) اور کہتے ہیں: ہمارے لیے کوئی یار و مددگار بھیج (واجعل لنا من لدنک نصیرا)

حقیقت میں اوپر والی آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ خدا نے ان کی دعا کو قبول کر لیا ہے اور اس عظیم انسانی پیغام رسالت کو تمہارے ذمہ قرار دیا ہے اور تم خدا کی طرف سے "ولی و نصیر" ہو جو ان کی حمایت اور نجات کے لیے معین کیے گئے ہو۔ لہذا ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس اس موقع اور اعلیٰ حیثیت کو اپنے ہاتھ سے گنوا بیٹھو۔

چند اہم نکات

۱۔ اسلامی جہاد کے دو ہدف

جہاد اسلامی جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا ہے، مال و منال، مقام و مرتبہ، طبعی وسائل اور دوسرے ممالک کے خام مال پر قبضہ کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی منڈیاں تلاش کرنے یا عقیدہ اور سیاست ٹھونسنے کے لیے ہے بلکہ صرف اصول فضیلت و ایمان کی نشر و اشاعت اور محکوم، ستم رسیدہ مردوں، عورتوں اور محروم و مظلوم بچوں کے دفاع کے لیے ہے۔ اس طرح جہاد کے دو جامع ہدف

[1] مستضعف اور ضعیف میں واضح فرق ہے ضعیف وہ ہے جو ناتمام ہو اور مستضعف وہ ہے جو دوسروں کے ظلم و ستم کے باعث کمزور ہو گیا ہو چاہے یہ کمزوری فکری اور ثقافتی اعتبار سے ہو یا اخلاقی نقطہ نظر سے یا اقتصادی حوالے سے اور یا سیاسی اور اجتماعی نقطہ نظر سے اس طرح یہ ایک جامع تعبیر ہے کہ جو ہر طرح کے استعمار زدہ اور ستم رسیدہ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

Marfat.com

اور مقاصد ہیں جن کی طرف مندرجہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے ایک "خدائی ہدف" اور دوسرا "انسانی ہدف" اور یہ دونوں حقیقت میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں اوران کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔

۲۔ معاشرے میں آزادیٔ فکر و نظر

اسلام کی نگاہ میں وہ معاشرہ اور ماحول زندگی بسر کرنے کے قابل ہے جس میں آزادانہ اپنے صحیح عقیدے کے مطابق عمل کیا جاسکے ۔ باقی رہا وہ ماحول یا معاشرہ جس میں گلا گھونٹ دیا جائے اور یہاں تک کہ انسان اتنا آزاد بھی نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکے، اس میں زندگی نہیں گذاری جاسکتی ۔ جہاں صاحبِ ایمان افراد یہ آرزو کرتے ہوں کہ وہ ایسے ماحول سے باہر چلے جائیں کیونکہ ایسے ماحول میں صرف ستمگروں کی بالادستی ہوتی ہے ۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ "مکہ" نہایت مقدس شہر اور مہاجرین کا اصل وطن تھا اس کے باوجود اس کی پر آشوب اور گھٹن زدہ کیفیت اس بات کا سبب بنی کہ وہ خدا سے درخواست کریں کہ وہ وہاں سے باہر نکل جائیں ۔

۳۔ یاور سے پہلے رہبر

مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ وہ مسلمان جو دشمن کے چنگل میں گرفتار تھے انھوں نے پہلے تو اپنی نجات کے لیے خدا کی طرف سے ولی بھیجے جانے کا تقاضا کیا اور پھر ظالموں کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے نصیر اور مددگار کی آرزو کی ۔ کیونکہ ہر چیز سے پہلے قابل اور دردمند "رہبر" اور سرپرست کا وجود ضروری ہے اور اس کے بعد یاور و مددگار کی اور کافی تعداد میں افراد کی ضرورت ہے لہٰذا یہ یاور و مددگار جتنے بھی ہوں ایک صحیح رہبر کے بغیر بے سود ہیں ۔

۴۔ بارگاہِ الٰہی میں دستِ نیاز

صاحبِ ایمان افراد ہر چیز خدا سے چاہتے ہیں اور وہ دستِ نیاز اس کے علاوہ کسی کے آگے دراز نہیں کرتے، یہاں تک کہ اگر وہ ولی و مددگار کا تقاضا کریں تب بھی اسی سے (مدد) چاہتے ہیں ۔

۷۶۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا ۝

ترجمہ

۷۶۔ جو صاحبِ ایمان ہیں وہ راہِ خدا میں جنگ کرتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت (اور فسادی لوگوں) کی راہ میں

Marfat.com

لڑتے ہیں لہٰذا تم ان شیطان کے دوستوں سے جنگ کرو (اور ان سے ڈرو نہیں) کیونکہ شیطان کا مکر و فریب (اس کی طاقت کی طرح) ضعیف و کمزور ہے۔

تفسیر

پھر اس آیت میں مجاہدین کو شجاعت پر ابھارا گیا ہے اور انھیں دشمن کے ساتھ مبارزہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

اس کے علاوہ مجاہدین کی صفوں اور اہداف و مقاصد کو مشخص و ممتاز کرنے کے لیے اس طرح فرماتا ہے:

"صاحب ایمان افراد خدا کی راہ میں اور اس کے لیے جو خدا کے بندوں کے لیے سودمند ہے جنگ کرتے ہیں، لیکن بے ایمان افراد طاغوت یعنی تباہ کرنے والی طاقتوں کی راہ میں (جنگ کرتے ہیں)"

(الذین اٰمنوا یقاتلون فی سبیل الله و الذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت)

یعنی بہرحال ان کی زندگی کے دن مبارزہ اور مقابلہ سے خالی نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک گروہ حق کی راہ میں اور دوسرا باطل اور شیطان کی راہ میں برسرپیکار ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے: شیطان کے ساتھیوں سے جنگ کرو اور ان سے ڈرو نہیں (فقاتلوا اولیاء الشیطٰن)۔

طاغوت، فسادی قوتیں اور ظالم طاقتیں ظاہراً جتنی بھی بڑی اور قوی نظر آئیں لیکن باطن میں زبوں حال اور ناتواں ہیں۔ ان کے ظاہری ساز و سامان، تیاری اور آراستہ و پیراستہ ہونے سے نہ ڈرو۔ کیونکہ ان کا باطن کھوکھلا ہے اور ان کے منصوبے اور سازشیں ان کی طاقت اور توانائی کی طرح ناقص و کمزور ہیں، کیونکہ خدائے لایزل کی قدرت پر ان کا تکیہ نہیں ہے بلکہ وہ شیطانی طاقتوں پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں (ان کید الشیطٰن کان ضعیفا) اس کمزوری اور ناتوانی کی دلیل واضح ہے کیونکہ ایک طرف سے صاحب ایمان افراد اہداف اور حقائق کی راہ میں قدم آگے بڑھاتے ہیں کہ جو قانونِ آفرینش سے ہم آہنگ اور ہم صدا ہیں اور ابدی و جاودانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں وہ انسانوں کو آزاد کرنے اور ظلم و ستم کے مظاہر کو ختم کرنے کے لیے برسرپیکار ہیں جبکہ طاغوت کے طرفدار استعماری اور لوٹ مار کرنے والی قوتیں ناپائیدار شہوات کی راہ میں چلنے والے جن کا اثر معاشرے کی تباہی اور قانونِ آفرینش کے برخلاف ہے، سعی و کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف سے صاحبِ ایمان افراد روحانی قوتوں پر بھروسہ کرکے مطمئن ہیں کہ وہ ان کی کامیابی کے ضامن ہیں اور وہ انھیں قوت بخشیں گے۔ جبکہ بے ایمان لوگوں کا کوئی مستحکم سہارا نہیں ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں طاغوت کا شیطان سے مکمل ربط بیان ہوا ہے کہ کس طرح طاغوت شیطان صفت مختلف طاقتوں سے مدد حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ خدا کہتا ہے کہ طاغوت کے ساتھی وہی شیطان کے دوست ہیں۔ سورۂ اعراف آیہ ۲۷ میں بھی یہی مضمون آیا ہے:

انا جعلنا الشیاطین اولیاء للذین لا یؤمنون

ہم نے شیاطین کو بے ایمان افراد کا سرپرست بنا دیا ہے۔

Marfat.com

۷۷۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ○

ترجمہ

۷۷۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں (مکہ میں) کہا گیا کہ (وقتی طور پر) جہاد سے دستبردار ہو جاؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو (مگر وہ اس حکم سے رنجیدہ اور غیر مطمئن تھے) لیکن جس وقت (مدینہ میں) انھیں جہاد کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرتا تھا جس طرح خدا سے ڈرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہنے لگے پروردگار! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا ہے کیوں یہ حکم دینے میں تاخیر نہیں کی۔ ان سے کہہ دو زندگانی دنیا کا سرمایہ ناچیز اور کم تر ہے اور جو پرہیزگار ہو اس کی آخرت بہتر ہے اور تم پر چھوٹے سے چھوٹا ظلم بھی نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

مفسرین کی ایک جماعت مثلاً عظیم مفسر طوسی مؤلف "تبیان" اور مؤلفین "تفسیر قرطبی" اور "المنار" ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک جماعت جب مکہ میں مقیم تھی اور مشرکین کی طرف سے اس پر ظلم و ستم توڑے جا رہے تھے اس جماعت کے افراد پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم قبول اسلام سے پہلے محترم اور معزز تھے لیکن قبول اسلام کے بعد ہماری حالت دگرگوں ہو گئی ہے اور ہم وہ عزت اور احترام کھو بیٹھے ہیں ہمیں دشمن نے اذیت اور مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم دشمنوں سے جنگ کریں تاکہ اپنا وقار اور مرتبہ دوبارہ بحال کر سکیں۔ اس روز پیغمبرؐ نے فرمایا ابھی مجھے جنگ کرنے کا حکم نہیں ہے۔ لیکن جب مسلمان مدینہ میں جا بسے اور مقابلے کے لیے زمین ہموار ہو گئی، جہاد کا حکم نازل ہوا تو ان میں سے بعض جو پہلے لڑنے کے لیے تُلے بیٹھے تھے اب میدان جہاد میں جانے سے کترانے لگے اور اس دن کا جوش و ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں میں جذبۂ شجاعت بیدار کرنے کیلئے اور جہاد سے گریز کرنے والے افراد کو ملامت کرتے ہوئے حقائق بیان کیے۔

Marfat.com

تفسیر

وہ جو صرف باتیں کرنا جانتے ہیں

قرآن یہاں کہتا ہے، اس گروہ کی حالت واقعاً تعجب خیز ہے جو ایک نامناسب موقع پر بڑی گرم جوشی اور شور و غوغا سے تقاضا کرتا تھا کہ انھیں جہاد کی اجازت دی جائے انھیں حکم دیا گیا کہ ابھی اپنی حفاظت اور تعمیر کا کام کریں، نماز پڑھیں اپنی تعداد بڑھائیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں لیکن جب ہر لحاظ سے فضا ہموار ہوگئی اور جہاد کا حکم نازل ہوا تو ان پر خوف و ہراس طاری ہوگیا اور وہ اس حکم کے سامنے زبان اعتراض دراز کرنے لگے۔

(الم تر الی الذین قیل لھم کفوا ایدیکم و اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ فلما کتب علیھم القتال اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیۃ اللہ او اشد خشیۃ)

وہ اپنے اعتراض میں صراحت کے ساتھ کہتے تھے خدایا تو نے اتنا جلدی جہاد کا حکم نازل کردیا کیا اچھا ہوتا اگر تو اس حکم کو تاخیر میں ڈال دیتا یا یہ پیغام رسالت آئندہ کی نسلوں کے ذمہ ڈال دیا جاتا[1]

(وقالوا ربنا لم کتبت علینا القتال لولا اخرتنا الی اجل قریب)

قرآن اس قسم کے افراد کو دو طرح کے جواب دیتا ہے، پہلا جواب یہ ہے کہ جو یخشون الناس کخشیۃ اللہ او اشد خشیۃ کی عبارت کے دوران دیا جا چکا ہے۔ یعنی وہ لوگ بجائے اس کے کہ خدائے قادر و قاہر سے ڈریں کمزور اور ناتواں انسانوں سے خوف زدہ ہیں بلکہ وہ ان نحیف و ناتواں لوگوں سے خدا کی نسبت زیادہ ڈرتے ہیں دوسرا یہ کہ ایسے افراد سے کہا جائے کہ فرض کرو چند دن جہاد نہ کرنے کی وجہ سے آرام و سکون حاصل کرلو گے، پھر بھی یہ زندگی فانی اور بے قیمت ہے لیکن ابدی اور دائمی جہاں تو پرہیزگار لوگوں کے لیے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ خصوصاً جب انھیں مکمل طور پر عوض اور اجر مل جائے گا اور معمولی سے معمولی ظلم بھی ان پر نہیں ہوگا۔ . . . .

(قل متاع الدنیا قلیل و الاٰخرۃ خیر لمن اتقی ولا تظلمون فتیلا[2])

---

[1] بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرت مہدیؑ کے قیام کے بارے میں کچھ باتیں سن رکھی تھیں۔ لہٰذا ان میں سے بعض اس انتظار میں تھے کہ جہاد کا معاملہ قیام مہدیؑ کے زمانے سے مخصوص ہوجائے۔
(نور الثقلین جلد اول ص ۵۱۸)

[2] فتیل ایک باریک دھاگہ ہے جو کھجور کے دانے کے درمیان شگاف میں ہوتا ہے جس طرح کہ اس کی تفصیل تیسری جلد میں گزر چکی ہے۔

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ صرف نماز اور زکوٰۃ کا تذکرہ کیوں ؟

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام احکامِ اسلام میں سے صرف نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کیوں ہوا ہے حالانکہ احکام اسلامی انھی دو میں تو منحصر نہیں ہیں ۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نماز خدا سے وابستہ ہونے اور زکوٰۃ مخلوق خدا سے رشتہ استوار کرنے کی رمز ہے ۔ لہٰذا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا جائے کہ خدا سے محکم وابستگی اور بندگانِ خدا سے مضبوط رشتہ استوار کر کے اپنے جسم و جان اور اجتماع و معاشرے کو جہاد کے لیے آمادہ کریں۔ اصطلاح کے مطابق اپنی تربیت کریں ۔ یہ بات مسلّم ہے کہ کسی قسم کا جہاد افراد کی روحانی اور جسمانی آمادگی اور اجتماعی مستحکم رشتوں کے بغیر شکست سے ہم کنار ہو جائے گا ۔ مسلمان نماز اور عبادت خدا کے سایے میں اپنے ایمان کو محکم اور اپنے روحانی جذبہ کی پرورش کرتا ہے اور ہر قسم کے ایثار اور قربانی کے لیے آمادہ ہوتا ہے اور زکوٰۃ کے ذریعے اجتماعی فاصلوں کو مٹاتا ہے ۔ زکوٰۃ ہی کے ذریعے آزمودہ کار افراد اور جنگی ساز و سامان مہیا کرنے کے لیے ایک اقتصادی معاونت کرتا ہے اور حکم جہاد کے صادر ہونے پر دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح سے تیار ہو جاتا ہے ۔

۲۔ مکّہ میں حکمِ زکوٰۃ

ہم جانتے ہیں کہ زکوٰۃ کا قانون مدینہ میں نازل ہوا اور مکہ میں مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی تھی اس کے باوجود یہ کیسے ممکن ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں مکّہ کے مسلمانوں کی حالت و کیفیت بیان کی جا رہی ہو ۔ شیخ طوسی مرحوم نے اس سوال کا جواب تفسیر "تبیان" میں دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں زکوٰۃ سے مراد مستحب زکوٰۃ تھی ۔ جو کہ مکہ میں نافذ تھی ۔ یعنی قرآن مسلمانوں کو (حتیٰ کہ مکّہ میں بھی) حاجت مندوں کی مالی امداد اور نو مسلم افراد کے لیے ضروریات مہیا کرنے کی طرف راغب کرتا ہے ۔

۳۔ مکّہ اور مدینہ میں مختلف لائحہ عمل

مندرجہ بالا آیت ضمنی طور پر ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مکہ میں تو مسلمانوں کا ایک لائحہ عمل تھا اور مدینہ میں دوسرا۔ مکہ کا تیرہ سالہ قیام مسلمانوں کے لیے انسان سازی کا تھا ۔ پیغمبر اکرمؐ نے شب و روز مسلسل کوشش کی کہ انھیں بُت پرستی اور زمانہ جاہلیت کے بیہودہ عناصر سے نجات دلا کر اس قسم کے انسان بنائیں جو زندگی کے بڑے حادثات کا مقابلہ کرتے ہوئے استقامت، پامردی اور ایثار کا مظاہرہ کریں اگر مکہ کے قیام کے زمانے میں یہ چیز موجود نہ ہوتی تو مدینہ کے مسلمانوں کو اتنی حیران کن اور پے درپے کامیابیاں نصیب نہ ہوتیں ۔ مکّہ کے قیام کا دور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور تجربہ حاصل کرنے کا

Marfat.com

دور ہے۔ اس بنیاد پر قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے تقریباً نوے سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں۔ ان میں سے زیادہ تر سورتیں عقیدہ، مکتب اور نظریات کا منبع تھیں لیکن مدینہ کا زمانہ تشکیل حکومت اور ایک مکمل معاشرے کی بنیادیں استوار کرنے کا دور تھا۔ اسی لیے نہ تو مکہ میں جہاد واجب تھا اور نہ ہی زکوٰۃ۔ کیونکہ جہاد اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے جیسا کہ بیت المال کی تشکیل بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

۷۸۔ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ○

۷۹۔ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ○

ترجمہ

۷۸۔ تم جہاں کہیں بھی رہو، موت تمھیں پالے گی اگرچہ محکم برجوں میں جا رہو اور اگر انھیں (منافقین کو) حسنہ (اور کامیابی) حاصل ہو تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور سیئہ (اور شکست) سے دوچار ہوں تو کہتے ہیں یہ تمھاری طرف سے ہے کہہ دو کہ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ پس یہ گروہ کیوں تیار نہیں ہوتا کہ حقائق کا ادراک کرے۔

۷۹۔ جو نیکیاں تجھ پر پہنچتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں اور جو برائی تجھے پہنچتی ہے وہ خود تیری طرف سے ہے اور ہم نے تجھے لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس بارے میں خدا کی گواہی کافی ہے۔

تفسیر

گذشتہ اور بعد کی آیات پر غور کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیات بھی منافقین سے متعلق ہیں جو مسلمانوں کی صفوں میں رہتے تھے جیسا کہ گذشتہ آیات میں ہے کہ وہ میدانِ جہاد میں شرکت کرنے سے ڈرتے تھے اور جب جہاد کا حکم صادر ہوا

Marfat.com

تو انھیں تکلیف ہوئی ۔ قرآن ان کے اس طرز فکر کا دو طرح سے جواب دے رہا ہے پہلا جواب تو وہی تھا جو گذشتہ آیت کے آخر میں گزر چکا ہے ۔

قل متاع الدنیا قلیل و الاخرة خیر لمن اتقی

کہہ دو کہ دنیاوی زندگی بہت کم ہے لیکن پرہیزگاروں کے لیے دوسرے جہان میں اس کا صلہ موجود ہے ۔

دوسرا جواب جو زیر بحث ہے کہ موت سے فرار اختیار کرنا تمھارے لیے مفید نہیں " حالانکہ تم جہاں کہیں بھی ہو موت سے تم کو مفر نہیں آخر ایک دن تمھیں اس کا نوالہ بننا ہے یہاں تک کہ تم مضبوط گنبدوں میں کیوں نہ چھپ جاؤ " پس وہ موت جسے ضرور آنا ہے اور جس سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے کیوں نہ اسے اصلاح اور سچائی کے لیے قبول کیا جائے جیسے جہاد کی صورت میں، بجائے اس کے کہ بے کار اور لا حاصل موت قبول کی جائے ۔

(اینما تکونوا یدرککم الموت و لو کنتم فی بروج مشیدة)

یہ امر قابل توجہ ہے کہ قرآن کی متعدد آیات مثلاً سورہ حجر کی آیہ ۹۹ اور مدثر کی آیت ۴۸ میں موت کو " یقین " سے تعبیر کیا گیا ہے یہ اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہر قوم اور گروہ جو بھی عقیدہ رکھتا ہو وہ ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے مگر اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ زندگی ایک دن ختم ہونے والی ہے وہ افراد جو زندگی سے عشق کرتے ہیں اور وہ جو سمجھتے ہیں کہ موت ہمیشہ کیلیے نیست و نابود ہونے کا نام ہے اور اس کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں یہ آیات انھیں تنبیہ کرتی ہیں اور زیر بحث آیت میں یدرککم کے مفہوم سے انھیں متوجہ کیا گیا ہے کہ عالم ہستی کی اس حقیقت سے فرار اختیار کرنا ایک نامناسب فعل ہے کیونکہ " یدرککم " کے مادہ کا معنی یہ ہے کہ کوئی کسی چیز سے فرار حاصل کرے اور وہ اس کے پیچھے دوڑے ۔ سورہ جمعہ کی آیت ۸ میں بھی یہ حقیقت زیادہ کھل کر بیان کی گئی ہے :

قل ان الموت الذی تفرون منه فانه ملاقیکم کہیے کہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تمہارے سامنے آئے گی

جب یہ حقیقت مدنظر ہو تو کیا یہ عقل مندی ہے کہ انسان میدان جہاد میں جانے اور قابل فخر مرتبے پر فائز ہونے کی بجائے اس سے کنارہ کش ہو کر گھر میں آرام کرتا رہے فرض کرلیں کہ جہاد سے کنارہ کش ہو کر وہ زندگی کے چند روز اور گذار لے اور وہی کام دہراتا رہے جو پہلا کرتا رہا ہے ۔

راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کے اجر و ثواب سے بے بہرہ ہو جائے تو کیا یہ عقل اور منطق کے مطابق صحیح ہے اصولی طور پر موت ایک عظیم حقیقت ہے اور موت کے استقبال کے لیے افتخار کے ساتھ آمادہ ہونا چاہیے ۔

دوسرا نکتہ جس پر توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ درج بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ کوئی چیز یہاں تک کہ محکم برج (بروج مشیدہ[1]) بھی موت سے

[1] مشیدہ ۔ دراصل مادہ شید (بروزن شیر) سے ہے اور گچ اور دوسرے محکم مواد کے معنی میں ہے کہ جنھیں کسی بنیاد کے استحکام کے لیے استعمال کرتے ہیں چونکہ اس زمانہ میں عام طور پر مضبوط بنیاد کے لیے محکم ترین مادہ گچ اور چونا تھا لہٰذا زیادہ تر اس مفہوم میں بولا جاتا تھا ۔ لہٰذا بروج مشیدہ محکم قلعوں کے معنی میں ہے اور دیکھنے میں مشیدہ مرتفع اور بلند کے معنی میں آتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ چونا سے استفادہ کیے بغیر کسی طرح بھی بلند و بالا عمارت کی بنیادیں استوار نہیں ہوسکتیں ۔

Marfat.com

چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا اور اس کی وجہ واضح ہے اور وہ یہ کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ موت وجود انسانی سے باہر نفوذ کرتی ہے عملی طور پر موت کا سرچشمہ انسان کے اندر ہے۔ کیونکہ بدن کے مختلف کل پرزوں (اعضاء) کی استعداد یقیناً محدود ہے ایک دن وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ البتہ غیر طبعی موت انسان کی تلاش میں باہر سے آتی ہے لیکن طبعی موت اس کے اندر سے آتی ہے۔ مضبوط گنبد اور بھاری قلعے بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتے۔

یہ بجا ہے کہ مضبوط قلعے بعض اوقات غیر طبعی موت سے بچا لیتے ہیں۔ مگر پھر بھی موت سے مکمل نجات نہیں دلا سکتے اور چند دنوں بعد طبعی موت انسان کو آلیتی ہے۔

کامرانیوں اور شکستوں کا سرچشمہ

قرآن اس آیت کے ذیل میں منافقین کی کچھ اور بے بنیاد باتوں اور باطل خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:
وہ جب بھی کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں اور نیکیاں اور حسنات ان کے ہاتھ آتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے یعنی ہم اس قابل تھے کہ خدا نے ہمیں یہ شفقتیں اور نعمتیں عطا کی ہیں۔

(و ان تصبھم حسنۃ یقولوا ھذہ من عند اللہ)

لیکن جب انھیں شکست کا سامنا ہو یا میدان جنگ میں کوئی مشکل لاحق ہو تو کہتے ہیں کہ یہ پیغمبرؐ کی غلط تدبیر اور ان کی جنگی حکمت عملی کے خام ہونے کی وجہ سے تھا اس ضمن میں وہ جنگ احد کی شکست کا حوالہ دیتے ہیں۔

(و ان تصبھم سیئۃ یقولوا ھذہ من عندک)

بعض مفسرین کا احتمال ہے کہ درج بالا آیت یہودیوں کے بارے میں ہے اور "حسنۃ" اور "سیئۃ" سے مراد سارے اچھے اور برے حوادث و واقعات ہیں کیونکہ یہودی پیغمبرؐ کے ظہور کے وقت اپنی زندگی کے اچھے حوادث کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے اور برے حوادث کو پیغمبرؐ سے منسوب کر دیتے تھے لیکن اس آیت کا ربط پہلے اور بعد کی ان آیات سے ہے جو منافقین کے بارے میں نشاندہی کرتی ہیں یہ آیت بھی زیادہ تر انھی سے مربوط ہے بہر حال قرآن انھیں جواب دیتا ہے کہ ایک مؤحد اور بالغ نظر خدا پرست کی نگاہ میں یہ تمام حوادث، کامیابیاں اور شکستیں خدا کی طرف سے ہیں جو لوگوں کی قابلیت اور اہلیت کے مطابق انھیں دی جاتی ہے۔

(قل کل من عند اللہ)

اور آیت کے آخر میں اعتراض کے طور پر ان منافقین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ لوگ فکر اور غور نہیں کرتے "پس کیوں یہ لوگ حقائق کا ادراک کرنے کو تیار نہیں ہوتے"۔

(فمال ھؤلاء القوم لا یکادون یفقھون حدیثا)

اس کے بعد اگلی آیت میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے کہ تمام نیکیاں، کامیابیاں اور حسنات جو تمھیں ملتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں اور جو برائیاں اور شکستیں تمھیں درپیش ہوتی ہیں اور وہ خود تمھاری طرف سے ہیں۔

(ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک)

Marfat.com

اور آیت کے آخر میں ان لوگوں کو جو اپنی شکستوں اور ناکامیوں کی نسبت پیغمبرؐ سے دیتے ہیں اور اصطلاحاً پیغمبرؐ کی وجہ سے سمجھتے تھے انھیں جواب دیا گیا۔ پیغمبرؐ سے ارشاد ہوتا ہے: "اور ہم نے تجھے لوگوں کے لیے اپنا پیامبر قرار دیا ہے اور خدا اس پر گواہ ہے اور اس کی گواہی کافی ہے۔"

تو کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا لوگوں کی شکست، ناکامی اور برائی کا سبب ہو؟

(وارسلنٰك للناس رسولا وكفىٰ بالله شهيدًا)

ایک اہم سوال کا جواب

ان دو آیات کا مطالعہ کر جو قرآن میں آگے پیچھے مربوط ہیں ذہن میں ایک سوال پیدا کرتا ہے کہ کیوں پہلی آیت میں تمام نیکیوں اور برائیوں (حسنات وسیئات) کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے جب کہ دوسری آیت میں صرف نیکیوں کو خدا کی طرف اور برائیوں اور سیئات کو لوگوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یقیناً یہاں کوئی نکتہ پوشیدہ ہے ورنہ کیسے ممکن ہے کہ دو آیات جو کہ یکے بعد دیگرے آئی ہیں ان میں ایسا واضح اختلاف ہے ان دونوں آیات پر غور وفکر کرنے سے چند نکات واضح ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک اس سوال کا علیحدہ جواب بن سکتا ہے۔

۱۔ اگر سیئات اور برائیوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ دو پہلو رکھتی ہیں۔ ایک مثبت پہلو اور ایک منفی پہلو۔ یہی منفی پہلو ہے جو انھیں برائی کی شکل وصورت دیتا ہے اور انھیں نسبتی زبان یا مقابلتاً نقصان کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

جو شخص گرم یا سرد ہتھیار کے ذریعہ کسی مسلمان کو قتل کر دے، مسلّم ہے کہ وہ ایک برائی کا مرتکب ہوا ہے اب ہم اس برے کام کے عوامل پر غور وفکر کرتے ہیں۔ ان عوامل میں انسان کی طاقت، اس کی فکر، سرد یا گرم ہتھیار کی طاقت، صحیح نشانہ، مناسب وقت سے استفادہ کرنا اور گولی کی تاثیر اور طاقت وغیرہ نظر آتے ہیں جو تمام واقعہ کے مثبت پہلو ہیں۔ کیونکہ یہ سب مفید اور سودمند ہو سکتے ہیں اور اگر انھیں برمحل استعمال کیا جائے تو بڑی بڑی مشکلات کے موقع پر کام آتے ہیں صرف ایک منفی پہلو اس واقعہ کا یہ ہے کہ یہ تمام صلاحیتیں اور توانائیاں بے محل استعمال ہوئی ہیں مثلاً بجائے اس کے کہ ان کے ذریعے ایک خطرناک درندے کو مارا جاتا یا ایک جفاکار اور ظالم قاتل پر انھیں استعمال کیا جاتا، ایک بے گناہ انسان کو نشانہ بنایا گیا بس یہی منفی پہلو ہے کہ ان صلاحیتوں کو برائی کے طور پر کام لایا گیا۔ ورنہ نہ تو اچھے نشانے کی صلاحیت انسان کے لیے بری چیز ہے اور نہ ہی گولی اور بارود کا استعمال برا ہے، یہ سب صلاحیت کو استعمال کرنے کے ذرائع ہیں اور اپنی جگہ بہت سے فوائد کے حامل ہیں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی آیت میں تمام حسنات اور سیئات کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت کے تمام ذرائع، یہاں تک کہ وہ صلاحیتیں کہ جن سے غلط فوائد حاصل کیے گئے، خدا کی طرف سے ہیں اور اصلاحی اور مثبت اجزاء کا سرچشمہ وہی ہیں اور اگر دوسری آیت میں سیئات کی نسبت لوگوں کی طرف دی گئی ہے تو واقعہ کے انھی منفی پہلوؤں اور خدا کی عنایات اور صلاحیتوں سے غلط فائدہ اٹھانے والوں کی طرف اشارہ ہے یہ بالکل اسی مثال کی طرح ہے کہ ایک شخص اپنے بیٹے کو ایک اچھا گھر بنانے کے لیے سرمایہ دے لیکن وہ اسے منشیات، فساد، تباہ کاری میں صرف کر دے اس میں شک نہیں ہے کہ سرمایہ کے لیے وہ اپنے باپ کا مقروض ہے لیکن

Marfat.com

سرمایے کے غلط استعمال کے لیے وہ خود ذمہ دار ہے۔

۲۔ ممکن ہے کہ آیت مبارکہ "الامر بین الامرین" کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتی ہو جس کی طرف خبر اور تفویض کی بحث میں اشارہ ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام حوادث دنیا، یہاں تک ہمارے اعمال و افعال چاہے اچھے ہوں یا برے، نیک ہوں یا بد ایک طرح سے خدا سے مربوط ہیں کیونکہ دی ہے جس نے ہمیں طاقت دی ہے اور اختیار و ارادہ کی آزادی ہمیں بخشی ہے لہٰذا ہم جو کچھ اختیار کرتے ہیں اور ارادہ کی آزادی کے ساتھ انتخاب کرتے ہیں وہ مشیت الٰہی کے برخلاف نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے اعمال ہم سے نسبت رکھتے ہیں اور ان کا سرچشمہ ہمارا وجود ہے کیونکہ عمل کے تعین کرنے کا عامل و سبب ہمارا ارادہ و اختیار ہے اور اسی بنا پر ہم اپنے اعمال کے بارے میں جوابدہ ہیں اور خدا کی طرف ہمارے اعمال کی اسناد و نسبت، جیسا کہ اشارہ ہوا ہے ہماری ذمہ داری اور جوابدہی کو سلب نہیں کرتی اور عقیدہ جبر کا موجب اور سبب نہیں بنتی۔ لہٰذا خدا جہاں فرماتا ہے کہ "حسنات و سیئات" میری طرف سے ہیں تو وہاں اشارہ کرتا ہے کہ تمام چیزوں کی نسبت خدا کی اس فاعلیت (اختیار) کی طرف ہے اور جہاں فرماتا ہے سیئات تمہاری طرف سے ہیں تو وہاں ہماری فاعلیت اور ہمارے ارادہ و اختیار کی طرف اشارہ ہے۔ اور حقیقت میں ان دو آیات کا مجموعہ "امر بین الامرین" کے مسئلہ کو ثابت کرتا ہے (یہ نکتہ غور طلب ہے)۔

۳۔ ایک اور تفسیر جو ان دو آیات کے لیے موجود ہے اور اہل بیتؑ کی روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ "سیئات" سے مراد اعمال کی سزا و مجازات اور گناہوں کے عقوبات و نتائج ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سزائیں خدا کی طرف سے ہیں لیکن چونکہ یہ بندوں کے اعمال و افعال کا نتیجہ ہیں۔ اس بنا پر بعض اوقات ان کی نسبت بندوں کی طرف دی جاتی ہے اور بعض اوقات خدا کی طرف، اور دونوں صحیح ہیں۔ مثلاً یہ دونوں طرح سے صحیح و درست ہے کہ کہا جائے کہ قاضی چور کا ہاتھ کاٹتا ہے یا یہ کہ چور خود اپنے ہاتھ کو کاٹتا ہے۔

۸۰۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝

۸۱۔ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

ترجمہ

۸۰۔ جس شخص نے پیغمبر کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جو روگردانی کرے تو تم اس کے جواب دہ نہیں ہو۔

۸۱۔ وہ تیرے سامنے کہتے ہیں کہ ہم فرمانبردار ہیں لیکن جب وہ تمہاری بزم سے باہر جاتے ہیں تو ان میں ایک گروہ تمہاری گفتگو کے برخلاف رات کو خفیہ میٹنگیں تشکیل دیتا ہے جو کچھ وہ ان میٹنگوں میں کہتے ہیں خدا اسے لکھتا ہے

Marfat.com

ان کی پرواہ نہ کرو (اور ان کے منصوبوں اور سازشوں سے نہ ڈرو) اور خدا پر توکل کرو اور کافی ہے کہ وہ تمھارا مددگار اور حفاظت کرنے والا ہو۔

تفسیر

اس آیت میں لوگوں اور ان کے "حسنات" اور "سیئات" کے مقابلہ میں رسولؐ کی حیثیت بیان کی گئی ہے۔ خدا پہلے فرماتا ہے کہ جو شخص پیغمبر کی اطاعت کرے اس نے خدا کی اطاعت کی۔

(من یطع الرسول فقد اطاع اللہ)

لہٰذا خدا کی اطاعت پیغمبر کی اطاعت سے جدا نہیں ہو سکتی کیونکہ پیغمبر کوئی قدم خدا کی مشیت کے خلاف نہیں اٹھاتا اس کی گفتار، کردار، اعمال سب خدا کے فرمان کے مطابق ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے: اگر کچھ لوگ اعراض اور روگردانی کرتے ہیں اور وہ تمھارے احکام کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں تو تم ان کے اعمال کے جواب دہ نہیں ہو اور یہ تمھارا کام نہیں کہ ان سے تکرار کرو یا نافرمانی کرنے سے انھیں جبراً روکو۔ تمھارا فرض تبلیغ رسالت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور گمراہ و بے خبر لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے (ومن تولی فما ارسلناک علیھم حفیظا) غور کرنا چاہیے کہ لفظ "حفیظ" اس لحاظ سے کہ صفت مشبہ ہے اور ثبات و دوام کے معنی دیتا ہے "حافظ" سے مختلف ہے جو کہ اسمِ فاعل ہے اس لیے حفیظ کا معنی وہ شخص ہے کہ جو ہمیشہ کسی چیز کی نگرانی پر مامور ہو۔ لہٰذا آیت کا معنی و مفہوم یہ ہوگا کہ پیغمبر کی ذمہ داری رہبری کرنا، ہدایت کرنا، دعوت حق دینا، فتنہ اور مفاسد کا مقابلہ کرنا ہے لیکن اگر کچھ لوگ مخالفت پر کمربستہ ہوں تو پیغمبر ان کی کج روی کے لیے جوابدہ نہیں ہیں کہ ہر جگہ موجود ہوں اور ہر گناہ و معصیت کا طاقت اور جبر سے مقابلہ کریں اور مروج طریقوں سے بھی وہ اس طرح کی قدرت نہیں رکھتے۔ اس بنا پر اُحد جیسی جنگ کے حوادث بھی شاید آیت کے پیشِ نظر ہوں کہ پیغمبر کا فرض تھا کہ فنونِ حرب کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ گہرائی اور غور و خوض سے جنگی حکمتِ عملی تیار کرتا اور دشمن کے شر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھتا، اور یہ بات مسلم ہے کہ ان احکام و ضوابط میں پیغمبر کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگوں نے پیغمبر کے احکام کی حکم عدولی کی اور اس سبب سے وہ شکست سے دوچار ہوئے تو اس کی جواب دہی ان سے منسوب ہوگی نہ کہ پیغمبر سے۔ غور کرنا چاہیے کہ یہ آیت قرآن کی واضح ترین آیات میں سے ہے جو سنتِ پیغمبر کے حجت ہونے اور آپ کی احادیث کو قبول کرنے کے لیے دلیل ہے، لہٰذا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں قرآن کو قبول کرتا ہوں لیکن پیغمبر کی حدیث اور سنت کو قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ درج بالا آیت میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ پیغمبر کی حدیث اور سنت کی اطاعت فرمانِ خدا کی اطاعت ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے حدیث ثقلین کے مطابق جو کہ مشہور مآخذ اور کتب اسلامی میں مذکور ہے چاہے وہ کتب شیعہ ہوں یا کتبِ اہل سنت، صراحت کے ساتھ اہل بیت علیہم السلام کو سند اور حجت قرار دیا ہے اس سے ہمیں معلوم ہوتا

Marfat.com

ہے کہ اہل بیتؑ کے فرمان کی اطاعت بھی فرمانِ خدا کی اطاعت سے الگ نہیں ہے اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں قرآن کو تو قبول کرتا ہوں لیکن اہلِ بیتؑ کے فرامین کو نہیں مانتا کیونکہ یہ بات درج بالا آیت اور اس کی مشابہ آیات کے برخلاف ہے۔

اسی لیے بہت سی روایات جو تفسیر برہان میں اس آیت کے ضمن میں آئی ہیں میں ہم پڑھتے ہیں کہ خدا نے درجِ بالا آیت کے مطابق امر و نہی کا حق اپنے پیغمبر کو دیا ہے اور پیغمبرؐ نے یہ حق حضرت علیؑ اور ائمہ اہل بیتؑ کو دیا ہے لہٰذا لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ان کے امر و نہی سے روگردانی نہ کریں کیونکہ ان کا امر و نہی ہمیشہ خدا کی طرف سے ہے نہ کہ خود ان کی طرف سے[1]۔ اس کے ساتھ دوسری آیت میں منافقین کے ایک گروہ یا کمزور ایمان والے کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے" وہ لوگ جس وقت مسلمانوں کی صفوں میں پیغمبر کے پاس کھڑے ہوتے ہیں تو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے یا کسی ضرر سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے دوسروں کے ہم آواز ہوتے اور فرمانِ پیغمبر کی اطاعت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم جان و دل سے پیغمبر کی پیروی کرنے کو تیار ہیں (ویقولون طاعۃ)۔

لیکن جب لوگ بزمِ رسالت سے نکلتے ہیں تو وہ منافقین اور کمزور ایمان والے افراد اپنے عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور خفیہ اجتماعات میں پیغمبر کے ارشادات کے خلاف پروگرام بناتے ہیں (فاذا برزوا من عندک بیت طائفۃ منھم غیر الذی تقول)۔ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین پیغمبرؐ کے زمانہ میں نچلے نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ وہ رات کو خفیہ اجتماعات میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ کے لائحہ عمل میں رخنہ اندازیاں کرتے تھے، لیکن خدا اپنے رسولؐ کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان سے منہ پھیر لیں اور ان کی سازشوں سے گھبرائیں نہیں اور اپنے لائحہ عمل کے لیے ان پر انحصار نہ کریں۔ بلکہ فقط خدا پر بھروسہ رکھیں خدا جو سب سے زیادہ مدد اور حفاظت کرنے والا ہے (فاعرض عنھم وتوکل علی اللہ وکفی باللہ وکیلا)۔

۸۲۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○

ترجمہ

۸۲۔ کیا قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے کہ اگر وہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بہت سے اختلافات پاتے۔

---

[1] تفسیر برہان جلد اوّل صفحہ ۳۹۶

Marfat.com

تفسیر

اعجازِ قرآن کی زندہ مثال

ان سرزنشوں کے بعد جو گزشتہ آیات میں منافقین کو کی گئی تھیں یہاں انھیں اور دوسرے تمام ان لوگوں کی طرف جو قرآن کی حقانیت میں شک و تردد کرتے ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کیا یہ لوگ قرآن کی مخصوص وضع و کیفیت پر غور و فکر نہیں کرتے اور اس کے نتائج کو نہیں دیکھتے، قرآن اگر خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے نازل ہوتا تو یقیناً اس میں انھیں بہت سے تفاوات اور اختلافات ملتے اب جب کہ اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف اور تناقض نہیں ہے تو انھیں جان لینا چاہیے کہ وہ خدا ہی کی طرف سے نازل ہوا ہے (افلا یتدبرون القران ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافًا کثیرًا)۔

"تدبر" اصل میں مادہ دبر (بروزن ابر) پشت سر اور کسی چیز کی عاقبت وانجام کے معنی میں ہے اس بنا پر تدبر سے مراد نتائج، عواقب اور کسی چیز کے آگے پیچھے دیکھنا ہے۔ تفکر سے اس کا فرق یہ ہے کہ تفکر کا ربط کسی موجود کے علل اور خصوصیات کے مطالعہ سے ہے لیکن "تدبر" اس کے عواقب و نتائج کے مطالعے اور جائزے سے مربوط ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصولِ دین اور ایسے مسائل مثلاً پیغمبر کے دعوے کی سچائی اور قرآن کی حقانیت کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کریں اور اندھی تقلید اور بغیر سوچے سمجھے فیصلوں سے اجتناب کریں۔

۲۔ بعض لوگوں کے خیال کے برعکس قرآن سب لوگوں کے لیے قابلِ فہم و ادراک ہے کیونکہ اگر وہ قابلِ فہم و ادراک نہ ہوتا تو اس میں تدبر اور غور و فکر کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔

۳۔ قرآن کی حقانیت کی ایک اور دلیل اور یہ کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے یہ ہے کہ سارے قرآن میں تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے لیے حسبِ ذیل وضاحت کی طرف توجہ کریں۔

> "ہر شخص کی کیفیات اور نظریات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں بعض استثنائی حالتیں چھوڑ کر عام حالات میں قانون تکامل وارتقاء انسان اور اس کے افکار و نظریات پر بھی موثر و حاوی ہے ہمیشہ دن مہینے اور سال بدلنے سے لوگوں کی زبان، فکر اور گفتار بھی بدلتی رہتی ہے اگر غور سے دیکھیں تو ایک لکھنے والے شخص کی تحریریں کبھی بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں بلکہ ایک ہی کتاب کی ابتدا اور انتہا میں فرق ہوتا ہے خصوصاً اگر کوئی شخص عظیم حوادث سے گزرے اور حوادث بھی ایسے جو ایک فکری، اجتماعی، نظریاتی عقائدی انقلاب کی بنیاد بن جائیں تو وہ جتنا بھی کوشش کرے کہ اپنی گفتار کو ایک جیسا اور ایک طرز پر

Marfat.com

رکھے اور اسے اپنی گذشتہ باتوں سے مربوط کرلے وہ ایسا نہیں کرسکتا خصوصاً اگر وہ ان پڑھ اور پس ماندہ ماحول میں پروان چڑھا ہو۔"

"لیکن قرآن جو ۲۳ سال کی مدّت میں لوگوں کے تربیتی تقاضوں اور ضروریات کے مطابق بالکل مختلف حالات اور مواقع پر نازل ہوا، ایسی کتاب ہے جو مکمل طور پر مختلف موضوعات کو چھیڑتی ہے اور عام کتب کی طرح اس میں صرف ایک اجتماعی، سیاسی، فلسفیانہ، حقوقِ انسانی یا تاریخی موضوع سے بحث نہیں ہے بلکہ قرآن کبھی توحید اور اسرارِ آفرینش کے بارے میں اور کبھی احکام و قوانین اور آداب و سنن کے متعلق اور کسی وقت گذشتہ عبادت اور بندوں کے خدا سے رابطے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ ڈاکٹر گوستاولبون کے بقول قرآن جو کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب ہے صرف تعلیمات اور احکام مذہبی پر منحصر نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی احکام بھی بیان کرتی ہے ایسی خصوصیات کی حامل کتاب کے لیے عام طور پر یہ ممکن نہیں کہ وہ تضاد، تناقض اور تضاد بیانی سے مبرا ہو۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام جہات کے باوجود اس کی تمام آیات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور ہر قسم کے تضاد، اختلافات، ناموزونیت سے خالی ہے تو ہم بہت بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتاب افکار انسانی کی تخلیق نہیں ہوسکتی۔ بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ قرآن خود اس حقیقت کو درج بالا آیت میں بیان کرتا ہے۔[۱]"

۸۳۔ وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِۦ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُۥ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَٰنَ إِلَّا قَلِيلًا ○

ترجمہ

۸۳۔ اور جب کامیابی یا شکست کی خبر انھیں ملے تو وہ (تحقیق کیے بغیر) اسے مشہور کر دیتے ہیں لیکن اگر وہ پیغمبرؐ اور صاحبان امر کی طرف (جو تشخیص کی کافی اہلیت و قدرت رکھتے ہیں) پلٹا دیں تو وہ مسائل کی تہہ سے آگاہ ہوجائیں اور خدا کا فضل اور رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو سوائے قلیل گروہ کے سب کے سب شیطان کی پیروی کرنے لگتے۔

تفسیر

افواہیں پھیلانا

اس آیت میں منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کے ایک اور منفی عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب انھیں مسلمانوں کی فتح یا شکست کے متعلق خبریں پہنچتی ہیں تو وہ تحقیق کیے بغیر انھیں لوگوں میں پھیلاتے ہیں

---

[۱] کتاب قرآن و آخرین پیغمبرؐ ص ۲۰۹ تالیف ناصر مکارم

Marfat.com

جب کہ بیشتر یہ خبریں بے بنیاد ہوتی ہیں اور دشمنوں کی جانب سے خاص مقاصد کے لیے گھڑی جاتی ہیں ان کا شہرت پانا مسلمانوں کے لیے ضرر رساں ہوتا ہے (و اذا جاءهم امر من الامن او الخوف اذاعوا به) حالانکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اس قسم کی خبریں سب سے پہلے اپنے رہبروں اور پیشواؤں کے سامنے رکھیں اور ان کی وسیع اطلاعات اور گہری فکر سے استفادہ کریں اور بلاوجہ نہ تو مسلمانوں کو اچھے نتائج کے غرور میں مبتلا کریں جو خیالی کامیابیوں سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ شکست کی جھوٹی خبروں سے ان کی ہمتوں کو پست کریں (ولو ردوه الی الرسول و الی اولی الامر منهم لعلمه الذین یستنبطونه منهم)

"یستنبطونہ" اصل میں نبط (بروزن فقط) کے مادہ سے ہے اس سے مراد وہ پہلا پانی ہے جو کنوئیں سے نکالتے اور زمین کی تہہ سے حاصل کرتے ہیں اسی بنا پر ہر حقیقت کے مختلف دلائل وشواہد سے استفادہ کرنے اور موجود مدارک سے استخراج کرنے کو "استنباط" کہا جاتا ہے چاہے یہ کام فقہی مسائل میں ہو یا فلسفیانہ، سیاسی اور علمی مسائل میں جو شخص کی قدرت رکھتے ہوں، اور مختلف مسائل پر کافی دسترس رکھتے ہوں اور جو حقائق کو بے بنیاد افواہوں سے اور صحیح مطالب کو غلط امور سے الگ کر کے لوگوں تک پہنچائیں، اس طرح کے لوگوں میں پہلا درجہ پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے جانشین آئمہ اہل بیتؑ کا ہے اور دوسرے درجے میں ایسے علماء ہیں جو ان مسائل میں صاحب نظر ہیں۔ جیسا کہ تفسیر نور الثقلین میں اس آیت کے ضمن میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا:

"هم الائمه" یعنی اس آیت سے مراد آئمہ اہل بیت ہیں۔

اور اس مضمون کی دوسری روایات بھی نقل ہوئی ہیں ممکن ہے اس طرح کی روایات پر لوگ اعتراض کریں کہ رسول اللہؐ تو آیت کے نزول کے وقت موجود تھے لیکن آئمہ اہل بیتؑ کو منصب امامت نہیں ملا تھا اس اعتراض کا جواب واضح ہے کیونکہ یہ آیت پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ کے ساتھ تو مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ آیت تو ایک مکمل قانون، تمام ادوار اور زمانوں کے لیے ہے جو دشمنوں اور نادان مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں کے درمیان غلط خبروں کی اشاعت کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

غلط خبریں اور افواہیں پھیلانے کے نقصانات:

مختلف معاشروں کو جو بڑے مسائل درپیش ہوتے ہیں اور جو معاشروں سے اجتماعی فکر، افہام و تفہیم اور ہم آہنگی کو ختم کر دیتے ہیں ان کا سبب جھوٹی خبریں گھڑنا اور ان کی نشر و اشاعت ہے اس طرح سے کہ بعض اوقات ایک منافق ایک غلط خبر گھڑ لیتا ہے وہ چند افراد تک پہنچاتا ہے اور وہ بلا تحقیق اس کی نشر و اشاعت کرنے لگتے ہیں اور شاید کچھ اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کرتے ہیں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کافی حد تک لوگوں کی فکری توانائی ضائع کر دیتے ہیں اور لوگوں کو اس طرف مشغول کر کے انھیں اضطراب اور پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح کی خبریں لوگوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیتی ہیں اور معاشرے کو اہم فرائض کی انجام دہی سے سست رو اور متردد کر دیتی ہیں۔ اگرچہ وہ گروہ اور معاشرے جن میں جبر ہے اور ان کے گلے گھونٹ دیئے گئے ہیں ان میں بھی جھوٹی خبریں گھڑنا اور ان کی نشر و اشاعت کرنا ایک قسم کے مقابلے یا انتقام جوئی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن صحیح معاشروں میں غلط خبروں کی نشر و اشاعت بہت زیادہ نقصان دہ ہے۔ اگر اس قسم کی خبریں قابل مثبت

Marfat.com

اور مفید افراد کے متعلق ہوں تو وہ انھیں خدمات اور کارنامے انجام دینے کے معاملے میں دل سرد اور سست کر دیتی ہیں اور بعض اوقات ان کی برسہا برس کی حیثیت کو برباد کر دیتی ہیں۔ لوگوں کو ان کے وجود کے فوائد سے محروم کر دیتی ہیں۔ اسی بنا پر اسلام صراحت کے ساتھ جھوٹی خبریں گھڑنے کے عمل سے جنگ کرتا ہے اور جعلسازی، جھوٹ اور تہمت گوئی اور اس کی نشر و اشاعت بھی ممنوع قرار دیتا ہے۔ درج بالا آیت اس کا ایک نمونہ ہے۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر فضل و رحمت تمھارے شامل حال نہ ہوتی اور پروردگار کے مقرر شدہ رہنماؤں کے ذریعے تم اس قسم کی جھوٹی خبروں اور ان کے بُرے نتائج سے چھٹکارہ حاصل نہ کرتے تو تم میں سے بہت سے لوگ شیطانی راستوں پر چل پڑتے اور قلیل افراد ایسے رہ جاتے جو شیطان کی پیروی سے اجتناب کرتے (ولو لا فضل اللہ علیکم و رحمتہ لا تبعتم الشیطان) یعنی پیغمبرؐ اور صاحب نظر و اہل بصیرت علماء ہی ہیں جو غلط مشہور ہونیوالی خبروں کے وسوسوں سے بچ سکتے ہیں لیکن معاشرے کی اکثریت اگر صحیح رہبری سے محروم رہ جائے تو من گھڑت خبروں اور ان کے ضرر رساں اثرات سے نہیں بچ سکتی۔[۱]

۸۴۔ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝

ترجمہ

۸۴۔ راہ خدا میں جنگ کرو۔ تم صرف اپنی ذمہ داری کے جواب دہ ہو اور مومنین کو (اس کام کا) شوق دلاؤ۔ امید ہے کہ خدا کافروں کی قوت کو روک دے (چاہے تم اکیلے ہی میدان میں چلے جاؤ) خدا کی قدرت بہت زیادہ ہے اور اس کی سزا دردناک ہے۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان، قرطبی اور روح المعانی میں اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں اس طرح منقول ہے:

---

[۱] جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "الا قلیلا" "اتبعتم" کی ضمیر سے مستثنیٰ ہے اور آیت میں کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہیں ہے (غور کیجیے گا)۔

Marfat.com

جس وقت ابوسفیان اور قریش کا لشکر فتح و کامیابی کے ساتھ میدانِ اُحد سے پلٹا تو ابوسفیان نے پیغمبرؐ سے معاہدہ کیا کہ بدر صغریٰ کے موقع پر (یعنی ماہ ذی القعدہ میں جو بازار بدر کی زمین پر لگتا تھا) دوبارہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔ جب مقررہ وقت آیا تو پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کو مذکورہ مقام کی طرف جانے کی دعوت دی لیکن مسلمانوں کی ایک جماعت جو جنگ احد کی شکست کی تلخی کو ابھی تک نہیں بھولی تھی اس نے شدت کے ساتھ جانے کی مخالفت کی اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو دوبارہ چلنے کی دعوت دی تو اس موقع پر صرف ستر آدمی پیغمبرؐ کے ہم رکاب ہو کر اس مقام پر پہنچے۔ لیکن ابوسفیان (جو مسلمانوں کا سامنا کرنے سے خوف زدہ تھا) مقابلہ کرنے نہ آیا اور پیغمبر اکرمؐ اپنے اصحاب کے ساتھ صحیح وسلامت مدینہ لوٹ آئے۔

تفسیر

ہر شخص اپنے فرائض کا جوابدہ ہے

جہاد سے متعلق آیات کے بعد اس آیت میں ایک بہت بڑا حکم پیغمبرؐ کو دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اکیلے دشمن کے مقابلہ میں کھڑے ہو جائیں۔ چاہے ایک شخص بھی میدان میں ان کا ہم قدم نہ ہو۔ کیونکہ وہ صرف اپنی ذمہ داری کے لیے جوابدہ ہیں اور وہ دوسرے لوگوں کے بارے میں شوق دلانے اور دعوتِ جہاد دینے کے علاوہ ان کی کوئی مسئولیت نہیں ہے (فقاتل فی سبیل اللہ لا تکلف الا نفسک وحرض المؤمنین) حقیقت میں یہ آیت ایک اہم اجتماعی حکم خصوصاً رہبروں کے متعلق اپنے اندر سموئے ہوئے ہے وہ یہ ہے کہ انھیں اپنے کام میں اس قدر پختہ عزم، ثابت قدم اور اٹل ہونا چاہیے کہ اگر کوئی شخص بھی ان کی دعوت پر "لبیک" نہ کہے تب بھی وہ اپنے مقدس مقصد اور منزل کے حصول کی جدوجہد سے دستبردار نہ ہوں۔ دوسروں کو اپنے فرائض کی انجام دہی کی دعوت دینے کے باوجود اپنے لائحہ عمل کو دوسروں کی مرضی پر نہ چھوڑیں۔ کوئی رہبر بھی جب تک ایسے عزم صمیم کا حامل نہ ہو وہ رہبری کے اہل نہیں اور نہ ہی وہ اپنے مقاصد کے حصول کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خصوصاً خدا کے مقرر شدہ رہبر و رہنما بلند عزم و حوصلہ اور کردار کے مالک ہوتے ہیں کیونکہ انھیں خدا کی ذات پر تکیہ ہوتا ہے وہ خدا کہ جو تمام توانائیوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔

لہٰذا اس حکم کے بعد خدا فرماتا ہے: امید ہے کہ خدا تیری سعی و کوشش کے ذریعہ دشمنوں کی قدرت وطاقت کو ختم کر دے گا چاہے ان کے مدمقابل تو اکیلا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس کی قدرت تمام قدرتوں سے مافوق اور اس کی سزا تمام عذابوں سے بڑھ کر ہے (عسی اللہ ان یکف بأس الذین کفروا واللہ اشد بأسا واشد تنکیلا) [1]

---

[1] بأس کے معنی لغت میں قوت، استحکام اور شجاعت ہے اور تنکیل مادہ نکول سے خوف کے مارے رک جانے کے معنی میں ہے اور اصل میں نکل (بروزن اکل) کو جانور کی لگام کے معنی میں لیا گیا ہے اسی بنا پر تنکیل جو کہ بات کا مصدر ہے ایسے کام کی انجام دہی کے مقصد میں آتا ہے کہ مقابل کی طرف جسے مشاہدہ کرنے کے ساتھ خلاف ورزی سے لوٹ آئے اور یہ وہی سزا و عذاب ہے کہ جو ستم گروں سے دوسرے لوگوں کی عبرت کا باعث بنتا ہے۔

Marfat.com

کلام خدا میں "عسیٰ" اور "لعل" کے معنی

لفظ "عسیٰ" عربی لغت میں شائد کے معنی میں تردّد کا مفہوم بھی دیتا ہے اور "لعل" پر امید ہونے، انتظار اور ایسے امور کی توقع کے معنی میں آتا ہے آئندہ جن کے وجود کا یقین نہ ہو بلکہ احتمال ہو۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے الفاظ انسانوں کی گفتگو میں آنا تو فطری اور عین طبعی ہے کیونکہ انسان تمام مسائل سے آگاہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کی صلاحیت و قدرت بھی محدود ہے اور وہ جو کچھ کرے اس کے انجام کو اپنی مرضی کے تابع نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ خدا جو ماضی، حال اور مستقبل سے مکمل طور پر باخبر ہے اور جو کرنا چاہے اس کا اختیار رکھتا ہے اس کے لیے "جہالت" یا "بے اختیار" ہونے کے الفاظ استعمال کرنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اس لیے بہت سے علماء یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس قسم کے الفاظ جو اس کے کلام میں استعمال ہوں وہ اپنے اصل معنی میں استعمال نہیں ہوتے بلکہ ان کے کچھ اور معنی نکلتے ہیں مثلاً "عسیٰ" وعدہ کے معنی اور "لعل" طلب کے معنی میں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ کلام خدا میں بھی اپنے وہی اصلی معانی رکھتے ہیں اور ان کا لازمہ جہالت اور عدم اختیار نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ ایسے مواقع پر استعمال ہوتے ہیں کہ جہاں مقصد تک پہنچنے کے لیے کئی ایک مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے تو جس وقت ان میں سے ایک یا کئی ایک مقدمات حاصل ہو جائیں تو پھر بھی اس مقصد کے موجود ہونے کا قطعی اور یقینی حکم نہیں لگایا جا سکتا بلکہ چاہیے کہ اسے احتمالی حکم کے طور پر بیان کیا جائے۔

مثلاً قرآن کہتا ہے:۔

واذا قرء القراٰن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون

جب قرآن پڑھا جائے تو کان دھر کے سنو اور خاموش رہو، اُمید ہے کہ خدا کی رحمت تمھارے شامل حال ہو۔ (اعراف، ۲۰۴)

واضح ہے کہ صرف قرآن کی آیات کو کان دھر کے سننے سے خدا کی رحمت انسان کے شامل حال نہیں ہوتی بلکہ یہ تو ایک مقدمہ ہے اس کے علاوہ بھی دیگر لوازم ہیں جن میں ان آیات کا فہم و ادراک اور اس کے بعد ان احکام پر عمل درآمد جو ان آیات میں موجود ہیں بھی شامل ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے مواقع پر ایک مقدمہ کے موجود ہونے سے نتیجہ کے حصول کا قطعی اور یقینی حکم نہیں لگایا جا سکتا بلکہ اسے ایک احتمالی حکم کے طور پر بیان کرنا ہوگا دوسرے لفظوں میں کلام خدا میں اس قسم کی تعبیرات تو بیدار کرنے اور سننے والے کو اس طرف متوجہ کرنے کے لیے ہیں کہ اس کام کے علاوہ کچھ اور شرائط و مقدمات بھی مقصد تک پہنچنے کے لیے ضروری ہیں مثلاً اسی مثال میں خدا کی رحمت کا شعور حاصل کرنے کے لیے قرآن کو غور سے سننے کے ساتھ اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

زیر بحث آیت پر بھی یہ گفتگو مکمل طور پر صادق آتی ہے کیونکہ کفار کی طاقت صرف مومنین کو دعوت جہاد دینے اور انھیں شوقِ جہاد دینے سے ختم نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ جہاد کے باقی لائحہ عمل پر عملدرآمد بھی ضروری ہے تاکہ اصل مقصد حاصل ہو سکے اس بنا پر ضروری نہیں کہ یہ الفاظ جب خدا کے کلام میں آئیں تو ان کے حقیقی معنی سے صرف نظر کر لیا جائے [1]

[1] راغب نے کتاب مفردات میں اس قسم کے الفاظ (عسیٰ وغیرہ) کی تفسیر میں ایک دوسرا احتمال بھی بیان کیا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

Marfat.com

۸۵۔ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ○

ترجمہ

۸۵۔ جو شخص نیک کام کی تحریک دے اس میں سے اس کا حصّہ ہوگا اور جو بُرے کام کے لیے اُبھارے گا تو اس میں سے (بھی) اسے حصّہ ملے گا۔ اور خدا ہر چیز کا حساب کرتا اور اسے محفوظ رکھتا ہے۔

تفسیر

اچھے یا بُرے کام کی تحریک دلانے کا نتیجہ

جیسا کہ گذشتہ آیت کی تفسیر میں اشارہ ہوچکا ہے قرآن کہتا ہے کہ ہر شخص پہلے مرحلہ میں اپنے کام کا جوابدہ ہے نہ کہ دوسروں کا۔ لیکن اس بنا پر کہ اس سے غلط فائدہ نہ اٹھایا جائے اس آیت میں کہتا ہے: یہ درست ہے کہ ہر شخص اپنے فعل کا جوابدہ ہے لیکن جو شخص دوسرے کو نیک کام پر ابھارے تو اس کا حصہ ملے گا اور جو شخص دوسرے کو کسی بُرے کام پر اکسائے تو اس کا حصّہ (بھی) اس میں ہوگا (من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منہا و من یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منہا) اس بنا پر ہر شخص کا اپنے اعمال کا جواب دہ ہونے کے معنی یہ نہیں کہ وہ دوسروں کو دعوتِ حق دینے اور فساد کا مقابلہ کرنے سے آنکھیں بند کرلے اور اسلام کی روحِ اجتماعیت کو مجروح کرتے ہوئے تجرد و انفرادیت کے ذریعے معاشرے سے بیگانگی کا راستہ اختیار کرے۔ شفاعت اصل میں مادہ شفع (بروزن نفع) سے جفت کے معنی میں ہے اس بنا پر ایک چیز کا دوسری میں منضم و مدغم ہوجانا شفاعت کہلاتا ہے البتہ کبھی کبھار یہ راہنمائی اور ارشاد و ہدایت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (جس طرح درج بالا آیت میں ہے) تو اس وقت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا معنی دیتا ہے (اور شفاعت سیئہ اس کے برعکس یعنی امر بالمنکر و نہی عن المعروف ہے) لیکن اگر گنہ گاروں کو ان کے انجام سے نجات دینے کا موقع ہو تو پھر یہ ایسے گنہ گار افراد کی مدد کرنے کے معنی میں آتا ہے جو شفاعت کے لیے اہلیت اور لیاقت رکھتے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں شفاعت کبھی تو عمل کی انجام دہی سے پہلے ہوتی ہے جو رہنمائی کے معنی میں ہے اور کبھی عمل کی انجام دہی کے بعد ہوتی ہے

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) اور وہ یہ کہ ان سے مخاطب اور سننے والے کو امید دلانا مقصود ہے۔ نہ کہ کہنے والے کی امید بیان کرنا اور واضح تر الفاظ میں جب خدا کہتا ہے "عسیٰ و لعل" تو اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ میں امید رکھتا ہوں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم اُمید رکھو۔

Marfat.com

جہاں عمل کے نتائج سے نجات دینے کے معنی میں ہے بہرحال دونوں طرح سے ایک چیز دوسری کے لیے ضمیمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ آیت اگرچہ ایک کلی مفہوم کی حامل ہے، نیک اور بد ہر طرح کی دعوت کا مفہوم اس میں شامل ہے لیکن چونکہ یہ جہاد کی آیات کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے لہٰذا شفاعت حسنہ سے پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے تشویق جہاد مراد ہے اور شفاعت سیئہ سے منافقین کی طرف شوق جہاد نہ دلانا مراد ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے کام کا نتیجہ بھگتے گا یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ لفظ شفاعت کی تعبیر اس موقع پر جہاں (نیکیوں اور برائیوں کی طرف) رہبری کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ رہبر کی گفتگو (چاہے خیر کا راستہ بتانے والا رہبر ہو یا شر کا سبق دینے والا) دوسروں پر اسی صورت میں اثر کرے گی جب وہ اپنے لیے دوسروں کی طرح امتیاز نہ برتے بلکہ اپنے آپ کو دوسروں کا ہم دوش اور ساتھی قرار دے۔ یہ ایسا طریقہ ہے، جو اجتماعی اور معاشرتی مقاصد میں بڑا مؤثر ہوتا ہے۔ اگر قرآن میں بعض مواقع پر مثلاً سورۂ شعراء، اعراف، ہود، نمل اور عنکبوت میں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے انبیاء و مرسلین کو جو امتوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے بھیجے گئے ہیں "اخوہم" یا "اخاہم" یعنی ان کا بھائی کہا ہے، تو وہ بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قرآن شفاعت حسنہ یعنی اچھے کام کی طرف راغب کرنے والوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ترغیب دینے والوں کو "نصیب" ملے گا، جب کہ "شفاعت سیئہ" کے ضمن میں کہتا ہے کہ اسے "کفل" میسر آئے گا۔ یہ تعبیر کا اختلاف اس وجہ سے ہے کہ "نصیب" کے معنی ہیں مفید اور زیادہ سودمند اور "کفل" کے معنی ہیں پست اور بری چیز[1]

یہ آیت اسلام کے بنیادی اجتماعی مسائل کی ایک منطق کو واضح کرتی ہے۔ آیت صراحت سے کہتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے اعمال کے معاملے میں ترغیب دینے اور رہنمائی کے عمل میں شریک ہیں اس بنا پر جب بھی کوئی بات یا عمل بلکہ انسان کی خاموشی بھی اگر کسی گروہ کے نیک یا برے عمل کی ترغیب کا باعث بنے تو ترغیب دینے والا اس کام کے نتائج کے قابل ذکر حصہ کا ذمہ دار ہوگا۔ لیکن اس سے اصل کام کرنے والے کا حصہ کم نہیں ہو جائے گا۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

> من امر بمعروف او نهى عن منكر او دل على خير او اشار به فهو شريك ومن امر بسوء او دل عليه او اشار به فهو شريك.
>
> جو شخص کسی اچھے کام کا حکم دے یا برے کام سے روکے یا لوگوں کے لیے عمل خیر کی رہنمائی کرے یا ترغیب دلانے کے لیے کوئی ایسے اسباب فراہم کرے وہ اس عمل میں شریک اور حصہ دار ہے اور اسی طرح جو شخص کسی برے کام کی دعوت دے یا اس کی رہنمائی کرے اور ترغیب دے وہ بھی اس کام میں شریک ہوگا۔
>
> اس حدیث میں تین مرحلوں میں لوگوں کو نیک یا بد کام کی دعوت دینے کا ذکر ہوا ہے۔

---

[1] کفل (بروزن طفل) اصل میں جانور کی پشت کا عقبی اور آخری حصہ ہے جس پر سوار ہونا تکلیف اور سختی کا باعث ہے اس لیے ہر قسم کے گناہ اور برے حصہ کو کفل کہتے ہیں اور ایسے کام کو بھی جس میں بوجھ اور زحمت ہو، کفالت کہتے ہیں۔

Marfat.com

۱۔ مرحلہ حکم

۲۔ مرحلہ دلالت

۳۔ مرحلہ اشارہ

یہ تینوں ترتیب وار قوی، متوسط اور کمزور مرحلے ہیں اسی طرح ہر قسم کی دخل اندازی کسی نیک یا بُرے کام پر ابھارنے کا سبب بنتی ہے اور دخل اندازی کرنے والا اسی نسبت سے اس کے نتائج اور فوائد میں شریک ہوگا۔

اس اسلامی منطق کے مطابق صرف گناہ کرنے والے ہی گنہگار نہیں ہیں بلکہ وہ اشخاص جو کسی کام کی تبلیغ کے مختلف ذرائع استعمال کر کے حالات پیدا کریں۔ یہاں تک کہ ذراسی ترغیب دلانے والے کا ایک لفظ بھی اسے گناہ کرنے والوں میں شامل کرلیتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو خیرات اور نیکی اور نیکیوں کے راستے میں اس قسم کا کام کرتے ہیں وہ بھی اس کا اجر حاصل کرتے ہیں۔

چند ایک روایات جو اس آیت کی تفسیر میں آئی ہیں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شفاعت حسنہ یا سیئہ کے معنی میں سے ایک کسی کے حق میں اچھی یا بُری دعا کرنا بھی ہے جو کہ بارگاہِ خداوندی میں ایک قسم کی شفاعت ہے۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

من دعا لاخیه المسلم بظهر الغیب استجیب له و قال له الملك فلك مثلاه فذلك النصیب۔

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے لیے اس کے پس پشت دعا کرے تو وہ قبول ہوگی اور خدا کا فرشتہ اس سے کہے گا اس سے دوگنا تمھارے لیے بھی ہے اور آیت میں نصیب سے مراد یہی ہے۔[۱]

یہ تفسیر گذشتہ تفسیر سے اختلاف نہیں رکھتی بلکہ شفاعت کے معنی میں وسعت ہے یعنی جو مسلمان کسی دوسرے کی کسی طرح کی مدد کرے وہ چاہے نیکی کی ترغیب کی صورت میں ہو یا بارگاہِ خداوندی میں دعا کی شکل میں ہو یا کسی اور طرح سے اس کے نتیجہ میں شریک ہوگا۔ یہ بات اسلامی پروگراموں کی روحِ اجتماعیت کو اجاگر کرتی ہے اور مسلمانوں کو شخصی اور فقط ذاتی حیثیت سے زندگی گزارنے سے منع کرتی ہے۔

یہ امر اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ انسان دوسروں کی طرف توجہ اور ان کی بہتری کی کوششوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا اور اس سے اس کا ذاتی مفاد خطرے میں نہیں پڑتا۔ بلکہ وہ اس کے نتائج میں شریک ہوتا ہے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: خدا توانا اور صاحبِ قدرت ہے اور تمھارے اعمال کی حفاظت کرتا اور حساب رکھتا ہے اور حسنات و سیئات کے نتیجے میں مناسب جزا و سزا دے گا (وکان اللہ علی کل شیء مقیتًا) خیال رہے کہ "مقیت" اصل میں قوت کے مادہ سے ہے جس کے معنی اس غذا کے ہیں جو انسان کی جان کی حفاظت کرتی ہے اس بنا پر "مقیت" جو باب افعال کا

---

[۱] تفسیر صافی آیہ مذکور کے ذیل میں۔

Marfat.com

اسم فاعل ہے اس شخص کے معنی میں ہے جو دوسروں کو روزی دیتا ہے، چونکہ ایسا شخص اس کی زندگی کا محافظ ہوتا ہے اس لیے لفظ "مقیت" محافظ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ نیز وہ شخص جو روزی دیتا ہو یقیناً اس پر قدرت اور طاقت بھی رکھتا ہے اسی بناء پر یہ لفظ مقتدر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ایسا شخص یقیناً اپنے زیر کفالت لوگوں کا حساب بھی رکھتا ہے اسی وجہ سے یہ لفظ حسیب کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اوپر والی آیت میں ممکن ہے کہ لفظ "مقیت" سے یہ تمام مفاہیم مراد لیے گئے ہوں۔

۸۶۔ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ○

ترجمہ

۸۶۔ جس وقت کوئی شخص تمھیں تحیہ (اور سلام) کہے تو اس کا جواب بہتر انداز سے دو یا (کم ازکم) اسی طرح کا جواب دو، خدا ہر چیز کا حساب رکھتا ہے۔

تفسیر

احترامِ محبّت

اگرچہ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق گذشتہ آیات کے ساتھ اس لحاظ سے ہے کہ گذشتہ آیات کی مباحث جہاد سے متعلق تھیں اور اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر دشمن دوستی اور مصالحت چاہیں تو تم بھی مناسب جواب دو لیکن واضح ہے کہ یہ تعلق اس سے مانع نہیں کہ ایک کلی اور عمومی حکم تمام تحیات اور نوازشات کے اظہار سے متعلق ہو جو مختلف افراد کی طرف سے ہو۔ آیت کی ابتداء میں آیا ہے جب کوئی شخص تمھیں تحیہ کہے تو اس کا جواب بہتر طریقہ سے دو یا کم ازکم اس کے مساوی جواب دو۔ (واذا حییتم بتحیة فحیوا باحسن منها او ردوها) تحیت لغت میں حیات کے مادہ سے دوسرے کے لیے حیات وزندگی کی دعا کرنے کے معنی میں ہے چاہے یہ دعا "سلام علیک" کی صورت میں ہو (خدا تجھے سلامت رکھے) یا حیاک اللہ (خدا تجھے زندہ رکھے) یا اس قسم کے اور الفاظ سے ہو لیکن عام طور پر یہ ہر قسم کے اظہار محبت کے لیے ہے جو لوگ الفاظ کے ذریعہ ایک دوسرے سے کرتے ہیں جس کا واضح ترین اظہار سلام کرنا ہے لیکن کچھ روایات اور تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ عملی اظہار محبت بھی مفہوم تحیت میں شامل ہے تفسیر علی بن ابراہیم میں امام محمد باقرؑ اور امام صادقؑ سے منقول ہے:

المراد بالتحیة فی الایة السلام وغیره من البر

آیت میں محبت سے مراد سلام اور ہر قسم کی نیکی کرنا ہے۔

کتاب مناقب کی ایک روایت میں ہے:

Marfat.com

ایک کنیز نے پھول کی ایک شاخ امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں پیش کی تو اس کے جواب میں امامؑ نے اسے آزاد کر دیا۔ جب آپؑ سے اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ خدا نے ہمیں یہی حسن سلوک سکھاتے ہوئے فرمایا ہے و اذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا۔

اس کے بعد مزید فرمایا: بہتر تحیہ وہی اس کا آزاد کرنا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت ایک کلی حکم اور ہر قسم کے اظہار محبت کا جواب دینے کے سلسلہ میں ہے چاہے وہ زبانی ہو یا عملی۔ آیت کے آخر میں اس لیے کہ لوگ جان لیں کہ تحیات ان کے جوابات اور ان کی برتری و مساوات جس قدر اور جیسے ہوں، خدا سے پوشیدہ پنہاں نہیں ہیں۔ فرماتا ہے: خدا تمام چیزوں کے حساب سے آگاہ ہے (ان اللہ کان علی کل شیء حسیبًا)

سلام عظیم اسلامی تحیّہ ہے

جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا کی تمام ملل و اقوام کے افراد جب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو ایک دوسرے سے اظہار محبت کے لیے کچھ تحیہ پیش کرتے ہیں جو بعض اوقات لفظی ہوتا ہے اور کبھی عملی بھی۔ عمل عموماً تحیت کی علامت ہوتا ہے۔ اسلام میں بھی "سلام" ایک واضح ترین تحیت ہے اور اوپر والی آیت جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے تحیہ اگرچہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے تاہم اس کا ایک واضح اظہار سلام کرنا ہے۔ لہٰذا اس آیت کے مطابق تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ سلام کا عالی تر یا کم از کم مساوی جواب دیں۔

آیاتِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام تحیت کی ایک قسم ہے سورۂ نور کی آیہ ۶۱ میں ہے:

فاذا دخلتم بیوتًا فسلموا علی انفسکم تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ

جب تم کہیں داخل ہو تو ایک دوسرے پر تحیت الٰہی بھیجو، وہ تحیہ جو مبارک اور پاکیزہ ہے۔

اس آیت میں سلام کو مبارک اور پاکیزہ خدائی تحیہ کہہ کر پکارا گیا ہے اور ضمنی طور پر اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سلام علیکم کا معنی اصل میں سلام اللہ علیکم ہے "یعنی پروردگار کا تم پر سلام ہو" یا خدا انھیں سلامت رکھے۔ اسی سبب سے سلام کرنا ایک قسم کا دوستی، صلح اور جنگ نہ کرنے کا اعلان ہے۔ قرآن کی کچھ آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل بہشت کا تحیہ بھی سلام ہے۔

اولئک یجزون الغرفۃ بما صبروا و یلقون فیھا تحیۃ و سلامًا

"اہل بہشت اپنی استقامت اور صبر کی وجہ سے بہشت کے انعامات اور بلند مقامات سے بہرہ یاب ہوں گے اور انھیں تحیہ و سلام سے نوازا جائے گا۔"

(فرقان ـ ۷۵)

سورہ ابراہیم کی آیہ ۲۳ اور سورۂ یونس کی آیہ ۱۰ میں بھی اہلِ بہشت کے بارے میں ہے:

Marfat.com

تحیتھم فیھا سلام

"ان کا تحیہ بہشت میں سلام ہے۔"

آیاتِ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحیت بمعنی سلام (یا اس کے مفہوم کا کچھ متبادل) گذشتہ اقوام میں بھی مروج تھا جیسا کہ سورۂ ذاریات کی آیہ ۲۵ میں حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں آیا ہے کہ جب قوم لوطؑ کو سزا و عذاب دینے والے فرشتے بھیس بدل کر ابراہیمؑ کے پاس آئے تو آپؑ پر سلام کہا اور آپؑ نے بھی ان کے سلام کا جواب دیا۔

اذ دخلوا علیہ فقالوا سلاماً قال سلام قوم منکرون

زمانہ جاہلیت کے عربی اشعار سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحیت سلام کے ذریعہ اس زمانہ میں بھی تھی [۱]

جب ہم غیر جانبدارانہ طور پر اس اسلامی تحیت کا مختلف اقوام کی تحیت کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت ہم پر زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اسلامی تحیت خدا کی طرف توجہ بھی ہے مخاطب کے لیے سلامتی کی دعا بھی اور صلح و امن کا اعلان بھی ہے۔ اسلامی روایات میں سلام کے متعلق بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے یہاں تک کہ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

من بدء بالکلام قبل السلام فلا تجیبوہ

جو شخص سلام سے پہلے گفتگو شروع کر دے اس کا جواب نہ دو [۲]

امام صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ خدا فرماتا ہے:

البخیل من بخیل بالسلام

بخیل وہ ہے جو سلام کرنے میں بخل سے کام لے۔ [۳]

دوسری حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

ان اللہ عزوجل یحب افشاء السلام

افشاء سلام — سلام عام کرنے والے کو خدا دوست رکھتا ہے۔ [۴]

افشاء سلام سے مراد مختلف افراد کو سلام کرنا ہے۔ احادیث میں سلام کے بارے میں بہت سے آداب بیان ہوئے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ سلام کے بارے میں بہت سے آداب بیان ہوئے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ سلام صرف ان افراد سے مخصوص نہیں ہے جن سے انسان خصوصی شناسائی رکھتا ہو جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے سوال ہوا:

"کون سا عمل بہتر ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا:

"تطعم الطعام وتقرء السلام علی من عرفت ومن لم تعرف"

کھانا کھلاؤ اور سلام کرو اس شخص کو جسے تم جانتے ہو یا نہیں جانتے۔ [۵]

---

[۱] ولوان لیلی الاخیلیۃ سلمت، علی ودونی جندل وصفائح، لسلمت تسلیم البشاشۃ اوزقا الیہا صدی من جانب القبر صائح
یہ شعر زمانہ جاہلیت کے توبہ نامی شاعر کے ہیں۔ [۲] اصول کافی جلد ۲ باب تسلیم [۳]، [۴] اصول کافی۔ جلد ۲۔ باب تسلیم

[۵] تفسیر فی ظلال ذیل آیہ مذکورہ۔

Marfat.com

احادیث میں بھی آیا ہے کہ سوار پیادہ کو اور بیش قیمت سواری والا کم قیمت سواری والوں کو سلام کریں گویا یہ حکم اپنے تکبر کا مقابلہ کرنے کے لیے ہے جو دولت، ثروت اور مخصوص مادی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ بات آج کل دیکھنے میں آتی ہے کہ لوگ آداب وسلام کو نچلے طبقہ کی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور انھوں نے اسے استعمار، استبداد اور بت پرستی کی شکل دے رکھی ہے اگر ہم پیغمبر اکرمؐ کی سیرت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آپؐ تمام لوگوں کو یہاں تک کہ بچوں کو بھی سلام کرتے تھے۔ البتہ یہ بحث اس حکم سے اختلاف نہیں رکھتی جو بعض روایات میں آیا ہے کہ بچے جو عمر کے لحاظ سے چھوٹے ہوتے ہیں وہ اپنے سے بڑوں کو سلام کریں کیونکہ ادب اور احترام کا تقاضا یہی ہے اس بات کا طبقاتی تفاوت اور مادی حیثیت کے اختلاف سے کوئی تعلق نہیں۔

چند روایات میں حکم دیا گیا ہے کہ سود خور، فاسق، کجرو اور منحرف وغیرہ پر سلام نہ کرو۔ یہ بھی فساد اور برائی کے خلاف ایک طرح کا اقدام ہے ہاں البتہ ایسے لوگوں سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے یا رابطے کے لیے تاکہ انھیں خدائی نافرمانی سے بچنے کی دعوت دی جاسکے، سلام کرنے کی اجازت ہے " تحیت باحسن" سے مراد یہ ہے کہ سلام کی دوسری عبارات مثلاً ورحمۃ اللہ یا ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، کو ساتھ ملانا۔

تفسیر درالمنثور میں ہے:

> ایک شخص نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا: السلام علیک۔ تو آپؐ نے فرمایا" وعلیک السلام ورحمۃ اللہ" دوسرے نے عرض کیا" السلام علیک ورحمۃ اللہ" تو آپؐ نے فرمایا" وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"، تیسرے شخص نے کہا" السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"، تو پیغمبرؐ نے فرمایا" وعلیک" جب اس نے سوال کیا کہ آپؐ نے مجھے مختصر جواب کیوں دیا ہے تو فرمایا" قرآن کہتا ہے تحیہ کا جواب زیادہ بہتر طریقہ سے دو لیکن تو نے کوئی چیز باقی نہیں رکھی"

حقیقت میں پیغمبرؐ نے پہلے اور دوسرے شخص کے جواب میں احسن طریقہ پر تحیہ کیا ہے لیکن تیسرے شخص کے بارے میں مساوی طریقہ اختیار کیا ہے کیونکہ" وعلیک" کا مفہوم ہے کہ جو کچھ تو نے کہا وہ تیرے لیے بھی ہو[1]

۸۷۔ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيۡثًا ۝

ترجمہ

۸۷۔ وہ خدا جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، تم سب کو یقینی طور پر قیامت کے دن کہ جس میں کوئی شک نہیں

---

[1] درالمنثور جلد ۲ صفحہ ۸

Marfat.com

جمع کرے گا اور کون ہے جو خدا سے زیادہ سچا ہو۔

تفسیر

درج بالا آیت گذشتہ آیات کی تکمیل اور بعد میں آنے والی آیات کا مقدمہ ہے کیونکہ گذشتہ آیت میں "تحیت" کے حکم کے بعد فرمایا ہے کہ خدا تمھارے اعمال کا حساب رکھتا ہے اس آیت میں مسئلہ قیامت اور روز قیامت ہونے والی عام عدالت کا ذکر ہے اور اسے مسئلہ توحید اور خدا کی یکتائی کے مسئلہ کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے جو کہ ایمان کا ایک اور رکن ہے۔ فرماتا ہے، کوئی معبود اس کے علاوہ نہیں ہے اور لازمی طور پر تمھیں قیامت کے دن اکٹھا مبعوث کرے گا وہی قیامت کا دن کہ جس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے (اللہ لا الٰہ الا ھو لیجمعنکم الی یوم القیٰمۃ لا ریب فیہ) "یجمعنکم" کا لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمام افراد کے لیے روز محشر ایک ہی ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ مریم کے آخر میں آیۃ ۹۲ سے لے کر ۹۵ تک اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ خدا کے تمام بندے چاہے وہ اہل زمیں ہوں یا دوسرے کرأت کے رہنے والے، سب ایک ہی دن مبعوث ہوں گے۔

لَا رَیْبَ فِیْہِ (اس میں کوئی شک و شبہ نہیں) قیامت کے آنے کے بارے میں اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیات میں یہ تعبیر ان قطعی اور مسلم دلائل کی طرف اشارہ ہے جو اس دن قیامت کی خبر دیتے ہیں مثلاً قانون تکامل، تخلیق کا حکمت و فلسفہ اور قانون عدالت پروردگار معاد کی بحث میں ان کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے آخر میں اس مطلب کی تاکید کے لیے فرماتا ہے کون ہے جو خدا سے زیادہ سچا ہے (و من اصدق من اللہ حدیثا)۔

لہٰذا وہ جس قسم کا وعدہ روز قیامت یا اس کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں کرتا ہے اس پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ جھوٹ کا سرچشمہ جہالت ہے یا کمزوری اور ضرورت مندی ہے لیکن وہ خدا جو سب سے زیادہ جاننے والا ہے اور سب سے بے نیاز ہے، وہ سب سے زیادہ سچا ہے اور اصولی طور پر جھوٹ اس کے لیے کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

۸۸۔ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ○

ترجمہ

۸۸۔ منافقین کے بارے میں تم دو گروہ کیوں ہو گئے ہو، کچھ ان سے جنگ کرنے کو ممنوع اور کچھ جائز سمجھتے ہو حالانکہ خدا نے ان کے اعمال کی بنا پر ان کے افکار پلٹ کر رکھ دیئے ہیں کیا تم چاہتے ہو ایسے اشخاص کو جنھیں خدا نے

Marfat.com

(ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے) گمراہ رکھا ہے ہدایت کرو، حالانکہ جسے خدا گمراہ رکھے اس کے لیے تمھیں کوئی راستہ نہیں ملے گا۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے ابنِ عباس سے نقل کیا ہے کہ مکہ کے کچھ لوگ بظاہر مسلمان تھے لیکن حقیقت میں منافقین کی صف میں سے تھے اسی لیے وہ مدینہ کی طرف ہجرت کرنا نہیں چاہتے تھے اور عملی طور پر بُت پرستوں کے خیر خواہ اور مددگار تھے، لیکن آخرکار مکہ کو چھوڑنے پر مجبور ہوگئے (تاکہ وہ مدینہ کے قریب آجائیں اور شاید اپنی خصوصی حیثیت کی وجہ سے جاسوسی کے مقصد کے لیے انھوں نے ہجرت کی ہو) اور وہ خوش تھے کہ انھیں مسلمان اپنے میں سے سمجھتے ہیں لہٰذا ان کا خیال تھا کہ مدینہ میں داخل ہونا ان کے لیے قدرتی طور پر کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گا۔ مسلمانوں کو اس بات کا پتہ چل گیا لیکن بہت جلد منافقین سے سلوک کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف رائے پیدا ہوگیا ایک گروہ کا نظریہ تھا کہ ان کو دھتکار دیا جائے کیونکہ حقیقت میں یہ دشمنانِ اسلام کے مددگار ہیں لیکن کچھ مسلمان ظاہر بین اور سادہ لوح تھے وہ اس کے مخالف تھے اور کہتے تھے کہ ہم کس طرح ایسے لوگوں سے محاذ آرائی کریں جو توحید اور رسالت کی گواہی دیتے ہیں اور صرف ہجرت نہ کرنے کے جرم میں اُن کے خون کو مباح اور حلال قرار دیں۔ اس پر درج بالا آیت نازل ہوئی جس میں دوسرے گروہ کو اس غلط فہمی پر ملامت کی گئی اور پھر ان کی رہنمائی بھی کی گئی[1]

تفسیر

مندرجہ بالا شانِ نزول کی طرف توجہ کرنے سے اس آیت اور بعد والی آیت کا منافقین سے متعلق گذشتہ آیات سے ربط مکمل طور پر واضح ہوتا ہے آیت کی ابتدا میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: منافقین کے بارے میں کیوں بٹ گئے ہو اور تم میں سے ہر ایک جدا فیصلہ کرتا ہے (فما لکم فی المنافقین فئتین[2])۔

یعنی یہ افراد جو ہجرت نہ کرنے اور مشرکین کے شریک کار رہنے اور مجاہدینِ اسلام کی صف میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے اپنے نفاق کو ظاہر کر چکے ہیں ان کے اعمال اور انجام کے بارے میں کسی کو شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ یہ لوگ اوّل درجے کے منافقین ہیں تو پھر بعض لوگ کیوں ان کے اظہار توحید اور خدا پر ایمان لانے کے دعویٰ سے دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی شفاعت وسفارش کرتے ہیں جبکہ گذشتہ آیات میں بتایا جا چکا ہے کہ من یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا اور

---

[1] اس آیت اور بعد والی آیات کی اور بھی شانِ نزول بیان کی گئی ہے انھی میں سے بعض میں اس کو جنگ احد کے واقعہ سے مربوط سمجھا گیا ہے حالانکہ بعد والی آیات، جو ہجرت کی طرف اشارہ کرتی ہیں اس سے مربوط نہیں بلکہ اسی شانِ نزول کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

[2] اوپر والے جملے میں حقیقتاً اور لفظاً مخفی ہے جو بقیہ جملہ پر توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے اور اصل جملہ یوں بنتا ہے فما لکم تفرقتم فی المنافقین فئتین۔

Marfat.com

اس طرح وہ اپنے آپ کو ان کے بُرے انجام میں کیوں شریک کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے۔ منافقین کے اس گروہ سے ان کے بُرے اور شرمناک اعمال کی وجہ سے خدا نے اپنی حمایت اور توفیق منقطع کرلی ہے اور منصوبے مکمل طور پر ناکام کر دیئے ہیں اور ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی شخص پاؤں پر کھڑا ہونے کی بجائے سر کے بل کھڑا ہو (واللہ ارکسھم بما کسبوا)[1] ضمنی طور پر "بما کسبوا" سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت، سعادت، اور نجات کے راستے سے ہٹ جانا انسان کے خود اسکے اعمال کا نتیجہ ہے اور اگر اس عمل کو خدا سے نسبت دی جائے تو وہ اس وجہ سے ہے کہ خدا حکیم ہے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق سزا دیتا ہے اور لیاقت و اہلیت کی مناسبت سے اسے جزا بھی دے گا۔ آیت کے آخر میں سادہ لوح افراد کو، جو منافقین کے اس گروہ کی حمایت کرتے ہیں خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے، کیا تم چاہتے ہو کہ ان لوگوں کو جنھیں خدا نے ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے ہدایت سے محروم کر دیا ہے ہدایت کرو حالانکہ یہ لوگ ہدایت کے قابل نہیں ہیں (اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ ومن یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلا) کیونکہ یہ تو خدا کی انمٹ سنت ہے کہ کسی شخص کے اعمال کے اثرات اس سے جبر نہیں ہوں گے تو تم یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ وہ افراد جن کی نیت صحیح نہیں اور جن کے دلوں میں نفاق بھرا ہوا ہے اور جو عملاً خدا کے دشمنوں کی حمایت کرتے ہیں انھیں ہدایت نصیب ہوگی یہ تو بے جا اور غیر منطقی توقع ہے[2]

۸۹۔ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۙ

ترجمہ

۸۹۔ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ اور پھر وہ اور تم ایک دوسرے کے برابر ہو جاؤ۔ پس ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ مگر یہ کہ (وہ توبہ کریں اور) خدا کی راہ میں ہجرت کریں۔ لیکن وہ لوگ جو کام سے منہ موڑ لیں (اور تمھارے خلاف اقدامات جاری رکھیں) انھیں جہاں پاؤ قید کرلو اور (اگر ضروری ہو تو) انھیں قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

تفسیر

گزشتہ آیت ان منافقین کے بارے میں تھی جن کی حمایت میں کچھ سادہ لوح مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انکی

---

[1] ارکسھم رکس (بروزن مکث) کے مادہ سے کسی چیز کو اوندھا کرنے کے معنی میں ہے اور بعض پھیرنے کے بھی معنی لیتے ہیں۔

[2] اس تفسیر کی پہلی جلد میں ہدایت و ضلالت کے بارے میں مفصل بحث آچکی ہے۔

Marfat.com

سفارش کرتے تھے جبکہ قرآن نے انھیں اسلام سے بیگانہ قرار دے دیا اور اب اس آیت میں فرماتا ہے: ان کے اندر اس قدر جہالت اور تاریکی ہے کہ نہ صرف وہ خود کافر ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ تاکہ ایک دوسرے کے مساوی ہو جاؤ (ودوالو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء) اس وجہ سے وہ تو عام کفار سے بھی بدتر ہیں۔ کیونکہ عام کافر دوسروں کے عقائد باطل کرنے کے درپے رہتے ہیں کیونکہ وہ ایسے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ ان میں سے کسی کو دوست نہ بنائیں (فلا تتخذوا منھم اولیاء) مگر یہ کہ وہ اپنے افعال سے باز آجائیں اور نفاق اور تخریب کاری سے دستبردار ہو جائیں اور اس کا ثبوت اور نشانی یہ ہے کہ وہ کفر اور نفاق کے مرکز سے اسلام کے مرکز (مکہ سے مدینہ) کی طرف ہجرت کریں (حتّٰی یھاجروا فی سبیل اللہ)۔

لیکن اگر وہ گروہ ہجرت کے لیے تیار نہ ہوں تو پھر سمجھ لو کہ وہ کفر و نفاق سے دستبردار نہیں ہوئے اور ان کا مسلمان کہلانا صرف جاسوسی اور تخریب کاری کی غرض سے ہے اور اس صورت میں وہ تمھیں جہاں کہیں بھی مل جائیں انھیں قید کر لو یا اگر ضروری ہو تو انھیں قتل کر دو (فان تولوا فخذوھم واقتلوھم حیث وجدتموھم)۔

آیت کے آخر میں دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ کبھی ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ (ولا تتخذوا منھم ولیًا ولا نصیرًا)۔

درج بالا آیت میں منافقین کے اس گروہ کے بارے میں جو سخت احکام آئے ہیں اس وجہ سے ہیں کہ ایک زندہ معاشرے کی تشکیل کے لیے جو اصلاح کے راستے پر چلتا ہے ایسے دوست نما خطرناک دشمن سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ اسلام غیر مسلم افراد (مثلاً یہود و نصارٰی) سے چند شرائط کے ساتھ صلح کی اجازت دے دیتا ہے اور ان سے کوئی تعرض نہ کرنے کے لیے تیار ہے مگر منافقین کے اس گروہ کے بارے میں اس قدر شدت سے کام لیتا ہے۔ بظاہر وہ مسلمان ہیں پھر بھی انھیں قید کرنے بلکہ بوقت ضرورت ان کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ اس امر کی اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایسے افراد اسلام کے پردے میں اسلام کو ایسی گزند پہنچا سکتے ہیں جیسی کوئی دشمن نہیں پہنچا سکتا۔

ایک سوال

ممکن ہے کہا جائے کہ پیغمبر اکرمؐ کا منافقین کے بارے میں یہ رویہ تھا کہ آپ کبھی ان کے قتل کا حکم نہیں دیتے تھے کہ دشمن کہیں آپ کو اپنے اصحاب کے قتل میں ملوث نہ کریں یا کچھ لوگ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ذاتی دشمنوں کو منافق کہہ کر ان سے نہ الجھیں اور انھیں قتل نہ کر دیں۔

جواب

توجہ رہے کہ پیغمبرؐ اکرم کا یہ رویہ صرف مدینہ کے منافقین اور ان جیسے لوگوں کے بارے میں تھا جو بظاہر مسلمان تھے، لیکن

Marfat.com

وہ لوگ جو مکہ کے منافقین کی طرح واضح طور پر اسلام دشمنوں سے ملے ہوئے تھے وہ اس حکم میں شامل نہیں تھے۔

۹۰۔ اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍۭ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ یُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ یُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَیْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَیْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَیْهِمْ سَبِیْلًا ○

ترجمہ

۹۰۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے تمھارے ہم پیمان لوگوں سے عہد و پیمان باندھا ہے یا وہ جو تمھاری طرف آتے ہیں اور تم سے جنگ کرنے یا اپنی قوم سے جنگ کرنے سے عاجز ہیں (نہ تم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں اور نہ اپنی قوم سے لڑنے کی طاقت رکھتے ہیں) اور اگر خدا چاہے تو انھیں تم پر مسلط کر دے تاکہ وہ تم سے جنگ کریں (اب جبکہ) انھوں نے صلح کی پیشکش کی ہے تو خدا تمھیں اجازت نہیں دیتا کہ ان سے تعرض کرو۔

شانِ نزول

مختلف روایات سے جو آیت کی شان نزول کے بارے میں آئی ہیں اور مفسرین نے ہر قسم کی تفاسیر میں انھیں نقل کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبائل عرب میں دو قبیلے "بنی حمزہ" اور "اشجع" نام کے تھے ان میں سے پہلے قبیلے نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا عہد کیا تھا اور قبیلہ اشجع نے بھی بنی حمزہ سے ایسا معاہدہ کر رکھا تھا۔ بعض مسلمان بنی حمزہ کی طاقت اور عہد شکنی سے خوفزدہ تھے لہذا انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کو تجویز پیش کی کہ اس سے پہلے کہ وہ حملہ آور ہوں مسلمان ان پر حملہ کر دیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

"کلا فانھم ابر العرب بالوالدین و اوصلھم للرحم و اوفاھم بالعھد"

نہیں کبھی یہ کام نہ کریں کیونکہ وہ تمام قبائل عرب میں اپنے ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرنیوالے ہیں اور اپنے عزیز و اقارب پر سب سے زیادہ مہربان ہیں اور بہتر ایفائے عہد کرنے والے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ اشجع قبیلہ کے سات سو افراد مسعود بن رجیلہ کی سرکردگی میں مدینہ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے نمائندے ان کے پاس بھیجے کہ وہ کس مقصد کے لیے آئے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کے لیے آئے ہیں جب پیغمبر اکرمؐ کو یہ معلوم ہوا تو حکم دیا کہ بہت سی مقدار میں کھجوریں تحفہ کے طور پر ان کے پاس لے جاؤ اس کے بعد حضورؐ نے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے کہا کہ ایک طرف ہم آپ کے دشمنوں سے مقابلے کی

Marfat.com

سکت نہیں رکھتے کیونکہ ہماری تعداد کم ہے اور دوسری طرف ہم آپ سے مقابلے کی ہم طاقت رکھتے ہیں نہ آپ سے ہم لڑنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہماری سکونت آپ کے قریب نہیں ہے لہٰذا ہم اس لیے آئے ہیں کہ آپ سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کریں۔ اس موقع پر درج بالا آیات نازل ہوئیں جن میں اس ضمن میں مسلمانوں کو ضروری احکام جاری کیے گئے۔ چند ایک روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا ایک حصّہ قبیلہ "بنی مدلج" کے بارے میں نازل ہوا ہے وہ لوگ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ہم نہ تو آپ کے ہم نوا ہیں اور نہ ہی آپ کے مخالف کوئی قدم اٹھائیں گے۔

پیغمبر اکرمؐ نے ان سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرلیا۔

تفسیر

صلح کی پیش کش کا استقبال

ان منافقین کے لیے جو دشمنان اسلام کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اس سخت حکم کے بعد زیرِ نظر آیت میں حکم دیتا ہے کہ اس قانون سے دو گروہ مستثنیٰ ہیں:

۱ جو تمھارے کسی ہم پیمان کے ساتھ مربوط ہیں اور انھوں نے اس سے معاہدہ کر رکھا ہے (الا الذین یصلون الی قوم بینکم و بینھم میثاق)۔

۲ وہ جو اپنی مخصوص حالت کی وجہ سے ایسے حالات سے دوچار ہیں کہ نہ تو وہ تمھارے ساتھ مقابلے کی طاقت رکھتے ہیں نہ تمھارا ساتھ دے سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے قبیلے سے ٹکرانے کی حوصلہ رکھتے ہیں (او جاءوکم حصرت صدورھم ان یقاتلوکم او یقاتلوا قومھم)۔

ظاہر ہے کہ پہلے گروہ کو معاہدے کے احترام کی وجہ سے اس قانون سے مستثنیٰ ہونا چاہیے اور دوسرا گروہ بھی اگرچہ مقدور نہیں ہے اسے چاہیے کہ حق کی تلاش کے بعد اس سے اپنا رشتہ جوڑ لے۔ لیکن چونکہ وہ غیر جانبدار رہنے کا اعلان کرتا ہے لہٰذا اس پر اعتراض کرنا عدل اور مردانگی کے اصولوں کے خلاف ہے اس کے بعد اس بنا پر کہ مسلمان اپنی شاندار کامیابیوں پر مغرور نہ ہو جائیں اور انھیں اپنی لشکری قوت اور مہارت کا مرہونِ منت سمجھیں اس غیر جانبدار گروہ کے مقابلہ میں ان کے انسانی جذبات کو تحریک دیتے ہوئے فرماتا ہے: اگر خدا چاہے تو ان (کمزور) لوگوں کو تم پر مسلّط کر سکتا ہے تاکہ وہ تم سے برسرِ پیکار ہوں (ولو شاء اللہ لسلطھم علیکم فلقاتلوکم) لہٰذا ہمیشہ کامیابیوں پر اپنے خدا کو نہ بھولو اور کسی جہت بھی اپنی طاقت پر غرور نہ کرو۔ نیز کمزور لوگوں کو معاف کرنے کو اپنے نقصان میں نہ سمجھو۔ آیت کے آخر میں دوبارہ آخری گروہ کے لیے تاکید زیادہ واضح انداز میں کرتے ہوئے کہتا ہے: اگر وہ تم سے جنگ نہ کریں اور صلح و مصالحت کی پیش کش کریں تو خدا تمھیں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تمھارا فرض ہے کہ جو ہاتھ صلح کے لیے تمھاری طرف بڑھے اسے مضبوطی سے تھام لو (فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا)۔

Marfat.com

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن اس آیت میں اور چند دوسری آیات میں صلح کی پیشکش کو " القاء سلام " "صلح پھینکنا" قرار دیتا ہے۔ ممکن ہے یہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ طرفین نزاع، صلح سے پہلے عموماً ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں یہاں تک صلح کی پیشکش کو بھی بڑے محتاط ہو کر دیکھتے ہیں گویا ایک دوسرے سے فاصلہ پر رہتے ہوئے اس پیشکش کو ایک دوسرے کی طرف پھینکتے ہیں۔

٩١۔ سَتَجِدُونَ اٰخَرِينَ يُرِيدُونَ اَنْ يَّاْمَنُوكُمْ وَيَاْمَنُوا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوا فِيهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِينًا ○

ترجمہ

٩١۔ بہت جلد تم کچھ ایسے لوگوں سے ملو گے جو چاہتے ہیں کہ تمھاری طرف سے بھی امان میں ہوں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی مامون ہوں (یہ مشرک ہیں لہٰذا تمھارے سامنے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں) لیکن جس وقت وہ فتنہ (اور بت پرستی) کی طرف پلٹ جاتے ہیں تو وہ سر کے بل اس میں ڈوب جاتے ہیں اگر وہ تم سے الجھنے سے کنارہ کش نہ ہوئے اور انھوں نے صلح کی پیشکش نہ کی اور تم سے دستبردار نہ ہوئے تو انھیں جہاں کہیں پاؤ قید کر لو (یا) انھیں قتل کر دو اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر ہم نے تمھارا واضح تسلط قرار دیا ہے۔

شانِ نزول

درج بالا آیت کے لیے مختلف شانِ نزول منقول ہوئے ہیں زیادہ مشہور ان میں سے یہ ہے کہ اہل مکہ میں سے کچھ لوگ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دھوکے بازی اور چالبازی کے طور پر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا۔ لیکن جب بھی وہ قریش اور ان کے بتوں کے سامنے جاتے تو ان کے بتوں کی عبادت اور پرستش شروع کر دیتے۔ اس طرح وہ چاہتے تھے کہ وہ اسلام اور قریش دونوں سے محفوظ رہیں، دونوں طرف سے فائدہ اٹھائیں اور کسی سے انھیں نقصان نہ پہنچے اصطلاح کے مطابق دونوں گروہوں سے دوطرفہ تعلقات استوار رکھیں۔ اس پر زیر نظر آیت نازل ہوئی جس میں اس گروہ کے خلاف سخت کارروائی کا حکم دیا گیا۔

Marfat.com

تفسیر

طرفین سے ساز باز رکھنے والوں کی سزا

یہاں ایک اور گروہ سے تعارف ہوتا ہے جو سراسر اس گروہ کے مخالف ہے جس کے بارے میں گذشتہ آیات میں صلح کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان آزادی سے کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے دھوکے اور خیانت کی راہ اختیار کر رکھی ہے وہ دونوں گروہوں سے ہم قدم اور ہم فکر ہونے کا اظہار کرتے ہیں (ستجدون اخرین یریدون ان یأمنوکم و یأمنوا قومھم)۔اسی وجہ سے جب فتنہ سازی اور بُت پرستی کا موقع ان کے ہاتھ آتا ہے توان کے سارے پروگرام اُلٹے ہوجاتے ہیں اور سر کے بل بت پرستی میں ڈوب جاتے ہیں (کلما ردوا الی الفتنۃ ارکسوا فیھا)۔ یہ پہلے گروہ کے بالکل برعکس ہیں کیونکر ان کی کوشش یہ تھی کہ یہ مسلمانوں سے برسرپیکار نہ ہوں۔ جب کہ ان کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں سے الجھتے رہیں وہ صلح کی پیش کش کرتے تھے جبکہ یہ مسلمانوں سے برسرپیکار تھے وہ مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتے تھے لیکن یہ ظلم وجور سے اجتناب نہیں کرتے تھے۔ یہ تینوں فرق جن کی طرف (فان لم یعتزلوکم ویلقوا الیکم السلم و یکفوا ایدیھم) میں اشارہ ہوا ہے اس امر کا سبب ہیں کہ ان کے بارے میں حکم پچھلے گروہ سے مکمل طور پر مختلف حکم ہو مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ انھیں جہاں کہیں پائیں اسیر کرلیں اور مقابلہ کرنے کی صورت میں قتل کردیں (فخذوھم واقتلوھم حیث ثقفتموھم)لہٰذا جہاں ان کے لیے کافی اتمام حجت کیا گیا ہے وہاں آیت کے آخر میں یہ بھی فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں کہ ہم نے واضح طور پر ان پر تمھارا تسلط قائم کیا ہے۔ (واولئکم جعلنا لکم علیھم سلطانًا مبینًا)۔

زیر بحث آیت میں جس تسلط کی طرف اشارہ ہے ہوسکتا ہے یہ تسلط منطقی لحاظ سے ہو۔ کیونکہ مسلمانوں کی منطق مشرکین کی منطق پر غالب تھی یا یہ بھی ہوسکتا ہے ظاہری اور خارجی لحاظ سے ہو کیونکہ جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت مسلمان بہت حد تک طاقت ور ہوچکے تھے۔

درج بالا آیت میں "ثقفتموھم" کی تعبیر ممکن ہے ایک دقیق نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ یہ لفظ ثقافت کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے کسی چیز کا مشکل سے اور مہارت سے ہاتھ آنا اور "وجد تموھم" وجدان کے مادہ سے صرف ہاتھ آنے کے معنی میں ہے ان دونوں کا مفہوم مختلف ہے گویا منافقین کا یہ گروہ (جو دوغلہ ہے) دونوں سے تعلقات رکھتا ہے یہ منافقین کا خطرناک ترین گروہ ہے ممکن نہیں کہ انھیں آسانی سے پہچان لیا جائے اور وہ کسی جال میں پھنس جائے لہٰذا فرماتا ہے: اگر مہارت اور مشکل سے ان پر قبضہ کرلو تو انھیں خدا کا حکم سناؤ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ انھیں گرفتار کرنا کٹھن اور مشکل کام ہے۔

۹۲۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً

Marfat.com

فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ○

ترجمہ

۹۲- کسی صاحبِ ایمان فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی صاحبِ ایمان کو قتل کرے مگر یہ کہ یہ کام غلطی اور اشتباہ میں اس سے سرزد ہو جائے اور پھر جس نے کسی مومن کو غلطی سے قتل کیا ہے اسے چاہیے کہ وہ ایک غلام آزاد کرے اور خون بہا مقتول کے گھر والوں کو دے۔ مگر یہ کہ وہ خون بہا بخش دیں اور اگر مقتول ایسے گروہ سے ہے جو تمہارے دشمن ہیں (اور کافر ہیں) لیکن قاتل خود مومن تھا تو چاہیے (کہ صرف) ایک غلام آزاد کرے (اور خونبہا ادا کرنا ضروری نہیں ہے) اور اگر ایسے گروہ میں سے ہے جن کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہو چکا ہے تو چاہیے کہ اس کا خون بہا اس کے اہلِ خانہ کو دے اور ایک غلام (بھی) آزاد کرے اور جو شخص (غلام کے آزاد کرنے پر) دسترس نہیں رکھتا، وہ دو ماہ مسلسل روزے رکھے۔ یہ (ایک قسم کی تخفیف اور) اللہ کے حضور توبہ ہے اور خدا دانا و حکیم ہے۔

شانِ نزول

مکہ کے ایک بت پرست حارث بن یزید نے " ابوجہل " کی مدد سے ایک مسلمان " عیاش بن ابی ربیعہ " کو اسلام کی طرف مائل ہونے کی پاداش میں ایک عرصہ تک شکنجۂ ظلم میں جکڑے رکھا۔ مسلمانوں کی مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد " عیاش " نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی اور مسلمانوں میں شامل ہو گیا۔ اتفاقاً ایک دن مدینہ کے قریب ایک محلہ میں اس کا سامنا اسے آزار دینے والے حارث بن یزید سے ہو گیا۔ عیاش نے موقع غنیمت جان کر حارث کو قتل کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے ایک دشمن کو قتل کیا ہے حالانکہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ حارث توبہ کر کے مسلمان ہو چکا تھا اور پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہونے جا رہا تھا۔ یہ واقعہ آنحضرتؐ سے عرض کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس قتل کے بارے میں جو خطا سے اور اشتباہ میں ہو گیا

Marfat.com

حکم بیان کیا گیا۔

تفسیر

قتلِ اشتباہ کے احکام

چونکہ گذشتہ آیات میں مسلمانوں کو عملی طور پر اپنے اندرونی خطرناک دشمنوں (منافقین) کی سرکوبی کی اجازت دی گئی ہے تواب اس بنا پر کہ کہیں کچھ لوگ اس قانون سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنے ذاتی دشمنوں کو منافقین کہہ کر قتل نہ کردیں یا لاپرواہی سے کسی بے گناہ کا خون نہ بہادیں۔ اس آیت میں اور بعد والی آیت میں قتل اشتباہ اور قتل عمد کے احکام بیان ہوئے تاکہ قتل جو اسلام کے نزدیک نہایت سنگین معاملہ ہے اس کے بارے میں تمام لازمی پہلوؤں کو ملحوظ نظر رکھا جائے۔

اس آیت کی ابتدا میں کہ جس میں قتل اشتباہ کا ذکر ہے فرماتا ہے، کسی مومن کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی صاحب ایمان شخص کو قتل کرے مگر یہ کہ اشتباہ میں ایسا ہو جائے (وما کان لمؤمن ان یقتل مؤمنًا الا خطأً) حقیقت میں یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصولی طور پر کوئی مومن یہ نہیں چاہتا کہ اپنے ہاتھ کسی بے گناہ کے خون سے رنگین کرے، کیونکہ حریم ایمان میں تمام افراد ایک جسم کے اعضاء کی طرح ہیں کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بدن انسانی کا ایک عضو دوسرے عضو کو سوائے اشتباہ کے کاٹ دے یا اسے کوئی آزار دی جائے۔ اس سبب سے جو اس قسم کے کام میں مشغول ہیں ان کا ایمان صحیح نہیں ہے اور حقیقت میں وہ ایمان سے بے بہرہ ہیں۔ الا خطأً (مگر غلطی سے) کے الفاظ اس معنی میں نہیں کہ انھیں اجازت ہے کہ شک کی بنا پر قتل جیسا عمل کریں کیونکہ شک وشبہ میں انسان دور تک نہیں دیکھ سکتا اور کوئی شخص شک کی حالت میں اپنے اشتباہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ مقصد یہ ہے کہ مومنین شک وشبہ کی حالت کے علاوہ ایسا گناہ کبیرہ نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد قتل اشتباہ کا جرمانہ اور کفارہ تین مراحل میں بیان کیا گیا ہے:۔

پہلی صورت یہ ہے کہ "بے گناہ شخص جو شک اور شبہ میں قتل ہو گیا ہو، اگر وہ مسلمان خاندان سے تعلق رکھتا ہو تو اس صورت میں قاتل کے لیے دو حکم ہیں۔ ایک یہ کہ غلام کو آزاد کرے اور دوسرا یہ کہ مقتول کا خون بہا مقتول کے وارثوں کو ادا کرے (ومن قتل مؤمنًا خطأً فتحریر رقبة مؤمنة ودیة مسلمة الی اھلہ)۔

مگر یہ کہ مقتول کے وارث دیت کو اپنی رضا اور رغبت سے چھوڑ دیں (الا ان یصدقوا)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مقتول ایسے خاندان سے وابستہ ہو جو مسلمانوں سے دشمنی رکھتا ہو، تو اس صورت میں قتل اشتباہ کا کفارہ صرف غلام آزاد کرنا ہے اور ایسے گروہ کو دیت دینا ضروری نہیں کہ جو مالی طور پر مسلمانوں کے خلاف مضبوط ہو جائے۔ اس کے علاوہ اسلام ایسے شخص کو اپنے خاندان سے ربط رکھنے سے منع کرتا ہے جس کے خاندان میں سب کے سب اسلام کے دشمن ہوں اس بنا پر یہ نقصان کی تلافی کا مقام نہیں ہے (فان کان من قوم عدو لکم وھو مؤمن فتحریر رقبة مؤمنة)۔

Marfat.com

تیسری صورت یہ ہے کہ مقتول کا خاندان ایسے کفار میں سے ہو جنھوں نے مسلمانوں سے معاہدہ کر رکھا ہو۔ اس صورت میں معاہدہ کے احترام میں ایک غلام آزاد کرنے کے علاوہ مسلمان اس کا خون بہا اس کے پس ماندگان کو دیں (وان کان من قوم بینکم و بینھم میثاق فدیۃ مسلمۃ الی اھلہ و تحریر رقبۃ مؤمنۃ)۔

اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ کیا مقتول اس صورت میں پہلی دونوں صورتوں کی طرح مرد مومن ہوگا یا یہ حکم کافر اور ذمی کے لیے بھی ہے لیکن بظاہر آیات اور روایات جو اس آیت کی تفسیر میں آئی ہیں ان کے مطابق اس سے مراد بھی "مقتول مومن" ہی ہے اور کیا اس قسم کے مسلمان مقتول کی دیت کافر وارث کو دی جاسکتی ہے جبکہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا۔ آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ دیت اس کے ورثہ کو دی جائے گی چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں یہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے معاہدے کی بنیاد پر ہے۔ لیکن چونکہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا لہٰذا بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ اوپر والے جملے سے مراد یہ ہے کہ اس کی دیت و خون بہا صرف اس کے مسلمان وارثوں کو دیا جائے نہ کہ کفار وارثوں کو۔ بعض روایات میں بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن من قوم بینکم و بینھم میثاق (ایسے گروہ سے جو تمھارے ساتھ معاہدہ رکھتے ہیں) کے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے وارث مسلمان نہ ہوں، کیونکہ مسلمان ایک دوسرے سے معاہدہ نہیں کرتے (غور کیجیے گا)۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کے بارے میں جو غلام آزاد کرنے کے بارے میں دسترس نہیں رکھتے (یعنی مالی طور پر استطاعت نہیں رکھتے یا آزاد کرنے کے لیے غلام ملتا ہی نہ ہو موجودہ زمانے کی طرح۔ فرماتا ہے ایسے افراد کو چاہیے کہ وہ مسلسل دو ماہ روزے رکھے (فمن لم یجد فصیام شھرین متتابعین) آخر میں کہتا ہے: یہ غلام آزاد کرنے کی بجائے دو ماہ روزہ رکھنے کا حکم ایک قسم کی تخفیف اور خدا کے حضور توبہ ہے یا یہ کہ جو کچھ قتل اشتباہ کے کفارہ کے طور پر کہا گیا ہے اس سب کو خدا سے توبہ قرار دیا گیا ہے اور خدا ہمیشہ ہر چیز سے باخبر ہے اور اس کے تمام احکام حکمت کے مطابق ہیں (توبۃ من اللہ و کان اللہ علیما حکیما)۔

چند اہم نکات

خسارے کی تلافی کے لیے احکام

۱۔ یہاں قتل اشتباہ کی تلافی کے لیے تین موضوع بیان کیے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک، ایک طرح سے خسارے اور نقصان کی تلافی ہے جو اس عمل کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پہلا غلام آزاد کرنا ہے اصل میں ایک اجتماعی خسارے (ایک اہل ایمان کا قتل) کی تلافی ہے دوسرا دیت کا ادا کرنا ہے جو اصل میں ایک طرح سے اقتصادی خسارے کی تلافی ہے جو کہ ایک شخص کے قتل ہونے سے ایک خاندان کو ہوتا ہے ورنہ پہلے بھی ہم کہہ چکے ہیں کہ دیت (خون بہا) کبھی بھی ایک انسان کے خون کی حقیقی قیمت نہیں ہوسکتی کیونکہ ایک بے گناہ انسان کا خون ہر طرح سے زیادہ قیمتی ہے بلکہ خاندان کے اقتصادی خسارے کی ایک طرح سے تلافی ہے۔ اور تیسرا دو ماہ مسلسل روزے رکھنے کا مسئلہ ہے جو کہ اخلاقی اور روحانی خسارے کی تلافی ہے، جو غلطی سے قتل کرنے والے کو کرنا

Marfat.com

ہوتی ہے ۔ البتہ خیال رکھنا چاہیے کہ مسلسل دو ماہ روزے رکھنا ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو ایک باایمان غلام کو آزاد کرنے کی سکت نہیں رکھتے ۔ یعنی پہلے درجے میں صرف ایک غلام آزاد کرنا کافی ہے اور دوسرے درجے میں اگر ایسا غلام آزاد نہیں کر سکتے تو روزے رکھنا ہوں گے لیکن غور کرنا چاہیے کہ غلام آزاد کرنا ایک طرح کی عبادت شمار ہوتا ہے لہٰذا اس عبادت کا اثر آزاد کرنے والے کی روح پر ضرور ہوگا ۔

۲۔ مسلمانوں میں دیت سے صرف نظر

جس مقام پر مقتول کے پس ماندگان مسلمان ہوں وہاں " الا ان یصد قوا " (مگر یہ کہ وہ دیت سے صرف نظر کرلیں) کا ذکر آیا ہے لیکن جس مقام پر وہ مسلمان نہ ہوں وہاں یہ بات نہیں ۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ پہلے موقع پر اس کام کی کوئی بنیاد ہے لیکن دوسری جگہ اس قسم کی بنیاد نہیں ہے اس کے علاوہ جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کو ایسے مواقع پر غیر مسلموں کے احسان کا زیر بار نہیں ہونا چاہیے ۔

۳۔ غیر مسلموں کے لیے دیت کا پہلے تذکرہ

قابل توجہ امر یہ ہے کہ پہلی صورت میں جبکہ پس ماندگان مسلمان ہوں پہلے " ایک غلام آزاد کرے " اور پھر " دیت " کا ذکر ہے ۔ جبکہ تیسری صورت میں جبکہ وہ مسلمان نہیں ہیں پہلے دیت کا تذکرہ ہے شاید تعبیر کا یہ اختلاف اس طرف اشارہ کرتا ہو کہ مسلمانوں کے معاملے میں دیت کی تاثیر کا زیادہ تر منفی ردِ عمل نہیں ہوتا ۔ جبکہ غیر مسلموں کے معاملے میں ہر چیز سے پہلے دیت ادا ہونا چاہیے تاکہ نزاع اور جھگڑے کی آگ ٹھنڈی ہو سکے اور دشمن اسے معاہدے کی خلاف ورزی پر محمول نہ کریں ۔

۴۔ اسلامی پیمانوں کی طبعی بنیاد

آیت میں دیت کی مقدار نہیں بتائی گئی اور اس کی تفصیل سُنّت کے مطابق مقرر ہوتی ہے ۔ جس کی رُو سے پوری دیت ہزار مثقال سونا یا ایک سو اونٹ ، یا دو سو گائیں ، اور اگر وارث راضی ہوں تو ان جانوروں کی قیمت ہے (البتہ سونے یا بعض جانوروں کا دیت کے طور پر تعین اسلامی اصول کے مطابق ہے اور اسلام نے اپنے پیمانے اور میزان طبعی امور میں سے مقرر کیے ہیں نہ کہ بناوٹی ، مصنوعی اور وقتی طریقوں سے جو کہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں ۔

۵۔ غلطی کی سزا ؟

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ یہ اعتراض کریں کہ " غلطی " کی سزا نہیں ہوتی ، تو اسلام اس کو اتنی اہمیت کیوں دیتا ہے ۔ حالانکہ اس غلطی کا مرتکب کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا ۔ اس کا جواب واضح ہے کیونکہ خون کا مسئلہ کوئی معمولی نہیں ہوتا ۔ لہٰذا اسلام اس سخت حکم کے ذریعے چاہتا ہے کہ لوگ نہایت محتاط رہیں تاکہ کسی قسم کا قتل یہاں تک کہ اشتباہ اور غلطی سے بھی ان سے سرزد

Marfat.com

نہ ہو ۔ کیونکہ بہت سی غلطیاں بھی قابلِ گرفت ہیں علاوہ ازیں اس لیے بھی کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ قتل اشتباہ کے دعویٰ سے اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں سمجھا جا سکتا آیت کا آخری جملہ (توبۃ من اللہ) ممکن ہے اسی امر کی طرف اشارہ ہو کہ عام طور پر اشتباہات کا مرکز پوری کوشش اور غور نہ کرنا ہوتا ہے لہٰذا اہم معاملات میں (مثلاً قتل نفس) کے سلسلے میں اس طرح سے تلافی ہونا چاہیے کہ خدا سے توبہ ان کے مرتکب ہونے والوں کے شامل حال ہو جائے ۔

۹۳۔ وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيمًا ○

ترجمہ

۹۳۔ اور جو شخص کسی صاحبِ ایمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے کہ جس میں وہ ہمیشہ کے لیے رہے گا اور خدا اس پر غضب نازل کرتا ہے اور اسے اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے اور اس کے لیے اس نے عذابِ عظیم مہیا کر رکھا ہے ۔

شانِ نزول

مقیس بن صبابہ کنانی ایک مسلمان تھا اس نے اپنے مقتول بھائی کی لاش محلہ " بنی نجار " میں دیکھی ۔ اس نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آکر یہ واقعہ بیان کیا رسولِ اکرمؐ نے اسے قیس بن ہلال مہری کے ساتھ بنی نجار کے سرداروں کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ اگر وہ ہشام کے قاتل کو پہچانتے ہیں تو اسے اس کے بھائی مقیس کے حوالے کر دیں اور اگر نہیں پہچانتے تو اس کا خون بہا اور دیت ادا کر دیں وہ چونکہ ہشام کے قاتل کو نہیں پہچانتے تھے لہٰذا انھوں نے مقتول کی دیت اسے ادا کر دی اور اس نے بھی قبول کر لی اور قیس بن ہلال کی معیت میں مدینہ کی طرف روانہ ہوا ۔

اثنائے راہ میں زمانہ جاہلیت کے باقی رہنے والے افکار نے مقیس کے جذبات کو ابھارا اور وہ اپنے آپ سے کہنے لگا کہ دیت قبول کرنا شکست اور ذلت کا باعث ہے لہٰذا اپنے ہم سفر کو جو قبیلہ بنی نجار میں سے تھا اپنے بھائی کے خون کے بدلے قتل کر دیا اور مکہ کی طرف بھاگ گیا اور اسلام سے بھی کنارہ کش ہو گیا ۔ پیغمبر اکرمؐ نے بھی اس خیانت کے بدلے اس کا خون مباح قرار دیا اور اوپر والی آیت اسی مناسبت سے نازل ہوئی جس میں قتل عمد (جان بوجھ کر قتل) کی سزا بیان ہوئی ہے ۔

Marfat.com

تفسیر

قتل عمد کی سزا

قتل اشتباہ کی سزا بیان کرنے کے بعد اس آیت میں اس شخص کی سزا بیان ہوئی ہے جو جان بوجھ کر کسی باایمان شخص کو قتل کردے۔ چونکہ انسان کشی ایک بہت بڑا جرم اور گناہِ کبیرہ ہے اور اگر اسے روکا نہ جائے اور اس کا مقابلہ نہ کیا جائے تو امن و امان جو ایک صحیح معاشرے کی اہم ترین شرائط میں سے ہے بالکل ختم ہوجائے گا۔ قرآن نے مختلف آیات میں اسے اہمیت دی ہے یہاں تک کہ ایک انسان کا قتل روئے زمین کے تمام لوگوں کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے:

من قتل نفسًا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعًا

جو شخص کسی نفس کو (اگر وہ قاتل نہ ہو یا زمین پر فساد نہ پھیلائے) قتل کردے گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کردیا ہے۔ (مائدہ - ۳۲)

اسی لیے زیر بحث آیت میں ان لوگوں کے لیے جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کردیں۔ چار سزائیں اور آخرت کے شدید عذاب کا (علاوہ قصاص کے جو دنیاوی سزا ہے) ذکر ہوا ہے۔

۱ خلود یعنی ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا (ومن یقتل مومنًا متعمدًا فجزاءہ جھنم خالدًا فیھا)۔

۲ خشم و غضب الٰہی (وغضب الله علیہ)۔

۳ رحمتِ خداوندی سے محرومی (ولعنہ)۔

۴ عذاب عظیم میں مبتلا کیا جانا (واعدلہ عذابًا عظیمًا)۔

اس طرح قتل عمد کے لیے اس قدر سخت ترین سزا کا ذکر ہوا ہے جس قدر سخت سزا قرآن میں کسی اور چیز کے متعلق بیان نہیں ہوئی اس کے علاوہ قتل عمد کی دنیاوی سزا وہی قصاص ہے جس کی تفصیل جلد اول میں سورۂ بقرہ آیت ۱۷۹ کے ذیل میں بیان ہوچکی ہے۔

کیا انسانی قتل ابدی سزا کا موجب ہے

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ "خلود" یعنی ہمیشہ کے لیے سزا تو ان لوگوں کو ملے گی جو ایمان لائے بغیر دنیا سے رخصت ہوجائیں جبکہ قتل عمد کرنے والوں کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہوں اور یہاں تک امکان ہے کہ وہ پشیمان ہوکر اس گناہِ عظیم سے (جو ان سے سرزد ہوچکا ہے) حقیقی توبہ کرلیں اور گذشتہ گناہ کی جس قدر ممکن ہو تلافی کرلیں۔

۱۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آیت میں مومن کے قتل سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو ایمان لانے کی وجہ سے قتل کرے یا اس کے قتل کو جائز اور مباح قرار دے۔ جان لینا چاہیے کہ اس طرح کا قتل، قاتل کے کفر کا ثبوت ہے اور اس کا لازمہ ابدی اور

Marfat.com

ہمیشہ کا عذاب ہے۔

اسی مفہوم کی ایک حدیث بھی حضرت امام صادق ؑ سے منقول ہے[1]

۲۔ یہ احتمال بھی ہے کہ صاحب ایمان اور بے گناہ افراد کو قتل کرنے کی وجہ سے انسان بے ایمان ہو کر دنیا سے رُخصت ہو اور اسے توبہ کی بھی توفیق نصیب نہ ہو اور اسی وجہ سے وہ ابدی اور ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہو جائے۔

۳۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلود سے مراد اس آیت میں بہت طویل عذاب ہو نہ کہ ہمیشہ کا عذاب۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اصولی طور پر کیا قتل عمد قابل توبہ ہے؟ بعض مفسرین اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قتل عمد درج بالا آیت کے مطابق بنیادی طور پر قابل توبہ نہیں ہے اور چند ایک روایات میں بھی جو آیت کے ذیل میں آئی ہیں اس معنی کی طرف اشارہ موجود ہے کہ "لاتوبۃ لہ" (اس کی کوئی توبہ نہیں) لیکن تعلیمات اسلام کی روح اور عظیم ہادیانِ حق کی روایات اور توبہ کے فلسفہ (جو تربیت کی بنیاد اور آیندہ کی زندگی میں گناہ سے محفوظ رہنا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گناہ ایسا نہیں جو قابلِ توبہ نہ ہو۔ اگرچہ کچھ گناہوں سے توبہ کی بہت سخت اور سنگین شرائط ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے:

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذٰلک لمن یشاء (نساء: ۴۸)

خدا صرف شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا لیکن اس کے علاوہ جس کے لیے چاہتا اور مصلحت سمجھتا ہے، اسے بخش دیتا ہے۔

یہاں تک کہ اس آیت کے ذیل میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ آیت شفاعت اور گناہوں سے بخشش کے متعلق ہے ورنہ تو شرک کا گناہ بھی توبہ کرنے اور توحید و اسلام کی طرف پلٹ آنے سے قابلِ بخشش ہے جیسا کہ صدر اسلام کے اکثر مسلمان ابتدا میں مشرک تھے اور پھر انھوں نے توبہ کی اور خدا نے ان کے گناہ کو بخش دیا۔ اس وجہ سے صرف شرک ایسا گناہ ہے کہ جو توبہ کیے بغیر بخشا نہیں جا سکتا۔ لیکن توبہ کرنے سے تمام گناہ یہاں تک کہ شرک بھی قابلِ بخشش ہے جیسا کہ سورہ زمر کی آیہ ۵۳ اور ۵۴ میں ہے:

ان اللہ یغفر الذنوب جمیعًا انہ ھو الغفور الرحیم و انیبوا الی ربکم واسلموا لہ

خدا تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے کیونکہ وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ خدا کی طرف پلٹ آؤ اور توبہ کرو اور اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر لو۔

بعض مفسرین نے جو یہ کہا ہے کہ توبہ کے سایہ میں تمام گناہوں کی بخشش سے متعلق آیات، اصطلاح کے مطابق جو آیات عام تخصیص کے زمرے میں آتی ہیں صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان آیات کی زبان جو کہ گناہ گاروں کو جہاں منامی کرتی ہیں اور مختلف تاکیدات

---

[1] کافی تفسیر عیاشی میں اس آیت کے ذیل میں امام صادق سے اس طرح منقول ہے کہ آپ نے فرمایا من قتل مومنا علی دینہ فذلک المتعمد الذی قال اللہ تعالیٰ عز وجل فی کتابہ واعد لہ عذابا عظیما

Marfat.com

کے ساتھ ہیں، قابل تخصیص نہیں ہے اور اصلاح کے مطابق تخصیص سے انکار کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اگر واقعاً وہ شخص جس سے قتلِ عمد سرزد ہوا ہے مکمل طور پر ہمیشہ کے لیے خدا کی بخشش سے مایوس ہو جائے (یہاں تک کہ اپنے بُرے عمل کی بار بار معافی مانگے اور بہت سے نیک اعمال سے برائی کی تلافی بھی کرے) پھر بھی ہمیشہ کی لعنت اور عذاب میں مبتلا رہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی باقی ماندہ عمر میں خدا کی عبادت زیادہ کرے، بُرے اعمال سے توبہ کرے اور یہاں تک کہ انسانوں کے بار بار قتل سے توبہ کرے۔ یہ امر جو تعلیمات انبیاء کی روح کے منافی ہے کیونکہ وہ تو نوعِ بشر کی ہر مرحلہ میں تربیت کے لیے آئے ہیں تاریخ اسلام میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے خطرناک قسم کے گناہ گاروں مثلاً حمزہ بن عبدالمطلب کے وحشی قاتل تک کو معاف کر دیا اور اس کی توبہ قبول کر لی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شرک اور ایمان کی مختلف حالتوں میں قتل اتنا مختلف سمجھا جائے کہ ایک حالت میں تو بخشا جائے اور دوسری حالت میں قابل بخشش نہ ہو۔ اصولی طور پر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم کسی گناہ کو شرک سے بڑھ کر نہیں سمجھتے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ گناہ بھی توبہ اور قبول اسلام سے بخشا جا سکتا ہے۔ اب ہم کس طرح باور کر سکتے ہیں کہ قتل کا گناہ حقیقی توبہ کے ذریعے بھی قابلِ بخشش نہ ہو۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے اس سے کوئی اشتباہ نہ ہو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ قتلِ عمد معمولی اور کم اہمیت کا حامل ہے یا اس سے توبہ بہت آسان ہے بلکہ اس کے برعکس اس گناہ سے حقیقی توبہ بہت ہی مشکل ہے اور یہ اس عمل کی تلافی کی محتاج ہے اور یہ تلافی کوئی آسان کام نہیں ہے[1]

قتل کی اقسام

فقہی کتب میں فقہا نے قصاص و دیت کے باب میں اسلامی روایات سے استفادہ کرتے ہوئے قتل کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ "قتل عمد"۔ "قتل شبیہ عمد" "اور قتل اشتباہ"۔

قتل عمد

یہ قتل وہ ہوتا ہے جس میں پہلے سے پختہ ارادہ اور ذرائع قتل کو بروئے کار لایا جاتا ہے (مثلاً کوئی شخص کسی کو قتل کرنے کے ارادہ سے کسی ہتھیار، لکڑی، پتھر یا ہاتھ سے کام لے)۔

---

[1] روایات میں بے گناہ صاحب ایمان افراد کے قتل کی اہمیت کے بارے میں ایسی تعبیرات بیان ہوئی ہیں جو انسان کو جھنجھوڑ دیتی ہیں ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"لزوال الدنيا اهون على الله من قتل امرء مسلم"،

"دنیا کا زوال اور ختم ہو جانا خدا کے ہاں ایک مرد مسلمان کے قتل ہونے سے کمتر ہے" نیز فرماتے ہیں:

"لو ان رجلا قتل بالمشرق و آخر رضی بالمغرب لا شرك فى دمه"

"اگر ایک شخص مشرق میں قتل ہو جائے اور دوسرا مغرب میں ہو اور اس پر راضی ہو تو وہ اس کے خون میں شریک ہے" (المنارج ۵ ص ۳۶۱)

Marfat.com

قتل شبیہ عمد

یہ وہ قتل ہے جس میں قتل کا ارادہ نہ ہو لیکن مقتول کے خلاف ایسے اقدام کیے جائیں کہ بے خبری میں نوبت اس کے قتل تک پہنچ جائے۔ مثلاً کسی کو قتل کے ارادہ سے مارا پیٹا نہ جائے مگر یہ مار پیٹ اتفاقاً اس کے قتل کا سبب بن جائے۔

قتل اشتباہ

یہ وہ قتل ہے جس میں قتل کا ارادہ شامل ہو نہ مقتول کے خلاف کوئی اقدام کرنے کا ارادہ ہو بلکہ یہ ایسا قتل ہے جیسے ارادہ کسی جانور کو شکار کرنے کا ہو مگر غلطی سے تیر کسی انسان کو جا لگے اور وہ قتل ہو جائے۔

ان میں سے ہر قسم کے تفصیلی احکام ہیں جو کتب فقہ میں موجود ہیں۔

۹۴۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۚ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ○

ترجمہ

۹۴۔ اے ایمان لانے والو! جس وقت تم راہ خدا میں قدم اٹھاتے ہو (اور جہاد کے لیے آمادۂ سفر ہوتے ہو) تو تحقیق کرو اور اس شخص کو جو صلح اور اسلام کا اظہار کرتا ہے اسے فقط اس بنا پر) یہ نہ کہو کہ تو مسلمان (مومن) نہیں کہ دنیائے ناپائیدار کا سرمایہ (اور مال غنیمت) حاصل کر سکو۔ کیونکہ خدا کے ہاں (تمھارے لیے) بڑی بڑی غنیمتیں (موجود) ہیں تم پہلے ایسے ہی تھے اور خدا نے تم پر احسان کیا (اور تمھاری ہدایت کی) اس بنا پر (اس عظیم شکرانے کے طور پر) تحقیق کرو، جو کچھ تم عمل کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

درج بالا آیت کے بارے میں کئی ایک شان نزول اسلامی روایات اور تفاسیر میں آئی ہیں جو کم و بیش ایک دوسرے

Marfat.com

سے مماثلت رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جنگِ خیبر سے واپسی کے بعد اسامہ بن زید کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان یہودیوں کی طرف بھیجا جو فدک کی ایک بستی میں رہتے تھے تاکہ انھیں اسلام یا شرائط ذمہ قبول کرنے کی دعوت دی جائے۔ ایک یہودی مرداس جسے لشکر اسلام کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے مال اور اولاد کے ساتھ ایک پہاڑ کے دامن میں پناہ لی۔ پھر خود مسلمانوں کے استقبال کے لیے دوڑ آیا۔ اسامہ بن زید نے سوچا کہ یہ یہودی جان اور مال کے خوف سے قبول اسلام کر رہا ہے اور دلی طور پر مسلمان نہیں اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کا مال اسباب (بھیڑ بکریوں) پر بطورِ غنیمت قبضہ کر لیا۔ جب یہ خبر پیغمبر کو ملی تو آپؐ اس واقعہ پر نہایت برہم اور رنجیدہ ہوئے اور فرمایا تو نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا اسامہ پریشان ہو کر کہنے لگا اس شخص نے جان و مال کی حفاظت کے لیے قبول اسلام کیا تھا پیغمبرؐ نے کہا تم اس کے باطن سے آگاہ نہیں تھے تمھیں کیا معلوم شاید وہ حقیقی طور پر مسلمان ہوا ہو تو اس موقع پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ جنگی غنائم کی وجہ سے کبھی ایسے لوگوں کو مت جھٹلاؤ جو قبولِ اسلام کرتے ہیں بلکہ جو شخص بھی قبولِ اسلام کرے اس کی بات کو مان لینا چاہیے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بے گناہ افراد کی جان کی حفاظت کے سلسلہ میں ضروری تاکیدات ہو چکیں اب اس آیت میں ان بے گناہ افراد کی جان کی حفاظت کے لیے ایک احتیاطی حکم جو ممکن ہے تہمت کی زد میں آجائیں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے ایمان لانے والو! جس وقت جہاد کی راہ میں قدم اٹھاؤ تو تحقیق اور جستجو کر لو اور ایسے لوگوں کو جو قبولِ اسلام کریں نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو (یا ایہا الذین اٰمنوا اذا ضربتم فی سبیل اللہ فتبینوا و لا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مؤمنًا)۔

اور حکم دیتا ہے کہ جو لوگ ایمان کا اقرار کرتے ہیں انھیں خندہ پیشانی سے قبول کرو اور ان کے قبولِ اسلام کے بارے میں ہر قسم کی بدگمانی اور سوءِ ظن سے صرف نظر کرو اس کے بعد مزید کہتا ہے: کہیں ایسا نہ ہو کہ جہانِ ناپائیدار کی ان نعمتوں کے لیے قبول اسلام کرنے والوں کو تہمت دو اور انھیں ایک دشمن سمجھ کر قتل کر دو اور ان کا مال و اسباب بطور غنیمت لے لو (تبتغون عرض الحیوۃ الدنیا)[1] جبکہ ہمیشہ رہنے والی گراں بہا غنیمتیں تو خدا کے پاس ہیں (فعند اللہ مغانم کثیرۃ) اگرچہ پہلے تم ایسے ہی تھے اور زمانۂ جاہلیت میں تمھاری جنگیں غارت گری کی بنا پر ہوتی تھیں (کذلک کنتم من قبل)[2] لیکن اب

---

[1] "عرض" (بر وزن مرض) کا معنی ہے ایسی چیز جو ثبات اور پائیداری نہ رکھتی ہو۔ اس بنا پر عرض الحیوۃ الدنیا کا معنی ہے دنیاوی زندگی کا سرمایہ جو بغیر استثناء کے سب ناپائیدار ہے۔

[2] اس جملہ کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم خود بھی اسلام لانے کی ابتدا میں یہی کیفیت رکھتے تھے یعنی زبان سے اسلام کی حقانیت کی گواہی دیتے تھے اور وہ تم سے قبول کر لی گئی جبکہ تمھارے دل میں چھپی ہوئی بات کسی پر واضح نہیں تھی۔

Marfat.com

اسلام کے سایے میں اور اس احسان کی وجہ سے جو خدا نے تم پر کیا ہے، اس کیفیت سے نجات پا چکے ہو اس بنا پر اس عظیم نعمت کے شکرانے کے طور پر تمھارے لیے لازم ہے کہ تمام امور میں تحقیق کرو (فمن اللہ علیکم فتبینوا) اور یہ بات جان لو کہ خدا تمھارے اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے (ان اللہ کان بما تعملون خبیرًا)۔

اسلامی جہاد مادی پہلو نہیں رکھتا

درج بالا آیت میں بڑے واضح طور پر یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کسی مسلمان کو نہیں چاہیے کہ وہ مادی مفاد حاصل کرنے کے لیے میدانِ جہاد میں قدم رکھے اس لیے اسے کہا گیا ہے کہ دشمن کی طرف سے پہلی مرتبہ ہی اظہار ایمان کو مان لے اور اس کی صلح کی پیش رفت کا جواب دے، چاہے کتنی ہی مادی نعمتوں سے محروم ہونا پڑے۔ کیونکہ اسلامی جہاد کا مقصد توسیع پسندی اور مال غنیمت جمع کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد اور ہدف نوعِ انسانی کو انسانوں کی غلامی اور زور و زر کے خداؤں کی بندگی سے نجات دلانا ہے اور جس وقت امید کی یہ راہ نظر آئے تو فوراً اپنا لینی چاہیے مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے، تم بھی ایک دن اسی طرح کے پست افکار رکھتے تھے اور مادی فوائد کے لیے لوگوں کا خون بہاتے تھے لیکن آج وہ صورتِ حال بالکل بدل چکی ہے۔

علاوہ ازیں تم خود دائرہ اسلام میں داخل ہوتے وقت سوائے اظہار ایمان کے کیا کرتے تھے اس قانون سے دوسروں کے بارے میں کیوں اجتناب کرتے ہو جس سے تم خود مستفید ہوتے رہے ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس آیت کے مضمون پر توجہ کرتے ہوئے ہو سکتا ہے یہ اعتراض پیدا ہو کہ اسلام لوگوں کو اس دین سے وابستہ ہونے کے ظاہری دعووں کو قبول کر کے اسلامی ماحول میں "منافقین" کے داخل ہونے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس لائحہ عمل سے ممکن ہے بہت سے لوگ غلط فائدہ اٹھائیں اور اسلام کی آڑ میں جاسوسی اور غیر اسلامی اعمال و افعال کے مرتکب ہوں۔

شاید دنیا میں کوئی ایسا قانون نہ ہو جس میں غلط فائدہ اٹھانے والوں کے لیے گنجائش نہ ہو۔ اہم بات یہ ہے کہ قانون کو واضح مصلحتوں کا حامل ہونا چاہیے اب اگر اس بنا پر کہا جائے کہ قبولِ اسلام کرنے والے کی جب تک دلی کیفیت کا پتہ نہ لگا لیا جائے اس کے دعوے کو قبول نہ کیا جائے تو اس سے بہت سے مفاسد پیدا ہو جائیں گے جن کا نقصان کہیں زیادہ ہے اور انسانی فطرت و عواطف کے اصول نیست و نابود ہو جائیں گے کیونکہ جو شخص کسی دوسرے سے کوئی گلہ اور شکایت، کینہ اور حسد رکھتا ہو، وہ اسے تہمت لگا سکتا ہے کہ اس کا اسلام دکھاوے کا ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں سے ہم آہنگ نہیں اس طرح بہت سے بے گناہ قتل کر دیے جائیں گے اس کے علاوہ ہر دین اور مذہب کی طرف مائل اور راغب ہونے کی ابتدا میں ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو بھول پن میں، رکھ رکھاؤ کے لیے اور ظاہری طور پر مائل ہوتے ہیں لیکن وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اور اس دین سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے ایمان محکم اور مضبوط ہو جاتے ہیں اور ایمان کی جڑیں ان کے دلوں میں راسخ ہو جاتی ہیں اس وجہ سے ایسے لوگوں کو دھتکارا نہیں جا سکتا۔

Marfat.com

۹۵- لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ
اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۝
۹۶- دَرَجَاتٍ مِنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

ترجمہ

۹۵- وہ صاحبِ ایمان جو بغیر بیماری اور تکلیف کے جہاد سے دستبردار ہوگئے اور وہ مجاہد جنھوں نے اپنے مال اور جان کے ذریعے جہاد میں حصہ لیا برابر نہیں ہیں۔ خدا نے ان مجاہدین کو جنھوں نے اپنی جان اور مال سے جہاد کیا ہے بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت اور برتری دی ہے ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کو (ان کے نیک اعمال پر) خدا نیک جزا کا وعدہ کرتا ہے اور مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت اور اجرِ عظیم بخشتا ہے۔

۹۶- خدا کی طرف سے (اہم) درجات اور بخشش و رحمت (انھیں نصیب ہوگی) اور (اگر ان سے کچھ لغزشیں ہوئی ہیں) تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں جہاد کے متعلق گفتگو ہوئی تھی یہ دو آیات مجاہدین اور غیر مجاہدین کا تقابل اور موازنہ کرتی ہیں۔ خدا کہتا ہے: وہ باایمان کہ جو میدان جہاد میں شرکت کرنے سے اجتناب کرتے ہیں جبکہ انھیں ایسی کوئی خاص بیماری بھی لاحق نہیں کہ جو انھیں میدانِ جہاد میں شرکت کرنے سے مانع ہو کبھی ان مجاہدین کے ہم پلہ اور برابر نہیں ہوسکتے جو راہِ خدا میں اور اعلائے کلمہ حق کے لیے اپنی جان و مال سے جہاد کرتے ہیں (لا يستوي القاعدون من المؤمنين غير اولي الضرر والمجاهدون في سبيل الله باموالهم وانفسهم)۔

واضح ہے کہ "قاعدون" سے مراد یہاں وہ افراد ہیں جنھوں نے اصولِ ایمان پر ایمان رکھنے کے باوجود ہمت اور جوانمردی نہ دکھانے کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہیں کی۔ اگرچہ ان کے لیے یہ جہاد واجب عینی نہیں تھا کیونکہ اگر ان کے لیے واجب ہوتا تو قرآن ان کے بارے میں ایسے نرم اور ملائم لہجے میں بات نہ کرتا اور آیت کے آخر میں ان سے بدلے اور جزا کا وعدہ نہ کرتا اس

Marfat.com

وجہ سے جب یہ صورتحال ہو کہ جہاد واجب عینی نہ ہو" مجاہدین" "قاعدین" کے مقابلے میں واضح طور پر برتر ہیں بہر حال اس آیت میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو نفاق یا دشمنی کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہوئے۔

ضمنی طور پر یہ خیال رکھنا چاہیے کہ "غیر اولی الضرر" کی تعبیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے، جو ان تمام افراد کو (جہاد سے) مستثنیٰ قرار دیتی ہے جو کسی عضو کے نقص، بیماری یا بہت زیادہ کمزوری اور ضعف وغیرہ کے سبب جہاد میں شرکت کی سکت نہیں رکھتے اس کے بعد پھر مجاہدین کی برتری اور فضیلت کو صراحت اور فصاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

خدا ان مجاہدین کو جو اپنے جان و مال سے اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، ان لوگوں پر عظیم فضیلت بخشتا ہے جو میدان جہاد میں شرکت سے اجتناب اور کنارہ کشی کرتے ہیں (فضل اللہ المجاھدین باموالھم وانفسھم علی القاعدین درجۃ)۔[1]

لیکن باوجود اس کے جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ مجاہدین کے گروہ کے مدمقابل وہ افراد ہیں جن پر جہاد "واجب عینی" نہیں تھا۔ یا وہ بیماری، ناتوانی یا دیگر علل کی وجوہ سے میدان جہاد میں شرکت کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا اس وجہ سے کہ ان کی صالح نیت ایمان اور نیک اعمال نظر انداز نہ ہوں انھیں بھی خوشخبری دیتے ہوئے فرماتا ہے: دونوں گروہوں (مجاہدین وغیر مجاہدین) سے اچھائی کا وعدہ کیا گیا ہے (وکلا وعد اللہ الحسنی) لیکن واضح ہے کہ وہ اچھائی جس کا وعدہ دونوں سے کیا گیا ہے اس میں بہت زیادہ فرق ہے حقیقت میں قرآن اس بیان کے ذریعے نشاندہی کرتا ہے کہ ہر نیک کام کا حصہ اپنی جگہ پر محفوظ ہے اور بھولنے والا نہیں خصوصاً جبکہ بحث جہاد سے کنارہ کش ہونے والے ایسے افراد کے متعلق ہے جو جہاد میں شرکت کرنا چاہتے ہیں اور اسے ایک بہت بڑی سعادت اور مقصد سمجھتے تھے لیکن چونکہ یہ واجب عینی نہ تھا اس بنا پر وہ ایک بڑی سعادت سے محروم رہ گئے اس کے باوجود وہ جتنا لگاؤ اس کام (جہاد) سے رکھتے ہیں اس قدر جزا پائیں گے اسی طرح "اولی الضرر" افراد بھی جو بیماری یا کسی عضو کے ناقص ہونے کی وجہ سے میدان جہاد میں شریک نہیں ہوئے، مکمل طور پر اس سے لگاؤ رکھتے تھے وہ بھی مجاہدین کی جزا اور بدلے میں سے قابل ذکر حصہ پائیں گے۔

جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپؐ نے لشکر اسلام سے فرمایا:

لقد خلفتم فی المدینۃ اقواما ما سرتم مسیرا ولا قطعتم وادیا الا کانوا معکم وھم الذین صحت نیاتھم ونصحت جیوبھم وھوت افئدتھم الی الجھاد وقد منعھم عن المسیر ضرر او غیرہ

مدینہ میں تم کچھ لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو کہ جو اس راہ میں قدم قدم پر تمھارے ساتھ تھے (اور خدائی اجر اور صلے میں شریک تھے) وہ ایسے لوگ ہیں جن کی نیت پاک ہے اور وہ بہت زیادہ خیر خواہی کرنے والے ہیں اور ان کے دل جہاد کے مشتاق تھے مگر کچھ مجبوریوں مثلاً بیماری اور نقص وغیرہ نے انھیں اس کام سے روک دیا ہے[2]

---

[1] درجۃ کا لفظ بطور نکرہ آیا ہے جیسا کہ کتب ادب میں ہے کہ ایسے موقع پر نکرہ عظمت و اہمیت ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے گویا اس قدر اس کا درجہ بلند ہے جو مکمل طور پر پہچانا نہیں جاتا اور یہ اس طرح ہے کہ جب کسی چیز کی بہت زیادہ قدر و قیمت بیان کرنی ہو تو کہا جاتا ہے کہ اس کی قیمت کوئی نہیں جانتا۔

[2] تفسیر صافی، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

لیکن چونکہ اسلام میں جہاد کی اہمیت اس سے بھی کہیں زیادہ ہے لہٰذا دوبارہ مجاہدین کا ذکر کرتے ہوئے تاکید کرتا ہے:
خدا نے مجاہدین کو قاعدین پر اجرِ عظیم بخشا ہے (وفضل اللہ المجاھدین علی القاعدین اجرًا عظیمًا)۔ بعد ازاں آیت میں "اجرِ عظیم" کی وضاحت کی گئی ہے کہ جو خدا کی طرف سے اہم درجات اور اس کی بخشش و رحمت ہے (درجات منہ ومغفرۃ و رحمۃ) اور اگر اس دوران میں کچھ افراد اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے ہوئے کچھ لغزشوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور اپنے کیے پر پشیمان ہیں تو خدا نے ان سے بھی بخشش و نجات کا وعدہ کیا ہے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے (وکان اللہ غفورًا رحیما)

چند اہم نکات

بلاغت کا ایک پہلو

۱۔ اوپر والی آیت میں تین مرتبہ مجاہدین کا نام آیا ہے پہلی دفعہ مجاہدین کا ذکر ہدف و مقصد اور وسیلہ و ذریعہ کے ساتھ ہوا ہے (المجاھدون فی سبیل اللہ باموالھم) اور دوسری دفعہ صرف وسیلہ جہاد کا ذکر ہوا ہے لیکن ہدف و مقصد کا تذکرہ نہیں ہے (المجاھدین باموالھم وانفسھم) اور تیسرے مرحلے میں صرف مجاہدین کا نام آیا ہے (المجاھدین) اور یہ بلاغت کلام کا ایک واضح نکتہ ہے کہ جب سننے والا مرحلہ بہ مرحلہ موضوع سے زیادہ آشنا ہوتا چلا جاتا ہے تو اس کی قیود اور مشخصات کو کم کرتے چلے جاتے ہیں اور آشنائی و شناسائی کا معاملہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ صرف ایک اشارے ہی سے تمام چیزیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

"درجۃ" اور "درجات"

۲۔ آیت میں پہلے تو مجاہدین کی قاعدین پر فضیلت و برتری کے لیے لفظ "درجۃ" استعمال کیا گیا ہے جبکہ دوسری آیت میں جمع کی صورت میں لفظ "درجات" استعمال ہوا ہے ظاہراً ان دو تعبیروں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ پہلی تعبیر میں مجاہدین کے مقصد کی اپنے غیر پر اصل فضیلت کا تذکرہ ہے لیکن دوسری تعبیر میں اس برتری کی تفصیل بیان کی گئی ہے اس لیے رحمت و مغفرت کا ذکر بھی ساتھ ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان دونوں میں اجمال اور تفصیل والا فرق ہے ضمنی طور پر "درجات" کی تعبیر سے یہ معنی بھی لیا جا سکتا ہے کہ سب مجاہدین ایک درجہ اور پایہ کے نہیں ہیں اور ان کے خلوص، جانثاری اور تکالیف برداشت کرنے کے لحاظ سے ان کے معنوی اور دنیاوی مقامات بھی مختلف ہیں کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ تمام مجاہدین جو ایک ہی صف میں دشمن کے مقابل کھڑے ہوتے ہیں نہ وہ ایک جتنا جہاد کرتے ہیں اور نہ ہی ایک جیسا خلوص رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر ہر ایک اپنے عمل اور نیت کی مناسبت سے جزا اور صلہ پائے گا۔

جہاد کی انتہائی تاکید

جہاد عالمِ آب و گل کا ایک عمومی قانون ہے اور دنیا میں جو بھی چیز ہے چاہے وہ نباتات میں سے ہو یا حیوانات میں سے۔

Marfat.com

جہاد کے ذریعے اپنا راستہ صاف کرتی ہے تاکہ اپنے مطلوبہ کمالات تک پہنچ جائے مثلاً ہم درخت کی جڑیں دیکھیں تو وہ قوت اور غذا حاصل کرنے کے لیے ہر وقت فعال اور متحرک رہتی ہیں اگر وہ یہ فعالیت اور سعی چھوڑ دیں تو ان کے لیے زندہ رہنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمین میں اگر انھیں رکاوٹیں درپیش ہوں تو اگر ان میں اتنی طاقت ہو تو وہ ان میں سوراخ کرکے آگے بڑھ جاتی ہیں تعجب اس بات پر ہے کہ یہ لطیف اور نازک جڑیں بعض اوقات فولادی اوزاروں کی طرح اپنے راستے میں آنے والی رکاوٹوں سے ٹکرا جاتی ہیں اور اگر یہ جڑیں کمزور ہوں تو بھی راستہ بدل کر رکاوٹ عبور کرلیتی ہیں۔

اگر ہم اپنے جسم کو دیکھیں تو اس کے اندر بھی رات دن بلکہ سوتے جاگتے ایک عجیب و غریب قسم کی جنگ جاری رہتی ہے یہ جنگ ہمارے خون کے سفید جرثوموں اور حملہ آور دشمن کے درمیان جاری رہتی ہے اگر ایک لمحے کے لیے بھی یہ جنگ رک جائے اور جسم کی حفاظت کرنے والے یہ محافظ جنگ سے دستبردار ہو جائیں تو طرح طرح کے موذی امراض ہمارے جسم کو گھیر لیں اور ہماری سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جائے۔

بالکل یہی صورت انسانی معاشروں، قوموں اور ملتوں کی ہے وہ لوگ جو ہمیشہ جہاد اور نگہبانی کی حالت میں رہتے ہیں ہمیشہ زندہ اور کامران رہتے ہیں اور وہ لوگ جو سوچتے ہیں کہ عیش و عشرت میں وقت گذارا جائے اور جو انفرادی سطح پر زندہ رہنا چاہتے ہیں وہ جلد یا بدیر مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ زندہ اور مجاہد قوم لے لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ رسول خدا فرماتے ہیں:

فمن ترک الجهاد البسه ذلا وفقرا فی معیشته و محقا فی دینه ان الله اعزامتی بسنابك خیلها ومراکز رماحها۔ [1]

"جو شخص جہاد کو ترک کر دیتا ہے خدا اسے ذلت کا لباس پہنا دیتا ہے اور فقر و فاقہ اس کی زندگی پر اور تاریکی و سیاہی اس کے دین پر منحوس سایے کی طرح چھا جاتی ہے۔ خداوند عالم میری اُمت کو گھوڑوں کے سموں کے ذریعے جو جہاد میں آگے جاتے ہیں اور نیزوں کی انیوں کے وسیلے سے عزت بخشتا ہے۔"

رسول خدا ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

اغزوا تورثوا ابناءکم مجداً۔ [2]

"جہاد کرو تاکہ عظمت اپنی اولاد کو ورثے میں دے جاؤ۔"

حضرت علی امیر المومنین خطبہ جہاد میں اس طرح فرماتے ہیں:

فان الجهاد باب من ابواب الجنة فتحه الله لخاصة اولیائه و هو لباس التقوی ودرع الله الحصينة وجنته الوثيقة فمن ترکه رغبة عنه البسه الله ثوب الذل وشمله البلاء ودیث بالصغار والقماءة۔۔۔۔ [3]

"جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے خدا نے اپنے مخصوص دوستوں کے لیے کھول رکھا ہے، جہاد تقویٰ کا پُر فضیلت لباس ہے، جہاد خدا کی ناقابل شکست زرہ ہے، جہاد پروردگار عالم کی سپر اور ڈھال ہے، جو شخص جہاد کو ترک کر دیتا ہے خدا اس کے جسم پر ذلت اور مصیبت کا لباس پہنا دیتا ہے اور اسے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل و

---

[1]، [2] وسائل کتاب جہاد الباب جہاد العدو وبناسبہ باب یکم حدیث ۲، ۱۲

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۲۷

Marfat.com

خوار کر دیتا ہے۔"

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جہاد صرف مسلح جنگ وجدال کا نام نہیں بلکہ جہاد میں ہر وہ کوشش اور شامل ہے جو خدائی مقدس اہداف ومقاصد کے حصول میں مددگار ثابت ہو۔ جہاد کا مفہوم دفاعی اور مسلح جنگوں کے علاوہ علمی، منطقی، اقتصادی اور سیاسی مقابلوں پر بھی محیط ہے۔

۹۷۔ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝

۹۸۔ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۝

۹۹۔ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ۝

ترجمہ

۹۷۔ وہ لوگ کہ جنکی روح (قابضِ ارواح) فرشتوں نے قبض کی جب کہ وہ اپنے اوپر ظلم کر چکے تھے اور ان سے کہا کہ تم کس حالت میں تھے (اور مسلمان ہونے کے باوجود کفار کی صف میں کیوں جا کھڑے ہوئے) تو انھوں نے کہا کہ ہم اپنی سرزمین پر انتشار اور دباؤ میں تھے تو ان (فرشتوں) نے کہا تو کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے پس ان (کے پاس کوئی عذر و معذرت نہیں تھی اور ان) کے رہنے کی جگہ جہنم ہے اور ان کا انجام بُرا ہے۔

۹۸۔ مگر ایسے مرد، عورتیں اور بچے جو واقعاً دباؤ اور جبر کا شکار تھے کہ جن کے پاس (اس آلودہ ماحول سے نجات پانے کیلیے) نہ کوئی چارہ تھا اور نہ کوئی راہ۔

۹۹۔ ممکن ہے خدا انھیں عفو کے قابل قرار دے اور خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

شانِ نزول

جنگ بدر کی ابتدا سے قبل سردارانِ قریش نے یہ خطرناک اعلان کیا تھا کہ مکہ کے تمام رہنے والے جو میدان جنگ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں، مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں اور جو اس کام کی مخالفت کرے گا اس کا گھر ویران کر دیا

Marfat.com

جائے گا اور اس کا مال ضبط کر لیا جائے گا اس دھمکی کے بعد کچھ ایسے افراد جو بظاہر ایمان لا چکے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھیں گھر اور مال و متاع انتہائی عزیز تھا وہ ہجرت کے لیے تیار نہ ہوئے اور بت پرستوں کے ساتھ میدان جنگ کی طرف چل پڑے میدان جنگ میں انھوں نے مشرکین کا ساتھ دیا وہ مسلمانوں کی کم تعداد کو دیکھ کر شک و شبے میں مبتلا ہو گئے اور آخر کار میدان جنگ میں قتل ہو گئے درج بالا آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی جس میں ان کا عبرت ناک انجام بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر

جہاد سے متعلق مباحث کے بعد ان آیات میں ایسے لوگوں کے عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسلام کا دم بھرتے تھے لیکن انھوں نے اسلام کے اہم لائحہ عمل یعنی "ہجرت" کو عملاً نظر انداز کیے رکھا جس کے نتیجے میں وہ خطرناک وادیوں میں پہنچ گئے اور مشرکین کی صفوں میں شامل ہو کر انھوں نے جانیں گنوا دیں قرآن کہتا ہے: وہ لوگ کہ (قبض روح کرنے والے) فرشتوں نے جن کی روح اس حالت میں قبض کی کہ جب انھوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا انھوں نے ان سے پوچھا کہ اگر تم لوگ مسلمان تھے تو پھر کفار کی صفوں میں شامل ہو کر تم نے مسلمانوں سے کیوں جنگ کی (ان الذین توفاھم الملٰئکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم)۔

وہ جواب میں معذرت خواہی سے کہتے ہیں: ہم اپنے ماحول میں جبر اور دباؤ میں تھے اس لیے ہم فرمان الٰہی پر عمل کی طاقت نہیں رکھتے تھے (قالوا کنا مستضعفین فی الارض) لیکن ان کی یہ معذرت قابل قبول نہ ہوگی اور فوراً وہ خدا کے فرشتوں سے یہ جواب سنیں گے کہ کیا پروردگار کی زمین وسیع و عریض نہ تھی کہ تم ہجرت کرتے اور اپنے آپ کو اس آلودہ اور گھٹے ہوئے ماحول سے نکال کرلے جاتے (قالوا الم تکن ارض اللّٰہ واسعۃ فتھاجروا فیھا)۔

آخر میں ان کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس قسم کے لوگ جنھوں نے بیکار عذر داری اور ذاتی مصلحت اندیشوں کے سبب ہجرت نہیں کی اور انھوں نے اس گھٹے ہوئے ماحول میں زندگی گذارنے کو ترجیح دی ہے ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت برا انجام ہے (فاولٰئک ماوٰھم جھنم و سآءت مصیرًا)۔

بعد والی آیت میں مستضعفین، حقیقی کمزور اور عاجز افراد (نہ کہ جھوٹے مستضعفین) کے استثناء کے ساتھ فرماتا ہے، وہ مرد عورتیں اور بچے جو اس گھٹن زدہ ماحول سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ یہ لوگ حقیقتاً معذور ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ خدا نا قابل عمل ذمہ داری لاگو کرے (الا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان لا یستطیعون حیلۃ ولا یھتدون سبیلا)۔

آخری آیت میں فرماتا ہے، ہو سکتا ہے عفو خداوندی ان کے شامل حال ہو اور خدا ہمیشہ سے معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے (فاولٰئک عسی اللّٰہ ان یعفو عنھم وکان اللّٰہ عفوًا غفورًا)

یہ بھی سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر یہ افراد حقیقتاً معذور ہیں تو پھر کیوں نہیں فرماتا کہ خدا حتماً اور یقیناً انھیں بخش دے گا وہ تو کہتا ہے "عسیٰ" (شاید) اس سوال کا جواب وہی ہے جو اس سورہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے کہ اس طرح کی تعبیروں سے مراد کیا ہے۔ اس آیت میں مذکور حکم چند شرائط کے ساتھ آیا ہے جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

Marfat.com

خدا اس قسم کے افراد سے عفو کرتا ہے جنھوں نے موقع ملنے پر ہجرت کے عمل سے تھوڑی سی کوتاہی بھی نہ کی ہو۔ اصطلاح کے مطابق اس کام کے ضمن میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو اور اب بھی موقع ملتے ہی ہجرت کرنے پر آمادہ اور تیار ہوں۔

چند اہم نکات

۱۔ روح کی استقامت

اس آیت میں موت کی بجائے "توفّی" کا لفظ حقیقت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ موت کا معنی نابود اور فنا ہونا نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی "فرشتوں کی جماعت اور روح انسانی کو پا لینا" ہے۔ یعنی وہ اس کی روح کو جو کہ اس کے وجود کا سب سے بنیادی حصّہ ہے نکال کر ایک دوسرے جہان میں لے جاتے ہیں۔ ایسی تعبیر جو قرآن میں بارہا آئی ہے دراصل قرآن مجید کا اس امر کی طرف ایک واضح ترین اشارہ ہے کہ موت کے بعد روح باقی رہتی ہے اس کی تفصیل مختلف آیات میں مناسب موقع پر آتی رہے گی یہ جواب ان لوگوں کے لیے ہے جو کہتے ہیں کہ قرآن نے روح کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

۲۔ روح قبض کرنے والے، ایک یا ایک سے زائد فرشتے

قرآن میں کئی ایک مقامات (۱۲ مقامات) ہیں جن میں "توفّی"[۱۵] اور موت کا تذکرہ ہے اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روح قبض کرنے کے لیے ایک ہی فرشتہ متعین نہیں کیا گیا بلکہ بہت سے فرشتوں کے ذمہ یہ کام ہے جو لوگوں کی ارواح کو اس جہان سے دوسرے جہان میں لیجانے پر مامور ہیں۔ درج بالا آیت میں فرشتوں کا ذکر جمع کے صیغے (الملائکہ) کے ساتھ آیا ہے۔ یہ بھی اس امر کا گواہ ہے سورہ انعام کی آیت ۶۱ میں ہے:

حتی اذا جاء احدکم الموت توفته رسلنا

"جب تم میں سے کسی ایک کی موت کا وقت آتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح قبض کرتے ہیں۔"

اب اگر ہم دیکھیں کہ بعض آیات میں یہ امر ملک الموت (موت کا فرشتہ) سے منسوب کیا گیا ہے[۱۶] تو وہ اس مفہوم میں ہے کہ وہ ان تمام فرشتوں کا سردار ہے جو ارواح قبض کرنے پر مامور ہیں اور اسی فرشتے کو احادیث میں "عزرائیل" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس بنا پر جب لوگ سوال کرتے ہیں کہ ایک فرشتہ کس طرح ایک ہی وقت میں تمام مقامات پر حاضر ہو کر انسانوں کی روح قبض کرتا ہے تو اس کا جواب اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے۔

---

۱۵ "توفّی" کے معنی کے سلسلہ میں تفسیر نمونہ جلد دوم صفحہ ۲۴۱ کی طرف مراجعہ فرمائیں اردو ترجمہ

۱۶ سورہ سجدہ آیت ۱۱

Marfat.com

اس کے علاوہ اگر فرض کریں کہ اور فرشتے نہیں ہیں اور صرف ایک فرشتہ ہے پھر بھی کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی کیونکہ اس کا اکیلا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے کیونکہ ایک ایسا وجود جو مادے سے نہ بنا ہو اس میں مادی اشیاء کی نسبت وسیع احاطہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ملک الموت کے بارے میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے ملک الموت سے اس جہان پر احاطہ رکھنے کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا:

ما الدنیا کلها عندی فیما سخرها الله لی ومکننی علیها الا کالدرهم فی کف الرجل یقلبه کیف یشاء

یہ جہان اور جو کچھ اس میں ہے اس تسلط اور احاطہ کے لحاظ سے جو خدا نے مجھے بخشا ہے میرے نزدیک اس درہم (دوپیہ) کی مانند ہے جو کسی شخص کے ہاتھ میں ہو کہ جس طرح چاہے الٹ پھیر کرے[1]

بعض آیات میں روح قبض کرنے کا تعلق خدا سے وابستہ کیا گیا ہے مثلاً

الله یتوفی الانفس حین موتها"

"خدا موت کے وقت جانوں کو قبض کرتا ہے۔" (سورۂ زمر ۴۲)

یہ گذشتہ آیات سے متضاد نہیں کیونکہ جن معاملات میں کام واسطوں کے ذریعے ہوتے ہیں وہاں بعض اوقات کام کی نسبت وسیلوں کی طرف دی جاتی ہے اور کبھی اس طرف کہ جو اسباب اور وسیلے پیدا کرتا ہے دونوں نسبتیں صحیح ہیں بہتر نظریہ یہ ہے کہ دنیا کے بہت سے حوادث کی نسبت قرآن مجید میں فرشتوں کی طرف دی گئی ہے جو خدا کی جانب سے عالم ہستی میں مامور ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں فرشتہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس مفہوم میں عاقل مجرد موجودات سے لے کر طبعی توانائیاں تک شامل ہیں۔

۲۔ مستضعف کون ہے؟

آیات قرآن اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو افراد فکری، جسمانی یا اقتصادی طور پر اتنے ضعیف اور کمزور ہوں کہ حق و باطل میں تمیز نہ کر سکیں یا جو باوجود صحیح عقیدہ رکھنے کے جسمانی یا مالی طور پر کمزوری کے باعث یا معاشرے کی ناروا پابندیوں کے سبب اپنے فرائض ادا نہ کر سکتے ہوں اور نہ ہی ہجرت کے قابل ہوں انھیں مستضعف کہتے ہیں۔ حضرت علیؑ سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا:

ولا یقع اسم الاستضعاف علی من بلغته الحجة فسمعتها اذنه ووعاها قلبه۔

"وہ شخص مستضعف نہیں ہے جس پر حجت تمام ہو چکی ہو اس نے حق کو سنا ہو اور اس کے ذہن نے اس کا ادراک کیا ہو۔"[2]

امام موسیٰ بن جعفرؑ سے پوچھا گیا، مستضعف کون ہے؟ امام نے اس سوال کے جواب میں تحریر فرمایا:

الضعیف من لم ترفع له حجة ولم یعرف الاختلاف فاذا عرف الاختلاف فلیس بضعیف

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۳۹۱ آیت ا سورہ اسرا کے ذیل میں [2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۳۶

Marfat.com

"مستضعف وہ شخص ہے جس تک حجت اور دلیل نہ پہنچی ہو اور وہ (مذاہب اور عقائد کے بارے میں) موجود اختلاف کو نہ سمجھ سکا ہو (جو کہ محرکِ تحریک ہے) اور جو اس چیز کو سمجھ چکا ہو وہ مستضعف نہیں ہے[1]۔"

واضح ہے کہ اوپر والی دونوں احادیث میں مستضعف فکری اور عقیدہ کے لحاظ سے ہے لیکن زیر بحث آیت میں اور اسی سورہ کی آیہ ۷۵ میں جو بیان ہو چکی ہے مستضعف سے مراد عملی مستضعف ہے یعنی وہ شخص جس نے حق کی تشخیص کر لی ہو لیکن ماحول کا جبر اور گھٹن اسے عمل کی اجازت نہ دیتا ہو۔

۱۰۰۔ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ۧ

ترجمہ

۱۰۰۔ اور جو شخص راہِ خدا میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سے اور وسیع امن کے خطے پائے گا اور جو شخص اپنے شہر سے خدا اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرے پھر اسے موت آجائے تو اس کا اجر و ثواب خدا پر ہے اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

ہجرت ___ اسلام کا ایک اصلاحی حکم

جو لوگ ہجرت کے فریضہ سے کوتاہی کر کے طرح طرح کی ذلتوں اور بدبختیوں کا شکار ہو جاتے ہیں ان کے تذکرے کے بعد اس آیت میں قطعی طور پر ہجرت کی اہمیت کے سلسلہ میں دو حصوں میں بحث ہوئی ہے۔

سب سے پہلے دنیاوی زندگی میں ہجرت کے ثمرات اور برکات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے، جو لوگ خدا کی راہ میں اور خدا کے لیے ہجرت کرتے ہیں انہیں خدا کے اس وسیع جہان میں امن کی بہت سی اور وسیع جگہیں میسر آئیں گی جن میں رہ کر وہ حق کو فروغ دیں گے اور مخالفین کو زیر کر سکیں گے (ومن یھاجر فی سبیل اللہ یجد فی الارض مراغما کثیرا وسعة) غور کرنا چاہیے کہ "مراغم" رغام (بروزن کلام) کے مادہ سے بمعنیٰ "خاک اور مٹی" لیا گیا ہے۔ ارغام کا معنی ہے کسی کو مٹی میں رگیدنا اور ذلیل کرنا اور مراغم اسم مفعول بھی ہے اور اسم مکان بھی۔ لیکن زیر نظر آیت میں اسم مکان کے معنی میں

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۳۹

Marfat.com

آیا ہے یعنی وہ مکان جہاں حق کا اجرا کر سکتے ہیں اور اگر کوئی شخص عناد کی وجہ سے حق کی مخالفت کرے تو اسے مغلوب کر کے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہجرت کے معنوی اور اخروی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، اگر کچھ لوگ ہجرت کے ارادہ سے اپنے گھر اور وطن سے خدا اور پیغمبر کی طرف ہجرت کریں اور ہجرت کے مقام تک پہنچنے سے پہلے انھیں موت آجائے تو ان کا اجر اور ثواب خدا کے ذمہ ہے اور خدا ان کے گناہوں کو بخش دے گا (ومن یخرج من بیتہ مهاجرًا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ وکان اللہ غفورًا رحیمًا) اس وجہ سے ہجرت کرنے والے ہر صورت میں ایک عظیم کامیابی حاصل کریں گے چاہے وہ اپنی منزل پر پہنچ جائیں اور حریت و آزادی کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی سے بہرہ ور ہوں اور منزل مقصود تک پہنچ جائیں اور چاہے وہ ایسا نہ کر سکیں اور اپنی جان اس راہ میں قربان کر دیں۔ اس کے باوجود ہر قسم کا اجر و ثواب خدا ہی کے ذمہ ہے۔ لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ اس بات کا تذکرہ ہے " فقد وقع اجرہ علی اللہ یعنی اس کا اجر خدا پر لازم ہو چکا ہے " یہ امر ہجرت کرنے والوں کے اجر و ثواب کی انتہائی عظمت واہمیت کا مظہر ہے۔

اسلام اور ہجرت

اس آیت اور قرآن کی بہت سی دوسری آیات کے مطابق اسلام صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ انسان اگر کسی ماحول میں کچھ عوامل واسباب کی بنا پر اپنی ذمہ داری نبھا نہ سکے تو دوسرے ماحول اور مقام امن کی طرف ہجرت کرے کیونکہ جہاں ہستی کے باوجود

نتواں مرد بہ ذلت کہ درینجا زادم

(یعنی اس وجہ سے ذلت کے ساتھ کسی جگہ نہیں مرنا چاہیے کہ یہ میری جائے پیدائش ہے)

اور اس حکم کی علت اور سبب واضح ہے کیونکہ انسان کسی خاص مقام کا پابند نہیں ہے وہ کسی معین مقام اور ماحول سے وابستہ اور اس میں محدود نہیں ہے اس طرح انسان کا اپنی جائے پیدائش اور اس کے ماحول اور علاقے سے انتہائی لگاؤ اسلام کے نقطہ نظر سے مسلمانوں کی ہجرت سے مانع نہیں ہو سکتے یہی وجہ ہے کہ صدر اسلام میں یہ تمام وابستگیاں اسلام کی حفاظت اور ترقی کے لیے منقطع کر دی گئیں۔ ایک مغربی مؤرخ کے بقول؛

> قبیلہ اور خاندان وہ اکیلا درخت ہے جو صحرا میں اگتا ہے اور کوئی شخص اس کی پناہ اور سایے کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا لیکن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ہجرت کے ذریعے اس درخت کو جس نے ان کے خاندان کے لیے گوشت اور لہو سے پرورش پائی تھی اپنے پروردگار کے لیے کاٹ دیا (اور قریش سے اپنا رابطہ ختم کر دیا)[1]

علاوہ ازیں تمام زندہ موجودات میں یہ بات مشترک ہے کہ جب وہ اپنے وجود کو خطرے میں دیکھتے ہیں تو ہجرت کا راستہ اختیار کرتے ہیں اس سے پہلے بہت سے لوگوں نے کسی علاقے کے جغرافیائی حالات کے متغیر ہونے کے بعد اپنی زندگی کی بقا کے لیے

---

[1] محمد خاتم پیامبران جلد اول۔

Marfat.com

اپنے وطن اور جائے پیدائش سے دوسرے علاقوں کی طرف کوچ کیا ہے نہ صرف انسان بلکہ دوسرے جانداروں میں بہت سی ایسی انواع ہیں جو مہاجر کے طور پر پہچانی گئی ہیں۔ مثلاً بعض ہجرت کرنے والے پرندے ایسے بھی ہیں جو اپنی زندگی کی بقا کے لیے بعض اوقات پورے کرہ ارض کی سیر کرتے ہیں اور ان میں سے بعض تو قطب شمالی سے قطب جنوبی تک کا سفر طے کرتے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی کی بقا کے لیے تقریباً ۱۸ ہزار کلومیٹر تک پرواز کرتے ہیں اور یہ چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ ہجرت حیات وزیست کو رواں دواں رکھنے کے قوانین میں سے ہے تو کیا ممکن ہے کہ انسان ایک پرندے سے بھی کم تر ہے؟ یا یہ ہوسکتا ہے کہ جب مقدس مقاصد واہداف اور حیات معنوی جن کی قدر وقیمت مادی زندگی سے کہیں زیادہ ہے، خطرے میں پڑجائیں تو انسان اس عذر کی بنا پر کہ یہ میری جائے پیدائش ہے اپنے اہداف ومقاصد کو چھوڑ دے اپنے آپ کو طرح طرح کی ذلت وخواری، محرومی اور غلامی کے سپرد کردے، یا یہ کہ وہ اس عمومی قانونِ حیات کے مطابق اس علاقے سے ہجرت کر جائے اور کسی ایسی جگہ منتقل ہو جائے جو اس کی مادی ؍ روحانی نشوونما اور رُشد کے لیے مناسب ہو۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ ہجرت جو اپنی حفاظت کی بجائے دینِ اسلام کے تحفظ کے لیے ہوئی مسلمانوں کی تاریخ کی ابتدا ہے اور یہ ہجرت ہمارے تمام سیاسی، تبلیغی اور معاشرتی معاملات کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے باقی رہا یہ سوال کہ ہجرتِ پیغمبر اکرمؐ کا سال اسلام کی تاریخ کے ابتدا کے طور پر کیوں منتخب ہوا ہے۔

تو یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے ہم جانتے ہیں کہ ہر قوم وملت کی اپنی ایک تاریخی ابتدا ہوتی ہے۔ عیسائیوں نے اپنی تاریخ کی ابتدا حضرت مسیحؑ کے سال پیدائش سے شمار کی ہے اسلام میں باوجودیکہ بہت سے اہم واقعات تھے۔ مثلاً ولادت پیغمبر اسلامؐ، آپؐ کی بعثت، فتح مکہ اور رحلت پیغمبر اکرمؐ، پھر بھی ان میں سے کوئی واقعہ منتخب نہیں ہوا اور صرف ہجرتِ رسولؐ خدا تاریخ کی ابتدا کا عنوان ٹھہری۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خلیفہ دوم کے وقت جب اسلام طبعی طور پر وسعت حاصل کر چکا تھا مسلمانوں کو ایسی ابتدائے تاریخ کے تعین کی فکر لاحق ہوئی جو عمومی لحاظ سے سب کے لیے یکساں ہو۔ بہت ردو قد کے بعد حضرت علیؑ کے نظریہ کو قبول کر لیا گیا حضرت علیؑ نے ابتدائے تاریخ کے لیے ہجرت کا انتخاب کیا[1]

حقیقت میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ ہجرت وہ روشن ترین قدم تھا جسے اسلام میں عملی جامہ پہنایا گیا اور جو تاریخ اسلام کی فصلِ نو کا آغاز بنا۔ مسلمان جب تک مکہ میں تھے اپنی تعلیم وتربیت کے ابتدائی دور میں سے گزر رہے تھے ظاہراً وہاں وہ کسی قسم کی اجتماعی اور سیاسی طاقت نہ تھے لیکن ہجرت کے فوراً بعد اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی اور بڑی تیزی کے ساتھ ہر شعبہ زندگی میں ترقی ہوئی اور اگر مسلمان فرمان رسالت کے مطابق اس طرح ہجرت نہ کرتے تو نہ صرف یہ کہ اسلام مکہ کے دائرے سے باہر نہ نکلتا بلکہ ممکن تھا کہ وہیں خاموش اور دفن ہو جاتا۔

واضح ہے کہ ہجرت کوئی ایسا حکم نہیں کہ جو زمانِ پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ ہر عہد اور زمانہ میں کسی جگہ بھی ایسے حالات ہوں تو مسلمانوں کی ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ وہ ہجرت کریں۔

---

[1] تاریخ طبری جلد دوم ص ۱۱۲

Marfat.com

بنیادی طور پر قرآن ہجرت کو آزادی اور سکون کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ جیسا کہ زیر بحث آیت میں صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ سورہ نحل آیہ ۴۱ میں بھی یہ حقیقت ایک اور طریقے سے بیان ہوئی ہے:

والذین ھاجروا فی اللہ من بعد ما ظلموا لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ

اور وہ لوگ جن پر ظلم کیے گئے اور اس کے بعد انھوں نے راہ خدا میں ہجرت اختیار کی وہ دنیا میں پاکیزہ مقام حاصل کریں گے۔

اس نکتہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ ہجرت اسلام کی نگاہ میں صرف مکانی اور خارجی ہجرت نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس ہجرت سے پہلے اندر اور باطن سے ہجرت کا آغاز ہو اور اس ہجرت سے مراد ہجرت اور دوری ہے ان چیزوں سے کہ جو انسان کی اصالت اس کے مرتبے اور اعزاز سے ٹکراتی ہوں یہ ہجرت اس لیے ہے تاکہ اس کے زیر اثر انسان خارجی اور مکانی ہجرت کے لیے آمادہ ہو سکے اور یہ ہجرت ضروری ہے تاکہ اگر ہجرت مکانی کی ضرورت پڑے تو اس باطنی ہجرت کے زیر اثر انسان راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو سکے اصولی طور پر روح ہجرت وہی ظلمت سے نور، کفر سے ایمان اور گناہ و نافرمانی سے اطاعت خداوندی کے لیے دیوانہ وار نکل پڑنا ہے اسی لیے ہم احادیث میں پڑھتے ہیں کہ وہ مہاجرین جنھوں نے جسمانی طور پر ہجرت کی مگر روحانی ہجرت نہیں کی وہ مہاجرین کی صفوں میں شمار نہیں ہوتے اس کے مقابلے میں وہ لوگ جنھیں مکانی ہجرت کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ باطنی طور پر ہجرت میں شامل تھے وہ مہاجرین کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

ویقول الرجل ھاجرت، ولم یھاجر انما المھاجرون الذین یھجرون السیئات ولم یأتوا بھا۔

بعض کہتے ہیں کہ ہم نے ہجرت کی ہے حالانکہ حقیقت میں انھوں نے ہجرت نہیں کی حقیقی ہجرت کرنے والے وہ ہیں جو گناہوں سے ہجرت اختیار کرتے ہیں اور ان کے مرتکب نہیں ہوتے [1]

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

من فر بدینہ من ارض الی ارض و ان کان شبرًا من الارض استوجب الجنۃ وکان رفیق محمد و ابراھیم علیھما السلام

جو شخص اپنے دین کی حفاظت کے لیے ایک سرزمین سے دوسری سرزمین کی طرف ایک بالشت برابر ہجرت کرے تو وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور محمد و حضرت ابراہیم علیہم السلام کی رفاقت اور ہم نشینی اسے نصیب ہو گی (کیونکہ یہ دونوں عظیم پیغمبر عالم ہستی میں ہجرت کرنے والوں کے پیشوا اور رہنما تھے) [2]

۱۰۱ وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ○

---

۱ سفینۃ البحار (ہجر)   ۲ نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۴۱

Marfat.com

ترجمہ

۱۰۱۔ اور جس وقت سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کرو، اگر تمھیں کافروں کے فتنے کا ڈر ہو. کیونکہ کافر تمھارے واضح دشمن ہیں۔

تفسیر

نمازِ مُسافر

گذشتہ آیات "جہاد" اور "ہجرت" کے بارے میں بحث کر رہی تھیں۔ اب اس آیت میں "نماز مسافر" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب سفر کرو تو کوئی حرج نہیں کہ نماز کو کم اور قصر کر لو، اگر کفار کی طرف سے تمھیں خدشہ ہو کیونکہ کافر تمھارے واضح دشمن ہیں (واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصّلٰوۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا ان الکافرین کانوا لکم عدوًّا مبینًا) اس آیت میں سفر کو "ضرب فی الارض" سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ مسافر سفر کرتے وقت زمین کو اپنے پاؤں تلے روندتا ہے[1]۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں نماز قصر کا مسئلہ دشمن کے خطرے کے ساتھ مشروط ہے جبکہ ہم فقہی مباحث میں پڑھتے ہیں کہ نماز قصر ایک عمومی حکم ہے اور اس میں پرخطر اور پُرامن سفروں میں کوئی فرق نہیں ہے شیعہ اور اہلِ سنت کی طرف سے کئی ایک روایات جو نماز قصر کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس عمومیت کی تائید کرتی ہیں[2]۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے قصر والے حکم کو خوف سے مربوط کرنا مندرجہ ذیل چند وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر ہو۔

الف: یہ پابندی اور شرط اسلام کے ابتدائی دنوں کی صورتِ حال سے متعلق ہے اور اصطلاح کے مطابق قید غالبی ہے یعنی غالباً ان کے سفر خوف و خطر سے بھرپور ہوتے تھے اور جیسا کہ علمِ اصول میں کہا جا چکا ہے کہ قیود غالبی کا مفہوم نہیں ہوتا جیسا کہ:

و ربائبکم اللاتی فی حجورکم

تمھاری بیوی کی وہ لڑکیاں جو تمھاری گود میں پلی بڑھی ہیں تم پر حرام ہیں۔ (نسآء۔ ۲۳)

اس آیت میں بھی یہی مسئلہ درپیش ہے کیونکہ بیوی کی بیٹیاں محارم میں داخل ہیں چاہے وہ اس کی گود میں رہی ہوں یا نہ رہی ہوں غالباً جو طلاق یافتہ عورتیں دوسرا شوہر کرتی ہیں وہ جوان ہوتی ہیں اور چھوٹے بچے ان کے ساتھ ہوتے ہیں جو دوسرے شوہر کی گود میں پلتے ہیں اس لیے فی حجورکم (تمھاری گود میں) کی قید اس آیت میں آئی ہے۔

---

[1] مفردات راغب مادہ "ضرب"

[2] مزید اطلاع کے لیے وسائل الشیعہ جلد پنجم اور سنن بیہقی جلد ۳ ص ۱۳۴ وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

ب ۔ بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ نماز قصر کا مسئلہ پہلے تو خوف کے وقت سے متعلق تھا (اوپر والی آیت کے مطابق) پھر اس حکم نے وسعت پیدا کی اور یہ تمام مواقع کے لیے عمومیت اختیار کر گیا۔

ج ۔ ممکن ہے یہ پابندی تاکیدی پہلو رکھتی ہو یعنی نماز قصر مسافر کے لیے ہر جگہ لازم اور واجب ہے لیکن جب دشمن کا خدشہ ہو تو پھر اس کی زیادہ تاکید ہے۔ بہرحال اس میں شک و شبہ نہیں کہ آیت کی تفسیر میں آنے والی بہت سی اسلامی روایات کی طرف دھیان دیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نماز مسافر حالتِ خوف سے مخصوص نہیں ہے اسی لیے تو پیغمبر اکرمؐ بھی سفر کی حالت میں یہاں تک کہ مراسم حج میں (منیٰ کی سرزمین میں) نماز قصر پڑھتے تھے۔

ایک دوسرا سوال جو پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں بیان ہوا ہے "لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ" (تم پر کوئی گناہ نہیں ہے) اور قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا گیا کہ بس نماز قصر ہی پڑھو تو ایسے میں کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ نماز قصر واجب عینی ہے، واجب تخییری نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بالکل یہی سوال رہبرانِ اسلام سے ہوا اور انھوں نے دو نکات کی طرف اشارہ کیا ہے ــــــ:

پہلا یہ کہ "لَا جُنَاحَ" (تم پر کوئی گناہ نہیں) کی تعبیر خود قرآنِ مجید میں بعض مواقع پر وجوب کے معنی میں استعمال ہوئی ہے، مثلاً ــــــ:

ان الصفا والمروة من شعائر الله فمن حج البيت او اعتمر فلا جناح عليه ان يطوف بهما (البقرة ، ۱۵۸)

صفا اور مروہ خدا کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو شخص حج و عمرہ ادا کرے اس کے لیے کوئی حرج نہیں کہ ان دونوں کا طواف کرے (صفا اور مروہ کے درمیان سعی بجا لائے) ــــــ

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا حج و عمرہ دونوں میں واجب ہے اسی لیے تو پیغمبر اکرمؐ اور تمام مسلمان یہ عمل کرتے تھے۔ بالکل یہی مضمون ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے[۱]

دوسرے الفاظ میں "لاجناح" کی تعبیر زیر بحث آیت میں اور نیز آیت حج میں حرمت کے وہم کی نفی کے لیے آئی ہے، کیونکہ اسلام کی ابتداء میں صفا اور مروہ (پہاڑیوں) کے اوپر بت رکھے ہوئے تھے بعض مسلمانوں کا یہ خیال تھا صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا بت پرستوں کے آداب میں سے ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا لہٰذا خدا اس غلط فہمی کی نفی کے لیے فرماتا ہے "کہ کوئی حرج نہیں کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرو"۔ اسی طرح مسافر کے ذکر میں احتمال ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کریں کہ سفر میں نماز کو قصر کرنا ایک گناہ ہے لہٰذا لاجناح کی تعبیر کے ساتھ اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے ــــــ

دوسرا نکتہ کہ جس کی طرف بعض روایات میں بھی اشارہ ہوا ہے یہ ہے کہ سفر میں نماز کو قصر کرنا ایک قسم کی خدا کی طرف سے رعایت ہے لہٰذا ادب اور احترام کا تقاضا ہے کہ انسان اس تخفیف کو رد نہ کرے اور اس کی طرف سے بے اعتنائی نہ برتے۔ اہل سنت کی

---

[۱] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۴۲

Marfat.com

روایات میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے نماز قصر کے بارے میں فرمایا:

صدقة تصدق الله بها علیکم فاقبلوا صدقته[1]

یہ ہدیہ ہے جو خدا نے تمھیں دیا ہے اسے قبول کرو۔

اس حدیث کی مثالیں کتب شیعہ میں بھی ملتی ہیں۔ امام صادق علیہ السلام پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا:

"سفر میں افطار اور نماز کا قصر ہونا خدا کا ہدیہ ہے جو شخص اس عمل سے صرفِ نظر کرے اس نے گویا خدائی ہدیہ کو رد کیا ہے۔[2]

ایک اور نکتہ جس کی طرف توجہ کرنی چاہیے یہ ہے کہ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ زیر بحث آیت نمازِ خوف (میدان جنگ میں ادا کی جانے والی نماز) کو بیان کرتی ہے اور " اِنْ خِفْتُمْ " (اگر تمھیں ڈر ہے) کو اس کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ (جب تم سفر کرو) کا جملہ ایک عام مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر طرح کا سفر شامل ہے چاہے عام سفر ہو یا جہاد کے لیے سفر ہو۔ علاوہ ازیں خوف کا حکم بعد والی آیت میں علیحدہ اور مستقل طور پر آیا ہے اور ان خفتم کی تعبیر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ایک غالبی قید ہے جو اُس زمانہ میں مسلمانوں کے سفروں کے لیے زیادہ پائی جاتی تھی۔ لہٰذا یہ نماز خوف پر دلالت نہیں کرتی۔

اس کے علاوہ میدانِ جنگ میں ہمیشہ دشمن کے حملہ کا خوف رہتا ہے لہٰذا وہ ایسی جگہ نہیں کہ یہ کہا جائے" اگر تمھیں خوف ہو کہ دشمن حملہ کرے گا" یہ خود ایک ثبوت ہے کہ آیت تمام قسم کے سفروں کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جن میں ممکن ہے خطرات موجود ہوں۔

ضمناً غور کرنا چاہیے کہ نماز قصر کی شرائط باقی تمام احکامِ اسلامی کی شرائط اور خصوصیات کی مانند قرآن میں نہیں آئیں بلکہ سنت میں ان کی طرف اشارہ ہوا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ نماز قصر آٹھ فرسخ (تقریباً ۲۸ میل) سے کم فاصلے کے سفر کے لیے نہیں ہے کیونکہ اس زمانہ میں مسافر عام طور پر ایک دن میں آٹھ فرسخ کی راہ طے کرلیتا تھا۔

نیز وہ لوگ جو ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں یا سفر ان کی زندگی کا جزو ہے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ سفر ایسے لوگوں کے لیے معمول کا درجہ رکھتا ہے نہ کہ غیر معمولی (اور زیادہ مشقت آور) اسی طرح وہ لوگ کہ جن کا سفر معصیت کا سفر ہے، یہ قانون انھیں شامل نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ حکم ایک طرح سے خدا کی طرف سے رعایت ہے لہٰذا وہ افراد جو گناہ کی راہ میں سفر کرتے ہیں یہ تخفیف ان کے لیے نہیں ہے اس طرح مسافر جب تک حدِ ترخص تک نہ پہنچے (وہ مقام جہاں شہر کی اذان کی آواز نہ سن سکے یا شہر کی دیواریں اسے نظر نہ آئیں) وہ نماز قصر نہیں کرسکتا کیونکہ وہ ابھی تک اپنے شہر کی حدود سے خارج ہی نہیں ہوا اس لیے مسافر کے زمرے میں وہ نہیں آتا۔ کتبِ فقہ میں تفصیل سے بیان ہونے والے احکام اسی طرح ہیں اور ان سے مربوط احادیث کو محدثین نے کتب حدیث

---

[1] یہ حدیث سنن بیہقی جلد ۳ صفحہ ۱۳۴ پر صحیح مسلم سے نقل ہوئی ہے اور تفاسیر و کتبِ فقہ میں بھی آئی ہیں۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۵ صفحہ ۵۴۰

Marfat.com

میں ذکر کیا ہے۔

۱۰۲۔ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۚ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۖ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ○

ترجمہ

۱۰۲۔ اور جس وقت تم ان کے درمیان ہو (اور میدان جنگ میں) ان کے لیے نماز قائم کرو ان میں سے ایک دستہ تمھارے ساتھ (نماز کے لیے) کھڑا ہو جائے گا۔ ایسے لوگ اپنے ہتھیار اپنے پاس رکھیں اور جب سجدہ کریں (اور نماز کو ختم کریں) تو تمھارے پیچھے سے ہٹ کر (میدانِ جنگ) کی طرف پلٹ جائیں اور دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی (اور وہ جنگ میں مشغول تھا) آکر تمھارے ساتھ نماز پڑھے اور یہ لوگ (بھی) وسائلِ دفاع اور اپنے ہتھیار اپنے ساتھ (حالتِ نماز میں) اٹھائے رکھیں (کیونکہ) کفار یہی چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور مال و متاع سے غافل ہو جاؤ اور وہ اچانک تم پر حملہ کر دیں اور اگر بارش کی وجہ سے تم تکلیف میں ہو یا بیمار (اور مجروح) ہو تو کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دو۔ لیکن دفاعی وسائل (مثلاً زرہ اور خود) پہنے رکھو۔ خدا نے کافروں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

شانِ نزول

جب پیغمبر اکرمؐ کچھ مسلمانوں کے ساتھ مکہ جانے کے ارادہ سے سرزمین حدیبیہ میں پہنچے تو اس بات کا قریش کو پتہ چلا۔ خالد بن ولید کی سرکردگی میں دو سو افراد مکہ کی طرف مسلمانوں کی پیش رفت روکنے کے لیے مکہ کے قریبی پہاڑوں میں مورچہ زن ہو گئے۔ ظہر کے وقت حضرت بلال نے اذان دی اور پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کے ساتھ نماز ظہر با جماعت ادا کی۔ خالد بن ولید یہ منظر دیکھ کر

Marfat.com

سوچ میں پڑگیا اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مسلمانوں کے نزدیک نماز عصر بڑی قدر و منزلت رکھتی ہے یہاں تک کہ وہ اسے اپنی آنکھوں کی بینائی سے زیادہ محترم سمجھتے ہیں جب مسلمان حالت نماز میں ہوں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے ان کا کام تمام کردو۔ اس موقع پر درج بالا آیت اُتری اور مسلمانوں کو نماز خوف کا حکم دیا گیا یہ آیت ہر قسم کی غفلت کے دوران ہونے والے اچانک حملے سے متعلق ہے۔ اعجاز قران کا یہ ایک نکتہ ہے کہ دشمن کے کسی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے منصوبوں کو نقش برآب کردیا جائے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ خالد بن ولید یہ منظر دیکھ کر ایمان لے آیا اور مسلمان ہوگیا[1]

تفسیر

جہاد سے متعلق آیات کے بعد یہ آیت مسلمانوں کو نماز خوف کی تعلیم دے رہی ہے جسے دوران جنگ پڑھا جاتا ہے۔ آیت پیغمبر اکرمؐ کو خطاب کرتے ہوئے کہتی ہے: جب آپ ان کے درمیان ہوں انھیں نماز پڑھائیں تو چاہیے کہ مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہوجائیں پہلا حصہ مسلح ہو کر آپ کے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہوجائے (واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ فلتقم طائفۃ منھم معک ولیأخذوا اسلحتھم) پھر جب یہ گروہ سجدہ کرے (اور ان کی نماز کی پہلی رکعت مکمل ہوجائے تو آپ اپنی جگہ توقف کریں) اور وہ تیزی کے ساتھ دوسری رکعت مکمل کر کے میدانِ جہاد کی طرف پلٹ جائیں اور دشمن کا مقابلہ کریں) اور دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی وہ پہلے گروہ کی جگہ لے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھے (فاذا سجدوا فلیکونوا من وراءکم ولتأت طائفۃ اخری لم یصلوا فلیصلوا معک) دوسرے گروہ کو بھی چاہیے کہ وہ دفاعی وسائل اور ہتھیار سنبھالے رکھے اور انھیں زمین پر نہ رکھ دے (ولیأخذوا حذرھم واسلحتھم) اس طرح نماز اس لیے پڑھی جاتی ہے تاکہ دشمن تمھیں غفلت میں زیر نہ کرسکے کیونکہ دشمن تو ہمیشہ اسی انتظار میں رہتا ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے اور وہ (دشمن) چاہتا ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں اور سامانِ جنگ سے غافل ہوجاؤ اور وہ تم پر اچانک حملہ کردے (ود الذین کفروا لو تغفلون عن اسلحتکم وامتعتکم فیمیلون علیکم میلۃ واحدۃ) لیکن چونکہ ہوسکتا ہے کہ کچھ ایسی ضرورت پیش آپڑے کہ ہتھیار اور دفاعی وسائل کا اٹھائے رکھنا حالت نماز میں مشکل ہو یا کمزوری، بیماری اور زخموں کی وجہ سے (جو کہ جنگ میں لڑنے والوں کو آتے ہیں) ہتھیاروں اور دفاعی ساز و سامان کا اٹھائے رکھنا زحمت اور تکلیف کا باعث ہو لہٰذا آیت کے آخر میں یہ حکم دیتا ہے اور تمھارے لیے کوئی گناہ اور حرج نہیں کہ اگر بارش سے تمھیں تکلیف ہو یا بیمار ہوجاؤ تو اس حالت میں اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دو (ولا جناح علیکم ان کان بکم اذی من مطر او کنتم مرضی ان تضعوا اسلحتکم) مگر پھر بھی ہر صورت میں تحفظ اور احتیاط کے وسائل (زرہ اور خود وغیرہ) اپنے پاس رکھنے سے غفلت نہ برتو یہاں تک کہ مجبوری کی حالت میں بھی انھیں اپنے پاس ضرور رکھو۔ اگر کبھی دشمن حملہ کرے تو تم مدد پہنچنے تک اپنی حفاظت کرسکو (وخذوا حذرکم) تم ان احکامات اور قوانین کو پلّے باندھ لو اور مطمئن رہو کہ کامیابی تمھارے لیے ہے کیونکہ خدا نے کافروں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب

---

[1] تفسیر تبیان جلد ۳ ص ۳۱۱ اور دیگر تفاسیر

Marfat.com

مہیا کر رکھا ہے (ان اللہ اعد للکافرین عذابا مھینا)۔

چند اہم نکات

۱۔ نماز خوف ہر دور میں ہو سکتی ہے

واضح ہے کہ یہاں پیغمبر اکرمؐ کے مسلمانوں کے درمیان نماز خوف کے موقع پر موجود ہونے سے یہ مراد نہیں کہ یہ نماز ذاتِ پیغمبر اکرمؐ کے وجود سے مشروط ہے بلکہ مراد سرفروشوں اور مجاہدین کے درمیان نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے امام، پیشوا اور رہنما کا وجود ہے۔ اسی لیے تو حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ نے بھی نمازِ خوف ادا کی تھی یہاں تک بعض اسلامی لشکروں کے کمانڈروں (مثلاً حضرت حذیفہ یمانی) نے اسی اسلامی عمل کو ضرورت کے وقت انجام دیا[1]

۲۔ دوران نمازِ خوف مسلح رہنے کے حکم میں فرق

آیت میں پہلے گروہ کو حکم ہوتا ہے کہ نماز خوف کے وقت ان کے پاس ہتھیار ہونے چاہییں۔ لیکن دوسرے گروہ سے کہتا ہے کہ دفاعی ساز و سامان (مثلاً زرہ) اور ہتھیاروں کو زمین پر بالکل نہ رکھیں ممکن ہے کہ ان دونوں دستوں کا فرق اس وجہ سے ہو کہ پہلے گروہ کے نماز کو ادا کرتے وقت دشمن ابھی تک اس لائحہ عمل سے بے خبر ہو لہٰذا اس میں حملے کا احتمال بہت کم ہے لیکن دوسرے دستہ کے وقت جبکہ دشمن ادائیگی نماز پر متوجہ ہو جاتا ہے تو حملے کا احتمال بہت زیادہ ہے۔

۳۔ مال و متاع کی حفاظت

مال و متاع کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ اپنی حفاظت کے علاوہ دوسرے جنگی وسائل اور سفر کے ساز و سامان، غذائی ذخیرے اور جو حیوانات تمہارے ساتھ ہیں ان کی نگرانی بھی تمہیں کرنا ہے۔

۴۔ نماز باجماعت کی اہمیت

ہم جانتے ہیں کہ نماز باجماعت اسلام میں واجب نہیں ہے لیکن بہت زیادہ تاکیدی مستحبات میں ہے اور اوپر والی آیت اس کی ایک زندہ نشانی ہے اس اسلامی لائحہ عمل کی تاکید یہاں تک ہے کہ میدان جنگ میں بھی اس طریقے کی انجام دہی کیلیے نماز خوف سے استفادہ کیا جاتا ہے یہ امر اصل نماز اور جماعت دونوں کی اہمیت ظاہر کرتا ہے نیز اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقی مجاہدین اپنے ہدف اور مقصد سے کس قدر وابستہ ہوتے ہیں نیز اس کام سے دشمنوں پر بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان میدان جنگ میں بھی اپنی ذمہ داریاں

---

[1] کنز العرفان جلد اول صفحہ ۱۹۱

Marfat.com

ادا کرنے کا کس قدر اہتمام کرتے ہیں یہ عمل دشمنوں پر ایک خاص نفسیاتی اثر بھی مرتب کرتا ہے۔

نمازِ خوف کی کیفیّت

اس آیت میں نماز خوف کے بارے میں کوئی زیادہ وضاحت موجود نہیں ہے اور یہی قرآن کا طریقہ ہے کہ وہ کلیات کو بیان کر کے ان کی تفصیل و تشریح سنت پر چھوڑ دیتا ہے نماز خوف کا جو طریقہ سنت سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ چار رکعتی نماز دو رکعتی نماز میں تبدیل ہو جاتی ہے پہلا گروہ پیش نماز کے ساتھ ایک رکعت پڑھ لیتا ہے اور پیش نماز ایک رکعت کے بعد توقف کرتا ہے اور وہ گروہ دوسری رکعت کو علیحدگی میں انجام دیتا ہے اور محاذ جنگ کی طرف پلٹ جاتا ہے پھر دوسرا گروہ اس کی جگہ لے لیتا ہے اور وہ اپنی ایک رکعت پیش نماز کے ساتھ اور دوسری رکعت فرادیٰ انجام دیتا ہے (نماز خوف کی کیفیت کے بارے میں اور نظریے بھی ہیں لیکن ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے یہ مشہور ترین نظریہ ہے)۔

۱۰۳۔ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ○

ترجمہ

۱۰۳۔ اور جب نماز ختم کر لو تو خدا کو کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور پہلو پر لیٹے ہوئے یاد کرو اور جس وقت تمھیں اطمینان ہو جائے (اور خوف کی کیفیّت ختم ہو جائے) تو نماز کو (معمول کے مطابق) انجام دو کیونکہ نماز مومنین کے لیے ثابت اور معیّن فریضہ ہے۔

تفسیر

فریضۂ نماز کی اہمیّت

گذشتہ آیت میں نماز خوف کا حکم دیا گیا اور یہ بتایا گیا ہے کہ حالتِ جنگ میں بھی نماز قائم کرنا لازم ہے اس کے بعد اب اس آیت میں فرماتا ہے نماز کی ادائیگی کے بعد خدا کو بھول نہ جاؤ بلکہ کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے اور پہلو پر لیٹے ہوئے (بھی)

لہ "قیام" (یعنی کھڑا ہونا) یہاں مصدری معنی رکھتا ہے اور قائم کی جمع بھی ہے (یعنی کھڑے ہونے والے) اور "قعود" بھی اسی طرح مصدر اور جمع دونوں معانی کے لیے ہے اوپر والی آیت میں دونوں معانی کا احتمال ہے۔

Marfat.com

یاد خدا میں رہو اور اس سے مدد طلب کرو (فاذا قضیتم الصلوٰۃ فاذکروا اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبکم) حالت قیام و قعود اور پہلو پر لیٹنے کے وقت یاد خدا سے مراد ممکن ہے کہ وہی استراحت کے اوقات ہوں جو میدانِ جنگ میں وقفوں میں ہوتے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنگ کے مختلف حالات کے معنی میں ہو۔ جبکہ مجاہدین کبھی کھڑے ہو کر کبھی بیٹھ کر اور کبھی پہلو کے بل لیٹ کر مختلف جنگی ہتھیاروں کے ساتھ تیر اندازی کرتے ہیں۔

حقیقت میں اوپر والی آیت ایک اہم اسلامی حکم کی طرف اشارہ ہے کہ اوقات معینہ میں نماز پڑھنے کا یہ معنی نہیں ہے کہ باقی حالات میں انسان خدا سے غافل رہے نماز ایک انضباطی حکم ہے جو پروردگار کی طرف متوجہ ہونے کی روح انسان میں زندہ کرتا ہے اور ہو سکتا ہے اس سے نمازوں کے درمیانی فاصلوں میں دل میں یاد خدا باقی رہنے کی طرف اشارہ ہو چاہے میدان جنگ میں ہو اور چاہے میدانِ جنگ کے علاوہ کہیں ہو متعدد روایات میں اس آیت کو بیماروں کے نماز پڑھنے کی کیفیت کے بارے میں قرار دیا گیا ہے۔

اگر ان میں توانائی ہو تو کھڑے ہو کر ورنہ بیٹھ کر اور اگر ایسا بھی نہیں کر سکتے تو پہلو کے بل لیٹ کر نماز ادا کریں۔ یہ تفسیر حقیقت میں آیت کے معنی کے ایک مفہوم کی نشاندہی اور وسعتِ معنی کی مظہر ہے اور آیت اس موقع کے لیے مخصوص نہیں ہے [1]

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ نماز خوف کا حکم ایک استثنائی حکم ہے اور جب حالتِ خوف ختم ہو جائے تو پھر نماز عمومی صورت میں ادا کی جائے (فاذا اطمأننتم فاقیموا الصلوٰۃ) اور آخر میں نماز کے بارے میں تاکید وقت کی گئی ہے اور وہ اس طرح ہے، کیونکہ نماز مومنین کے لیے ایک ثابت رہنے والا اور متغیر نہ ہونے والا فریضہ ہے (ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا) لفظ "موقوت" "وقت" کے مادہ سے ہے اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر تم دیکھتے ہو کہ میدانِ جنگ جیسی جگہ پر بھی مسلمانوں کو چاہیے کہ اس فریضہ (نماز) کو انجام دیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کے اوقات معین ہیں کہ جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا [2]

لیکن متعدد روایات میں جو اس آیت کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں موقوت کی ثابت اور واجب کے معنی میں تفسیر ہوئی ہے جو کہ آیت کے مفہوم کے ساتھ بھی مطابقت رکھتی ہے اور اس کا نتیجہ تقریباً پہلے معنی جیسا ہی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ہم نماز کے فلسفہ، اہمیت اور اس کے تربیتی اثرات کے منکر نہیں ہیں لیکن کیا ضروری ہے کہ معین اوقات ہی میں اسے ادا کیا جائے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ ہر شخص فرصت اور روحانی آمادگی کے وقت

---

[1] ان روایات پر مطلع ہونے کے لیے نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۴۵ کی طرف رجوع کریں۔

[2] کنز العرفان جلد اول ص ۹۵ میں اس معنی کی تائید کی گئی ہے اور تبیان اور مجمع البیان میں ایک قول کے عنوان سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

یہ ذمہ داری ادا کرے۔

تجربہ شاہد ہے کہ تربیتی مسائل اگر انضباط اور معین شرائط کے ماتحت نہ رکھے جائیں تو کچھ لوگ انھیں فراموش کر دیتے ہیں اور ان کی بنیاد اور اساس متزلزل ہو جاتی ہے لہذا اس قسم کے مسائل میں یقیناً معین اوقات اور سخت انضباط رکھا جانا چاہیے تاکہ کوئی شخص بھی انھیں ترک کرنے میں کوئی عذر اور بہانہ نہ کر سکے خصوصی طور پر ان عبادات کا معین اوقات میں سرانجام پانا اور خاص طور پر اجتماعی شکل میں ایک شکوہ اور عظمت کا حامل ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور حقیقت میں یہ چیز انسان سازی کے لیے ایک اہم درس اور تکنیک ہے۔

۱۰۴۔ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ○

ترجمہ

۱۰۴۔ اور دشمن کا تعاقب کرنے میں سستی نہ کرو (کیونکہ) اگر تمھیں درد و رنج پہنچتا ہے تو انھیں بھی تمھاری طرح رنج و تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن تم (پھر بھی) خدا سے امید رکھتے ہو اور وہ نہیں رکھتے اور خدا دانا اور حکیم ہے۔

شان نزول

ہر ہتھیار کے مقابلے میں اس جیسا ہتھیار

ابن عباس اور کچھ دوسرے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جنگ اُحد کے دردناک حوادث کے بعد پیغمبر اکرمؐ کوہ احد کی چوٹی پر تشریف لے گئے اور ابوسفیان بھی پہاڑ پر چڑھ گیا اور فاتحانہ لہجے میں پکار کر کہنے لگا "اے محمد! ایک دن ہم کامیاب ہوئے اور دوسرے دن تم۔ یعنی ہماری یہ کامیابی اس شکست کے مقابلہ میں ہے جو ہمیں جنگ بدر میں ہوئی تھی۔ پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں سے فرمایا: فوراً اسے جواب دو (گویا ابوسفیان پر آپ ثابت کر رہے تھے کہ میرے مکتب میں تربیت پانے والے بہت باخبر و آگاہ ہیں) مسلمانوں نے کہا ہماری اور تمھاری کیفیت ہرگز ایک جیسی نہیں ہے ہمارے شہید بہشت میں ہیں جبکہ تمھارے مقتول جہنم میں ہیں۔ ابوسفیان نے پکار کر یہ جملہ فخریہ نعرے کے طور پر کہا۔

"لنا العزى و لا عزى لكم"

"ہم بہت بڑا "عزیٰ" بت رکھتے ہیں اور تمھارے پاس وہ بھی نہیں۔"

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تم بھی اس کے جواب میں کہو۔

"الله مولانا و لا مولى لكم"

Marfat.com

"ہمارا ولی و سرپرست خدا ہے اور ہمارا تکیہ خدا پر ہے اور تمھاری کوئی سرپرست نہیں، تمھاری کوئی تکیہ گاہ نہیں"۔

ابوسفیان نے جب اپنے آپ کو اس زندہ اسلامی شعار کے مقابلے میں بے بس اور کمزور پایا تو بت "عزیٰ" کو چھوڑ کر بت "ہبل" کے دامن کو جا پکڑا اور پکارا۔

"اعل هبل"

"ہبل سربلند ہو"

پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ اس جاہلانہ شعار کو مضبوط اور پختہ شعار کے ساتھ شکست دو اور کہو۔

"الله اعلیٰ و اجل"

"خدا برتر و بالاتر ہے"۔

ابوسفیان کو جب اپنے ان مختلف شعار سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو اس نے پکار کر کہا ہماری وعدہ گاہ "بدر صغریٰ" ہے۔

مسلمان میدان جنگ سے بہت سے زخم لے کر پلٹے وہ اُحد کے دردناک حوادث پر بہت دکھی تھے اسی وقت اوپر والی آیت نازل ہوئی جس میں انھیں بیدار کیا گیا کہ وہ مشرکین کا تعاقب کرنے میں کوتاہی نہ کریں اور اس دردناک واقعہ سے پریشان نہ ہوں۔ مسلمان اسی حالت میں دشمن کا پیچھا کرنے اٹھ کھڑے ہوئے اور جب اس کی اطلاع مشرکین کو پہنچی تو وہ بڑی تیزی کے ساتھ مدینہ سے دور نکل گئے اور مکہ کی طرف پلٹ گئے۔[1]

یہ شان نزول ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دشمن کی کسی تکنیک سے بے خبر نہ ہوں اور ان کی جنگ کے ہر ذریعے کے مقابل چاہے وہ جسمانی جنگ ہو یا نفسیاتی اس سے زیادہ مضبوط اور غلبہ پانے والا ذریعہ اپنائیں۔ دشمنوں کی منطق کے مقابلے میں زیادہ ٹھوس منطق اور ان کے ہتھیار کے مقابلے میں بہتر ہتھیار استعمال کریں۔ یہاں تک کہ ان کے نعرے کے مقابلے میں زیادہ زوردار نعرہ اپنائیں ورنہ واقعات دشمن کے فائدہ میں چلے جائیں گے۔

لہٰذا ہمارے زمانے میں بھی مسلمانوں کو جن دردناک حوادث اور وحشت ناک مفاسد نے گھیر رکھا ہے بجائے اس کے کہ افسوس کرتے رہیں فعالیت سے کام لیں غلط کتابوں اور مطبوعات کے مقابلے میں صحیح کتب اور مطبوعات فراہم کریں۔ دشمنوں کے پراپیگنڈہ کے جدید ذرائع کے مقابلے میں آج کے جدید ترین تبلیغاتی وسائل کو کام میں لائیں اور غلط مراکز کے مقابلے میں تفریح کے صحیح ذرائع اپنے نوجوانوں کے لیے فراہم کریں اور ان کے منصوبوں، سازشوں اور حیلوں کے مقابلے میں موجودہ زمانے کی مناسبت سے جامع اسلامی منصوبے پیش کریں جو مختلف سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی نظریات رکھنے والوں کا مقابلہ کرسکیں۔ صرف انھی طریقوں سے ہم اپنے وجود کا تحفظ کرسکتے ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم قیادت کرنے والے طبقہ کی حیثیت سے آج کی دنیا میں آگے بڑھیں۔

---

[1] تبیان جلد سوم صفحہ ۲۱۴، مجمع البیان جلد سوم صفحہ ۱۰۵

Marfat.com

تفسیر

جہاد اور ہجرت سے متعلق آیات کے بعد زیر نظر آیت میں مسلمانوں میں وفاداری کی روح بیدار کرنے کے لیے کہا گیا ہے، دشمن کا تعاقب کرنے میں سستی نہ کرو (ولا تھنوا فی ابتغآء القوم) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ کبھی بھی سخت ترین دشمن کے مقابلے میں دفاعی حالت کو نہ اپناؤ بلکہ ہمیشہ اس قسم کے افراد کے مقابلے میں یورش کرکے اور بڑھ کر حملہ کرکے اپنی حفاظت کرو کیونکہ نفسیاتی طور پر یہ حربہ دشمن کے حوصلے پست کرنے کے لیے بہت مؤثر ہے جس طرح اُحد کے واقعہ میں شدید شکست کے بعد اس روش پر چل کر فائدہ اٹھایا گیا وہ دشمنانِ اسلام جنھوں نے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد میدان جنگ چھوڑ دیا اور راستے میں میدان جنگ کی طرف پلٹنے کی جو فکر ان میں پیدا ہوئی وہ ان کے دماغ سے نکل گئی اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ مدینہ سے دور ہٹ گئے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک زندہ اور واضح استدلال اس حکم کے لیے بیان کرتے ہوئے فرمایا، تم کیوں کاہل بنتے ہو حالانکہ اگر تم میدان جہاد میں درد و رنج میں گرفتار ہوئے ہو تو تمھارے دشمن بھی پریشانیوں میں مبتلا تھے لیکن اس میں فرق یہ ہے کہ تھیں تو پھر بھی پروردگار عالم کی زیادہ سے زیادہ مدد و رحمت کی امید تھی لیکن وہ تو اس امید سے بھی محروم تھے (ان تکونوا تألمون فانھم یألمون کما تألمون وترجون من اللہ مالا یرجون) اور آخر میں زیادہ تاکید کے لیے فرماتا ہے :

یہ بات نہ بھولنا کہ تمھاری یہ تمام پریشانیاں، تکلیفیں، زحمتیں اور بعض اوقات کاہلی اور چشم پوشیاں خدا کی نظر سے مخفی نہیں (وکان اللہ علیما حکیما) لہٰذا ان سب کا نتیجہ تم دیکھ لوگے۔

۱۰۵۔ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنۡ لِّـلۡخَآٮِٕنِيۡنَ خَصِيۡمًا ۙ

۱۰۶۔ وَّاسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۚ

ترجمہ

۱۰۵۔ ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ نازل کی تاکہ اس کے ساتھ جو خدا نے تجھے علم دیا ہے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور خیانت کرنے والوں کے حامی نہ ہو۔

۱۰۶۔ اور خدا سے مغفرت طلب کرو کہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

شانِ نزول

زیر نظر آیات کی شانِ نزول کے بارے میں ایک طویل واقعہ نقل ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

Marfat.com

قبیلہ بنی ابیرق نسبتاً ایک مشہور قبیلہ تھا اس قبیلہ کے تین بھائی بشر، بشیر، مبشر نامی تھے۔ بشیر ایک مسلمان رفاعہ کے گھر میں داخل ہوا اور تلوار، زرہ اور کچھ خوراک چوری کر لیں۔ اس کے بھتیجے "قتادہ" نے جو مجاہدین بدر میں سے تھا یہ واقعہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں بیان کیا لیکن ان تین بھائیوں نے اپنے ایک پڑوسی صاحب ایمان مسلمان لبید پر اس معاملے میں تہمت لگائی۔ لبید اس ناروا تہمت سے بہت زیادہ برہم ہوا اور تلوار نکال کر اس کے پاس آیا اور چیخ کر کہا: تم مجھ پر چوری کی تہمت لگاتے ہو، حالانکہ اس الزام کے زیادہ اہل تم ہو اور تم وہی منافق ہو جو پیغمبر خدا کی ہجو کہتے تھے اور پھر ہجو کے اشعار کو قریش سے منسوب کر دیتے تھے یا تو اس تہمت کو جو تم نے مجھ پر لگائی ہے ثابت کرو ورنہ میں اپنی تلوار تمھیں گھونپ دوں گا چور کے بھائیوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو لبید سے نرمی کا سلوک کیا لیکن جب انھیں یہ خبر ملی کہ واقعہ قتادہ کے ذریعے پیغمبر اکرمؐ کے گوش گزار ہو چکا ہے تو وہ اپنے قبیلے کے ایک خطیب کے پاس گئے کہ وہ چند افراد کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں جائے اور قیافہ سے حقیقی چوروں کو بری الذمہ قرار دے اور کہے کہ قتادہ نے جھوٹا الزام لگایا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے (ظاہر پر عمل کرنے کے فریضہ) کے مطابق اس گروہ کی شہادت کو قبول کر لیا اور قتادہ کو سزا کا مستحق قرار دیا، قتادہ جو بے گناہ تھا اس سے بہت پریشان ہوا اور اپنے چچا کے پاس لوٹ کر گیا اور بہت زیادہ افسوس کے ساتھ واقعہ بیان کیا تو اس کے چچا نے اس کی دلجوئی کی اور کہا کہ پریشان نہ ہو خدا ہمارا نگہبان ہے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس بے گناہ شخص کو بری الذمہ قرار دیا اور حقیقی خیانت کرنے والوں کی شدید سرزنش کی۔

اس آیت کی ایک اور شان نزول (بھی) نقل ہوئی ہے کہ ایک انصاری کی زرہ کسی جنگ میں چوری ہو گئی۔ شک بنی ابیرق قبیلے کے ایک شخص پر تھا۔ چور کو جب خطرہ نظر آیا تو اس نے وہ زرہ ایک یہودی کے گھر میں پھینک دی اور اپنے قبیلہ والوں سے کہا کہ پیغمبر اکرمؐ کے سامنے اس کی صفائی دیں اور کہیں کہ زرہ تو یہودی کے گھر میں ہے اس لیے وہ بری الذمہ ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے جب یہ صورت دیکھی تو ظاہری طور پر اسے بری الذمہ قرار دیا اور یہودی کے خلاف فیصلہ دیا اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور حقیقت کو واضح کیا۔

تفسیر

خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرو

خدا ان آیات میں پہلے تو پیغمبر اکرمؐ کو وصیت کرتا ہے کہ اس آسمانی کتاب کو بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان حق و انصاف کے اصول جاری ہوں، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے تاکہ اس کے ذریعے خدا نے تجھے جو علم دیا ہے لوگوں کے درمیان فیصلے کرو (انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ) اس کے بعد کہتا ہے کبھی بھی خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرو (ولا تکن للخائنین خصیما) اگرچہ بظاہر روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے لیکن اس میں شک و شبہ نہیں کہ یہ ایک عمومی حکم ہے جو تمام قاضیوں اور فیصلہ کرنے والوں کے لیے ہے اس بنا پر اس قسم کے خطاب کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ممکن ہے کہ اس قسم کا معاملہ پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ پیش آیا ہے کیونکہ اس مذکورہ حکم کا

Marfat.com

تعلق تمام افراد سے ہے۔

بعد والی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو بارگاہِ خداوندی سے طلب مغفرت کے لیے کہا گیا ہے (واستغفر اللّٰہ) کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے (ان اللّٰہ کان غفورًا رحیمًا)۔

یہ کہ یہاں استغفار کس لیے ہے اس میں کئی احتمال ہیں:

پہلا یہ کہ استغفار اس ترک اولیٰ کی بنا پر ہے جو فیصلہ میں جلدی کرنے کی وجہ سے آیات کی شانِ نزول کے بارے میں آیا ہے یعنی اگرچہ وہی اعتراف کی نوعیت اور طرفین کی گواہی تمہارے فیصلہ کرنے کے لیے کافی تھی لیکن بہتر یہ تھا کہ پھر بھی اس معاملے میں مزید تحقیق کی جاتی

دوسرا یہ کہ پیغمبر اکرمؐ نے اسی شانِ نزول کے متعلق اسلام کے قضائی قوانین کے مطابق فیصلہ کیا اور چونکہ خیانت کرنے والوں کی سند اور ثبوت ظاہری طور پر زیادہ مستحکم تھے لہٰذا انھیں حق بجانب قرار دیا گیا پھر حق کے سامنے آجانے اور حق داروں کو حق مل جانے کے بعد حکم دیتا ہے کہ خدا سے مغفرت طلب کرو نہ کہ اس بنا پر کہ کوئی گناہ سرزد ہوا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ بعض لوگوں کی سازش کی وجہ سے ایک مسلمان کا حق سلب ہو رہا تھا (یعنی استغفار حکمِ واقعی ہے نہ کہ حکم ظاہری)۔

یہ احتمال بھی بیان ہوا ہے کہ یہاں استغفار کا حکم طرفینِ دعویٰ کو دیا گیا ہے جنھوں نے دعویٰ پیش کیا اور پھر اس سلسلے میں کئی ایک غلط گواہیاں دیں۔ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں منقول ہوا ہے آپ نے فرمایا ـــــ:

انما انا بشر و انکم تختصمون الی ولعل بعضکم یکون الحن بحجته من بعض فاقضی بنحو ما اسمع فمن قضیت له من حق اخیه شیئا فلا یاخذه فانما اقطع له و قطعة من النار۔

میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں (اور ظاہری امور پر فیصلے کرنے پر مامور ہوں) شاید تم میں سے بعض وہی دلیل بیان کرتے وقت بعض دوسروں سے زیادہ قوی ہوں اور میں بھی اسی دلیل کی بنا پر فیصلہ کروں گا باوجود اس کے جان لو کہ میرا فیصلہ جو طرفین کے دلائل کے سامنے آنے پر صادر ہوتا ہے وہ واقعی حق کو نہیں بدل سکتا لہٰذا اگر میں کسی کے حق میں (ظاہر کے مطابق) فیصلہ کر دوں اور دوسرے کا حق اسے دے دوں تو میں جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا اسے دے رہا ہوں اسے چاہیے کہ وہ اس سے بچے اور نہ لے[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ظاہر کے مطابق اور دعویٰ کرنے والے طرفین کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کریں۔ البتہ اس قسم کے فیصلوں سے عام طور پر حق دار کو حق مل جاتا ہے لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات ظاہراً دلیل اور گواہوں کی گواہی واقع کے مطابق نہ ہو تو یہاں خیال کرنا چاہیے کہ فیصلہ کرنے والے کا حکم واقع کو نہیں بدل سکتا اور اس سے حق، باطل اور باطل حق نہیں ہو سکتا۔

---

[1] المنار ج ۵ ص ۳۹۴ منقول از صحیح بخاری و صحیح مسلم

[2] پہلا احتمال اور شانِ نزول والی روایات اور اس روایت کا ظہور قواعد مذہب کے خلاف ہے کیونکہ آنحضرت بنصوص قرآن ترک اولیٰ سے بھی معصوم تھے (مترجم)

Marfat.com

۱۰۷۔ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ
خَوَّانًا اَثِيْمًا ○
۱۰۸۔ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ
مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ○
۱۰۹۔ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ
عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ○

ترجمہ

۱۰۷۔ اور جنھوں نے اپنے آپ سے خیانت کی ہے ان کا دفاع نہ کرو، کیونکہ خدا خیانت کرنے والے گنہ گاروں کو دوست نہیں رکھتا۔

۱۰۸۔ وہ اپنے بُرے کاموں کو لوگوں سے چھپاتے ہیں لیکن خدا سے نہیں چھپاتے اور رات کی مجالس میں ایسی باتیں کرتے تھے جن سے خدا راضی نہ تھا خدا ان کے ساتھ تھا اور وہ جو عمل کرتے ہیں خدا اس پر محیط ہے۔

۱۰۹۔ جی ہاں تم تو وہی ہو جنھوں نے اس جہان کی زندگی میں ان کو بچایا لیکن کون ہے جو خدا کے سامنے قیامت کے دن ان کا دفاع کرے گا یا کون ہے جو ان کا وکیل اور حامی ہوگا۔

تفسیر

خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرنے کے احکامات کے بعد ان آیات میں اس سلسلہ کو یوں جاری رکھا گیا ہے، کسی وقت بھی خیانت کرنے والوں کی اور ان کی جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں، حمایت نہ کرو۔ (ولا تجادل عن الذین یختانون انفسھم) کیونکہ خدا خیانت کرنے والے گنہ گاروں کو پسند نہیں کرتا (ان اللہ لا یحب من کان خوانا اثیما)۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ خدا اس آیت میں فرماتا ہے: وہ لوگ جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں، حالانکہ ہم آیت کی شانِ نزول کے مطابق جانتے ہیں کہ انھوں نے دوسروں سے خیانت کی تھی یہ اسی لطیف معنی کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی قرآن نے بارہا یاددھانی کرائی ہے کہ انسان سے جو بھی عمل سرزد ہو اس کے اچھے یا بُرے آثار معنوی ہوں یا مادی ہر ایک سے پہلے خود اس پر

Marfat.com

اثر انداز ہوں گے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اسأتم فلها۔

اگر نیک کام کرتے ہو تو اپنے نفوس کے لیے کرتے ہو اور اگر برائی کرو تو بھی اپنے نفس کے لیے ہے۔ ؎

یا یہ ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی قرآن تائید کرتا ہے اور وہ یہ کہ تمام افراد ایک جسم کے مختلف اعضاء کی طرح ہیں اگر ایک کسی دوسرے کو کوئی تکلیف پہنچاتا ہے تو اس طرح خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ بعینہٖ اس شخص کی طرح جو اپنے ہاتھ سے اپنے منہ پر تھپڑ مارے۔ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ آیت ان افراد کے بارے میں نہیں کہ جو مثلاً ایک ہی دفعہ خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور پھر اس پر پشیمان ہو گئے ہوں کیونکہ ایسے اشخاص کے بارے میں سختی نہیں بلکہ نرمی برتنی چاہیے۔ آیت تو ان افراد کے بارے میں ہے جن کی زندگی کا لائحہ عمل ہی خیانت ہے "یَخْتَانُوْنَ" کے قرینہ سے جو کہ فعل مضارع ہے اور ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے اور "خوّان" کے قرینہ سے بھی جو کہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے "بہت خیانت کرنے والا"۔ اَثِیْمًا کا معنی "گنہ گار" ہے یہ "خوّان" کی تاکید کے طور پر ذکر ہوا ہے۔ گذشتہ آیت میں بھی اسے خائن قرار دیا گیا ہے اور خائن اسم فاعل ہے اور وصفی معنی رکھتا ہے نیز تکرار عمل کی علامت ہے۔ پھر ایسے خیانت کاروں کی سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے انھیں شرم آتی ہے کہ ان کے اعمال کا باطن لوگوں کے سامنے ظاہر ہو لیکن وہ خدا سے تو شرم نہیں کرتے (یستخفون من الناس ولا یستخفون من الله) وہ خدا جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور جس وقت رات کی تاریکی میں وہ خیانت کار سازشیں اور منصوبے بناتے تھے اور وہ باتیں کرتے ہیں کہ جن سے خدا راضی نہیں وہ (خدا) ان کے ساتھ تھا اور وہ ان کے تمام اعمال پر محیط ہے (وھو معھم اذ یبیتون ما لا یرضی من القول وکان الله بما یعملون محیطا) اس کے بعد روئے سخن چور کے قبیلے کے ان افراد کی طرف ہے جنھوں نے اس کا دفاع کیا تھا۔ خدا انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے تعجب ہے کہ تم اس جہان کی زندگی میں تو ان کا دفاع کرتے ہو، لیکن کون ہے جو قیامت کے دن ان کا دفاع کرے یا وکیل بن کر ان کے کام آئے اور ان کی مصیبتوں اور ابتلاؤں کو ختم کرے (ھا انتم ھؤلاء جادلتم عنھم فی الحیوۃ الدنیا فمن یجادل الله عنھم یوم القیامۃ ام من یکون علیھم وکیلا)۔ اس وجہ سے تمھاری طرف سے ان کا دفاع معمولی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ دائمی زندگی میں خدا کے سامنے ان کا کوئی دفاع کرنے والا نہیں ہے۔

حقیقت میں اوپر والی تین آیات میں پہلے تو پیغمبر اسلامؐ اور سب قاضیوں کو حق کی وصیت کی گئی ہے کہ وہ مکمل طور پر نگرانی اور دھیان رکھیں کہ کچھ لوگ حیلہ سازی اور جھوٹے گواہوں کے ذریعے دوسروں کے حقوق پائمال نہ کریں پھر خیانت کرنیوالوں اور بعد میں ان کا دفاع کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اس جہان اور دوسرے جہان میں اپنے اعمال کے بُرے نتائج پر نظر رکھیں۔

؎ بنی اسرائیل ، ۷

Marfat.com

اور یہ بلاغت قرآن کا ایک راز ہے کہ ہر واقعہ میں چاہے وہ ظاہراً جتنا بھی معمولی اور چھوٹا ہو وہ ایک ذرہ بھر یا تھوڑے سے اناج کے گرد گھومتا ہو، یا اس میں ایک یہودی اور دشمن اسلام کا ہاتھ ہو اس کے تمام پہلوؤں پر کھوج اور تحقیق کرتے ہوئے پوری توجہ دلاتا ہے اور ہر موقع پر خطرہ سے آگاہ کرتا ہے۔ خدا کے عظیم پیغمبر سے لے کر کہ جس کا دامن عصمت کی بنا پر ہر قسم کے گناہ سے پاک ہے خیانت پیشہ گنہگار افراد اور ان لوگوں تک جو رشتہ داری کے تعصبات کی وجہ سے اس قسم کے افراد کا دفاع کرتے ہیں ہر ایک پر اس کی مناسبت سے بحث کرتا ہے۔

۱۱۰۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

۱۱۱۔ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

۱۱۲۔ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ○ ع

ترجمہ

۱۱۰۔ جو شخص کوئی برا کام کرے یا اپنے اوپر ظلم کرے پھر خدا سے مغفرت طلب کرے تو وہ خدا کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا۔

۱۱۱۔ اور جو کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے اور خدا دانا و حکیم ہے۔

۱۱۲۔ جو شخص غلطی یا گناہ کا مرتکب ہو پھر بے گناہ پر الزام دھرے اس نے بہتان اور واضح گناہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر لاد لیا ہے۔

تفسیر

ان تین آیات میں خیانت اور تہمت سے متعلق بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے۔ تین عمومی احکامات بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ پہلے تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ توبہ کی راہ بدکار لوگوں کے لیے بہرحال کھلی ہے اور جو شخص اپنے اوپر

Marfat.com

یا کسی دوسرے پر ظلم کرے اور بعد میں حقیقتاً پشیمان ہو اور خدا سے مغفرت طلب کرے اور وہ اس کی تلافی کی کوشش بھی کرے تو وہ خدا کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا (ومن یعمل سوءا او یظلم نفسہ ثم یستغفر اللہ یجد اللہ غفورًا رحیمًا)۔ غور کرنا چاہیے کہ آیت میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں ایک "سُوء" اور دوسری کسی پر ظلم ۔ قرینہ مقابلہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور "سُوء" کے اصل لغوی معنی (دوسرے کو نقصان پہنچانا) سے اسطرح معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کا گناہ جس سے انسان دوسرے کو نقصان پہنچائے یا اپنے آپ کو وہ حقیقی توبہ اور تلافی کی صورت میں قابل بخشش ہے ۔

ضمنی طور پر یجد اللہ غفورًا رحیمًا (خدا کو بخشنے والا، مہربان پائے گا) سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی توبہ یہ اثر رکھتی ہے کہ انسان اپنے نفس کے اندر ہی اس کا نتیجہ پالیتا ہے ایک طرف خدا کے غفور ہونے کے تصور سے گناہ کا پریشان کن اثر زائل ہو جاتا ہے اور دوسری طرف وہ محسوس کرتا ہے کہ معصیت کے سبب وہ رحمت والطاف الٰہی سے دور ہو گیا تھا اور اب اس کی رحیمیت کی وجہ سے دوریاں ختم ہو گئی ہیں اور وہ خدا کے نزدیک ہو گیا ہے ۔

۲۔ دوسری آیت اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ جس کا اجمال گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے کہ" انسان جس گناہ کا مرتکب ہوتا ہے نتیجتہً اس سے اپنے آپ کو ضرور نقصان میں مبتلا کر لیتا ہے (ومن یکسب اثما فانما یکسبہ علی نفسہ) اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے کہ خدا عالم ہے اور بندوں کے اعمال سے باخبر ہے اور وہ حکیم و دانا بھی ہے اور ہر شخص کو اس کے استحقاق کے مطابق سزا و جزا دیتا ہے (وکان اللہ علیمًا حکیمًا)۔

اس طرح گناہ اگرچہ ظاہر میں مختلف ہیں کبھی کسی گناہ کا نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے اور کبھی اس کا نقصان اپنے آپ کو ہوتا ہے۔ لیکن اس کا حقیقی اور آخری نتیجہ بہر حال خود انسان کے اپنی طرف لوٹتا ہے اور گناہ کے بُرے اثرات سب سے پہلے خود انسان کی روح اور نفس میں ظاہر ہوتے ہیں [1]

۳۔ آخری آیت میں بے گناہ افراد پر تہمت لگانے کے گناہ کی شدت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "جو شخص خطا یا گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور اسے کسی بے گناہ کے سر تھوپتا ہے اس نے بہتان باندھا ہے اور واضح گناہ کا ارتکاب کیا ہے (ومن یکسب خطیئۃ او اثما ثم یرم بہ بریئا فقد احتمل بھتانًا واثمًا مبینًا)" اس آیت میں وہ گناہ کہ جن کا انسان مرتکب ہوا ہو اور پھر انھیں دوسرے کے سر تھوپ دے ان کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ۔ ایک خطیئۃ اور دوسرا "اثم" ان دونوں کے درمیان فرق کے سلسلہ میں مفسرین اور اہل لغت میں بہت اختلاف ہے جو معنی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "خطیئۃ" "خطاء" سے ہے جو دراصل ان گناہوں اور لغزشوں کے معنی میں ہے جو انسان سے قصد اور ارادہ کے بغیر سرزد ہو جائیں اور بعض اوقات ان کا کفارہ اور تاوان ادا کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن بتدریج خطیئۃ کے معنی میں

---

[1] شعلۂ اول نصیبِ دامن "آتش زنہ" است ۔ ایں سزائے آں کہ بوسد آستانِ ظلم را ۔ آگ کا پہلا شعلہ جلانے والے کے دامن کو جلاتا ہے ۔ آستانہ ظلم پر بوسہ دینے کی یہی سزا ہے ۔

Marfat.com

وسعت پیدا ہو گئی اور وہ ہر گناہ کے بارے میں استعمال ہونے لگا چاہے وہ عمداً ہو یا بھول کر۔ کیونکہ کسی قسم کا گناہ (چاہے وہ عمداً ہو یا بھول کر) انسان کی روحِ سلیم کے لیے مناسب نہیں ہے اور اگر اس سے سرزد ہو جائے تو حقیقت میں ایک قسم کی لغزش اور خطا ہے جو اس کے مقام و مرتبے کے منافی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خطیئہ کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں عمدی اور غیر عمدی گناہ دونوں شامل ہیں۔ لیکن اثم عموماً عمدی اور اختیاری گناہوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ دراصل اثم ایسی چیز کے معنی میں ہے جو انسان کو کسی کام سے باز رکھے اور چونکہ گناہ انسان کو بھلائی کے اور اچھے کاموں سے دور رکھتے ہیں لہٰذا انھیں "اثم" کہا جاتا ہے۔

ضمناً توجہ کرنی چاہیے کہ آیت میں تہمت کے بارے میں ایک لطیف تعبیر استعمال کی گئی ہے اور وہ یہ کہ گناہ کو تیر کی طرح قرار دیا گیا ہے اور دوسرے کی طرف اس کی نسبت دینے کو تیر ہدف کی طرف چھوڑنے کی طرح قرار دے کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح کسی کی طرف تیر پھینکنا ممکن ہے اسے ختم کر دے، اسی طرح گناہ کے تیر کو بھی کسی ایسے شخص کی طرف چھوڑنا جو گناہ کا مرتکب نہیں ہوا ممکن ہے کہ اس کی عزت اور آبرو کو برباد کر دے جو دراصل اس کے قتل کی طرح ہے۔ واضح ہے اس عمل کا بوجھ ہمیشہ کے لیے ایسے شخص کے کندھے پر باقی رہے گا جس نے تہمت لگائی ہے اور " احتمل" (اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے) یہ لفظ بھی اس ذمہ داری کی اہمیت اور اس کے ہمیشہ قائم رہنے کی طرف اشارہ ہے۔

جُرمِ تہمت

کسی بے گناہ پر تہمت باندھنا بدترین افعال میں سے ہے کہ جس کی اسلام نے شدت سے مذمت کی ہے۔ زیرِ نظر آیت اور متعدد اسلامی روایات جو اس ضمن میں ملتی ہیں اس کے لیے اسلام کا نظریہ واضح کرتی ہیں۔ امام صادقؑ ایک حکیم و دانا سے نقل کرتے ہیں:

البهتان على البرئ اثقل من جبال راسيات

بے گناہ پر بہتان باندھنا عظیم پہاڑوں سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ [1]

بے گناہ افراد پر بہتان باندھنا روح ایمان کے منافی ہے جیسا کہ امام صادقؑ سے منقول ہے:

اذا اتهم المؤمن اخاه انماث الايمان فى قلبه كما ينماث الملح فى الماء

جو شخص اپنے مومن بھائی پر تہمت لگاتا ہے تو ایمان اس کے دل میں اس طرح گھل جاتا ہے جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے [2]

حقیقت میں بہتان اور تہمت، جھوٹ کی بدترین اقسام میں سے ہے کیونکہ اس میں جھوٹ کے عظیم مفاسد اور غیبت کے نقصانات بھی شامل ہیں اور یہ ظلم و ستم کی بدترین قسم بھی ہے اس لیے پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد اول مادہ "بہت"

[2] اصولِ کافی جلد ۲ ص ۲۶۹ باب التهمة وسوء الظن

Marfat.com

من بهت مؤمنا او مؤمنة او قال فيهما ما ليس فيه اقامه الله تعالى يوم القيٰمة على قل من نار حتى يخرج مما قاله .

جو شخص کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان باندھے یا ان کے بارے میں کوئی ایسی بات کہے جو ان میں نہ ہو تو خداوند عالم اسے قیامت کے دن آگ کے ایک ٹیلے پر کھڑا کر دے گا۔ یہاں تک کہ وہ اس بات سے بری الذمہ ہو جائے جو اس نے کہی ہے۔[1]

حقیقت میں اس گھٹیا اور بزدلانہ کام کے رائج ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کا نظم و نسق اور اجتماعی انصاف برباد ہو جاتا ہے حق اور باطل آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں بے گناہ افراد گرفتارِ بلا ہو جاتے ہیں گنہ گار افراد بچے رہتے ہیں اور باہمی اعتماد ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

١١٣۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ○

ترجمہ

١١٣۔ اگر خدا کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ وہ تمہیں گمراہ کر دے، لیکن وہ اپنے سوا کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے اور وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور خدا نے کتاب و حکمت تم پر نازل کی اور تمہیں اس چیز کی تعلیم دی جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر خدا کا عظیم فضل تھا۔

تفسیر

یہ آیت بنی ابیرق کے حادثہ کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قبل کی چند آیات کی شان نزول میں اس کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔

آیت کہتی ہے، اگر خدا کا فضل و رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتا تو (منافقین یا ان جیسے) بعض لوگ مصمم ارادہ کر چکے

---

[1] سفینۃ البحار جلد اوّل صفحہ ١١١

Marfat.com

تھے کہ تمھیں راہِ حق و عدالت سے منحرف کردیں لیکن لطفِ الٰہی تمھارے شاملِ حال رہا اور اس نے تمھاری حفاظت کی (ولولا فضل اللّٰہ علیک ورحمتہ لھمت طائفۃ منھم ان یضلوک)۔

وہ چاہتے تھے کہ ایک بے گناہ شخص پر تہمت لگائیں اور پھر پیغمبرؐ کو اس واقعے میں ملوث کریں تاکہ اس طرح ایک تو پیغمبر اکرمؐ کی اجتماعی اور معنوی حیثیت کو نقصان پہنچے اور دوسرا ایک بے گناہ مسلمان کے ذریعے اپنی بری اغراض پوری کرسکیں لیکن وہ خدا جو اپنے پیغمبرؐ کا محافظ ہے اس نے ان کے منصوبوں کو نقش برآب کردیا۔

بعض نے اس آیت کی ایک اور شانِ نزول بھی ذکر کی ہے، وہ یہ ہے کہ:

قبیلہ بنی ثقیف کا ایک وفد پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ہم دو شرطوں کے ساتھ آپ کی بیعت کے لیے تیار ہیں پہلی یہ کہ ہم اپنے بت اپنے ہاتھ سے نہیں توڑیں گے اور دوسری یہ کہ ہمیں اجازت دیں کہ ہم مزید ایک سال تک عزیٰ بُت کی پرستش کرتے رہیں۔

خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا کہ ان تجاویز کے لیے کوئی میلان ظاہر نہ کریں۔

اسی ضمن میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں پیغمبر اکرمؐ سے کہا گیا کہ لطفِ خدا آپؐ کو ان وسوسوں سے محفوظ رکھے گا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے، یہ لوگ صرف اپنے آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے (وما یضلون الا انفسھم وما یضرونک من شیء)۔

آخر میں گمراہی، خطا اور گناہ سے پیغمبرؐ کے محفوظ رہنے اور پیغمبرؐ کی معنویت کی علت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، آپ پر خدا نے کتاب و حکمت نازل کی اور جو آپ نہیں جانتے تھے آپ کو اس کی تعلیم دی (وانزل اللّٰہ علیک الکتاب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم)۔

بعد ازاں فرماتا ہے، آپ پر اللہ کا بہت ہی زیادہ فضل و کرم تھا (وکان فضل اللّٰہ علیک عظیمًا)۔

انبیاء کا سرچشمۂ عصمت

مندرجہ بالا آیت ان آیات میں سے ہے جو نبی کے خطا، اشتباہ اور گناہ سے محفوظ ہونے کی نشاندہی کرتی ہیں ارشاد ہوتا ہے: اگر خدا کی امداد تمھارے شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ تمھیں گمراہ کردیتے لیکن امدادِ الٰہی کی وجہ سے وہ تمھیں گمراہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور اس سلسلے میں تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

اس طرح سے دراصل خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو خطا اور گناہ سے محفوظ رکھا ہے تاکہ:

—— پیغمبر امت کے لیے نمونۂ عمل بن سکے اور نیکیوں اور بھلائیوں کے لیے امت کے واسطے ایک معیار قرار پاسکے۔

—— ایک عظیم رہبر کی حیثیت سے لغزشوں کے المناک انجام اور نتیجے سے محفوظ رہ سکے۔ یوں اُمت بھی طاعتِ پیغمبر میں سرگردانی سے مامون رہے اور اطاعت و عدم اطاعت کے تضاد کا شکار نہ ہو جائے۔

Marfat.com

—— لوگوں کو پیغمبر پر کامل اعتماد ہو سکے کیونکہ کامل اعتماد خدائی رہبری کی پہلی شرط ہے۔

آیت میں مسئلہ عصمت کی ایک بنیادی دلیل اجمالی طور پر بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے پیغمبر کو علوم تعلیم فرمائے جن کی وجہ سے وہ گناہ اور خطا سے بالکل مامون و محفوظ ہو گئے ہیں کیونکہ علم و دانش (جب اپنے آخری مرحلے کو پہنچ جائے تو) موجب عصمت ہوتا ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر ایسے پانی کو ہرگز نہیں پی سکتا جس میں ملیریا اور دیگر بیسیوں بیماریوں کے جراثیم موجود ہوں اور جنھیں وہ خود لیبارٹری میں دیکھ چکا ہو اور ان کے ہولناک اثرات سے بھی آگاہ ہو یعنی اس کا علم اسے ایسا عمل کرنے سے روکتا ہے جبکہ جہالت میں ممکن ہے وہ ایسا کام کر جاتا۔ اس بنا پر جو شخص وحی الٰہی اور پروردگار کی تعلیم کے ذریعے مختلف مسائل کے بارے میں مکمل آگاہی رکھتا ہو وہ لغزش و اشتباہ کا شکار ہوتا ہے نہ گمراہی و گناہ میں پڑتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ پیغمبر گناہ نہ کرنے پر مجبور ہے بلکہ پیغمبر کو خدا کی طرف سے علم تو ہوتا ہے لیکن وہ اس سے مجبور نہیں ہو جاتا۔ یعنی پیغمبر کبھی اپنے علم پر عمل کرنے پر مجبور نہیں ہوتا بلکہ اپنے اختیار سے اس علم پر عمل کرتا ہے جیسے مذکورہ مثال میں ڈاکٹر اس آلودہ پانی کی کیفیت سے آگاہی کے باوجود اسے نہ پینے پر مجبور نہیں ہے بلکہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے اسے نہیں پیتا۔

اور اگر کہا جائے کہ پیغمبر کے لیے یہ فضل الٰہی کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا رہبری کی اہم اور بھاری ذمہ داری کی بنا پر ہے جو ان کے کندھے پر رکھی گئی ہے اور دوسروں کے دوش پر نہیں ہے کیونکہ خدا جتنی کسی پر مسئولیت اور ذمہ داری ڈالتا ہے اتنی ہی اسے توانائی اور قدرت عطا کرتا ہے (غور کیجیے گا)۔

۱۱۴۔ لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ○

ترجمہ

۱۱۴۔ ان کی بہت سی سرگوشیوں (اور خفیہ میٹنگوں) میں خیر و سود مندی نہیں ہے مگر یہ کہ کوئی شخص (اس طریقے سے) دوسروں کی مدد، کوئی نیک کام یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی کوشش کرے اور جو شخص رضائے الٰہی کے لیے یہ سب کچھ کرے تو اسے ہم عظیم اجر دیں گے۔

—— ۰:۰ ——

Marfat.com

تفسیر

سرگوشیاں

گذشتہ آیات میں بعض منافقین یا ان جیسے لوگوں کے راتوں کے مخفی اور شیطانی جلسوں اور میٹنگوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اب اس آیت میں "نجویٰ" کے زیر عنوان ذرا تفصیل سے بات کی گئی ہے۔

'نجویٰ' کا معنی صرف کان میں باتیں کرنا یا سرگوشی ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی مخفی اور پوشیدہ میٹنگوں کو بھی 'نجویٰ' کہتے ہیں کیونکہ اصل میں 'نجویٰ'، 'نجوۃ' (بروزن دفعہ) کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے اونچی زمین۔ بلند زمینیں چونکہ اپنے اطراف سے جدا ہوتی ہیں اور خفیہ میٹنگیں اور سرگوشیاں بھی اطراف والوں سے جدا ہوتی ہیں لہٰذا انھیں 'نجویٰ' کہتے ہیں۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سب الفاظ 'نجات' کے مادہ سے ہیں جس کا معنی ہے 'رہائی' اور کیونکہ ایک بلند جگہ سیلاب کے حملے سے نجات ہوتی ہے اور خفیہ میٹنگ اور سرگوشی بھی دوسروں کی اطلاع سے دور ہوتی ہے اس لیے اس کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

بہرحال آیت کہتی ہے، ان کی زیادہ تر خفیہ میٹنگیں جو شیطانی سازشوں اور منصوبوں کے تحت منعقد ہوتی ہیں ان میں کوئی بھلائی اور فائدہ نہیں ہے (لا خیر فی کثیر من نجوٰھم)۔

اس کے بعد اس لیے کہ کہیں یہ گمان نہ ہو کہ ہر طرح کی سرگوشی اور مخفی میٹنگ مذموم و ممنوع ہے ایک کلی قانون میں استثنائی صورت کے مواقع بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے؛ مگر یہ کہ کوئی شخص اس کے ذریعے صدقہ کی وصیت کرتا ہو، دوسروں کی مدد کا اقدام کرتا ہو، نیک کام انجام دیتا ہو، یا لوگوں کے درمیان صلح کرواتا ہو (الا من امر بصدقۃ او معروف او اصلاح بین الناس)۔

ایسی سرگوشیاں اور میٹنگیں اگر ریاکاری اور تظاہر کے لیے نہ ہوں بلکہ ان کا مقصد رضائے پروردگار ہو تو خدا ان کیلیے اجر عظیم مقرر فرمائے گا (ومن یفعل ذٰلک ابتغاء مرضات اللہ فسوف نؤتیہ اجرًا عظیمًا)

اصولی طور پر سرگوشیوں، کانا پھوسیوں اور خفیہ میٹنگوں کو قرآن نے ایک شیطانی عمل قرار دیا ہے؛

"انما النجوٰی من الشیطان"

یعنی۔ 'نجویٰ' شیطان کی طرف سے ہے (مجادلہ — ۱۰)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا عمل عموماً غلط کاموں کے لیے ہوتا ہے چونکہ نیک، مفید اور مثبت کاموں کی انجام دہی کیلیے عموماً کوئی خفیہ اور پوشیدہ چیز نہیں ہوتی ہاں البتہ بعض اوقات خلاف معمول حالات کی وجہ سے انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ نیک کاموں کو مثبت طور پر مخفیانہ بجالائے یہ استثنائی صورت بارہا قرآن میں بیان کی گئی ہے مثلاً؛

یاایھا الذین اٰمنوا اذا تناجیتم فلا تتناجوا

Marfat.com

بالاثم والعدوان و معصیۃ الرسول و تناجوا
بالبر و التقوٰی

اے ایمان والو! جب تم سرگوشی یا اخفاء کرو تو گناہ، ظلم اور پیغمبر کی نافرمانی کے لیے نہ ہو اور صرف نیک کاموں اور پرہیزگاری کے لیے "نجویٰ" کرو۔ (مجادلہ - ۹)

بنیادی طور پر اگر سرگوشی اور نجویٰ بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کی موجودگی میں کریں تو یہ دوسروں میں سوئے ظن پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے اور بعض اوقات دوستوں میں بدگمانی پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ضرورت کے بغیر یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے اور قرآن کے مذکورہ حکم کا فلسفہ بھی یہی ہے۔ البتہ کبھی آبروئے انسانی کی حفاظت کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کی چھپ کر مالی امداد کرنا، جسے زیر نظر آیت نے صدقہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔

اسی طرح کبھی امر بالمعروف اگر کھلے بندوں کیا جائے تو دوسرے کی شرمندگی کا باعث ہوتا ہے اور ممکن ہے اس طرح سے وہ نصیحت قبول نہ کرے اور اپنے طریقہ کار پر ہٹ دھرمی دکھائے۔ آیت میں اس کا ذکر "معروف" کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

اس کی ایک اور مثال لوگوں کے درمیان صلح و مصالحت کا موقع ہے۔ بعض اوقات مسائل کو علی الاعلان بیان کیا جائے تو اس سے مصالحت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں طرفین سے محرمانہ اور رازدارانہ طریقے سے گفتگو کرنا چاہیے تاکہ مصالحت کا مقصد پایہ تکمیل کو پہنچ سکے۔

مذکورہ تین مواقع پر اور ایسے ہی دیگر مواقع پر ضرورت اس بات کی ہے کہ مثبت کام "نجویٰ" کے زیر سایہ انجام دیے جائیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مذکورہ تینوں کام "صدقہ" کے مفہوم میں آجاتے ہیں کیونکہ جو شخص امر بالمعروف کرتا ہے وہ علم کی زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور جو صلح و مصالحت کرواتا ہے وہ لوگوں میں موجود اپنے اثر و رسوخ کی زکوٰۃ دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ سے منقول ہے:

ان اللہ فرض علیکم زکوٰۃ جاھکم کما فرض علیکم زکوٰۃ ما ملکت ایدیکم۔

یعنی - خدا نے تم پر فرض اور واجب قرار دیا ہے کہ اپنے اثر و رسوخ اور معاشرتی حیثیت کی زکوٰۃ ادا کرو۔ جیسا کہ اس نے واجب کیا ہے کہ مال کی زکوٰۃ ادا کرو۔[1]

نیز پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

الا ادلک علی صدقۃ یحبھا اللہ و رسولہ تصلح بین

---

[1] نور الثقلین ج ۱، صفحہ ۵۵۰ اور دیگر تفاسیر

Marfat.com

الناس اذا تفاسدوا و تقرب بینھم اذا تباعدوا۔

یعنی —— کیا تجھے ایسے صدقہ سے آگاہ کروں جسے خدا اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں (اور وہ یہ ہے کہ) جب لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں تو ان میں صلح کروا دو اور جب وہ ایک دوسرے سے دور ہو جائیں تو انھیں نزدیک لاؤ۔[1]

۱۱۵۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۱۱۵۔ جو شخص حق واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور راہِ مومنین کے علاوہ کسی راستے کی پیروی کرے تو ہم اسے اسی راہ پر لیے جاتے ہیں جس پر وہ جا رہا ہے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

شانِ نزول

گذشتہ آیات کی شانِ نزول میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بشیر بن ابیرق نے ایک مسلمان کی چوری کرنے کے بعد اس کا الزام ایک بے گناہ شخص پر دھر دیا اور حیلہ سازی سے پیغمبر اکرمؐ کے سامنے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے دیا۔ لیکن مذکورہ آیات کے نزول سے وہ رسوا ہو گیا۔ اس رسوائی کے بعد بجائے اس کے کہ توبہ کرتا اور راہِ حق پر لوٹ آتا، اس نے کفر کا راستہ اختیار کر لیا اور واضح طور پر مسلمانوں سے الگ ہو گیا اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس سلسلے میں اسلام کا ایک عمومی حکم بیان کیا۔

تفسیر

جب انسان کسی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے تو آگاہی کے بعد اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک ہے بازگشت اور توبہ کا راستہ، جس کے ذریعے گناہ کے اثرات دُھل جاتے ہیں اور اس کا تذکرہ گذشتہ چند آیات میں ہو چکا ہے۔ دوسرا ہے ہٹ دھرمی اور عناد کا راستہ، جس کے منحوس نتیجے کے بارے میں زیر بحث آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے،

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۳ صفحہ ۱۹۵۵، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

جو شخص حق آشکار ہونے کے بعد رسول کے سامنے مخالفت اور عناد کا مظاہرہ کرے اور راہ مومنین کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرے تو ہم اسے اسی راستے کی طرف کھینچے لیے جائیں گے جس پر وہ جا رہا ہے اور روز قیامت ہم اُسے جہنم میں ڈالیں گے اور کیسی بُری جگہ اس کے انتظار میں ہے (ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الهدی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ماتولی ونصله جهنم ط وساءت مصیرًا)۔

توجہ رہے کہ "یشاقق"، "شقاق" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے ایسی سوچی سمجھی مخالفت جس میں عداوت و دشمنی ملی ہوئی ہو۔

"من بعد ماتبین له الهدی" (یعنی ۔ ہدایت اور راہ راست واضح ہو جانے کے بعد) ۔۔۔ یہ جملہ بھی اسی معنی کی تاکید کرتا ہے۔ درحقیقت اس سے بہتر انجام ایسے لوگوں کے بس میں ہی نہیں ۔ ان کا انجام اس دنیا میں بھی منحوس اور افسوس ناک ہے اور اُس جہان میں بھی دردناک ہے۔ اِس جہان میں اس طرح جیسے قرآن کہتا ہے کہ وہ دن بدن اپنی غلط راہ میں زیادہ راسخ ہوتے جاتے ہیں وہ بے راہ روی میں جتنا آگے بڑھتے ہیں جادۂ حق سے ان کا زاویہ انحراف اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہ وہ انجام ہے جو انھوں نے اپنے لیے خود اختیار کیا ہے یہ ایسی تعمیر ہے جس کا سنگ بنیاد انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے رکھا ہے لہٰذا اس انجام کے سلسلے میں ان پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا۔ یہ جو ارشاد الٰہی ہے کہ نوله ماتولی ۔۔ یعنی ۔ ہم اسے اسی راہ کی طرف کھینچیں گے جس پر وہ چل رہا ہے ۔ یہ دراصل توفیق معنوی سلب ہونے، تشخیص حق نہ کرنے اور بے راہ روی میں پیش رفت کرنے کی طرف اشارہ ہے۔[1]

نوله ماتولی۔ کے بارے میں ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ "ہم ایسے لوگوں کو انھی جعلی معبودوں کی سرپرستی میں رہنے دیں گے جو انھوں نے اپنے لیے خود منتخب کر رکھے ہیں" "نیز "نصله جهنم" قیامت میں انکے انجام کی طرف اشارہ ہے۔

اجماع کی حُجیّت

فقہ کی چار دلیلوں میں سے ایک اجماع ہے اس کا معنی ہے کہ کسی ایک مسئلے پر اسلامی علماء کا اتفاق رائے۔

اصولِ فقہ میں اجماع کی حُجیّت ثابت کرنے کے لیے مختلف دلیلیں بیان کی گئی ہیں۔ بعض کے نزدیک ان میں سے ایک زیر بحث آیت بھی ہے۔ کیونکہ آیت کہتی ہے کہ جو شخص مومنین کے طریق کے علاوہ کوئی راستہ انتخاب کرے تو وہ دنیا اور آخرت میں بدبخت انجام ہوگا۔ اس لیے جب مومنین کسی مسئلے میں ایک راہ انتخاب کرلیں تو سب کو چاہیے کہ اس کی پیروی کریں۔

لیکن حق یہ ہے کہ زیر نظر آیت کا اجماع کی حجیت سے کوئی تعلق نہیں (اگرچہ ہم اجماع کی حجیت کے قائل ہیں البتہ اس شرط کے ساتھ کہ زیر بحث مسئلے میں قول معصوم بھی موجود ہے یا معصوم ذاتی طور پر اصحاب اجماع میں موجود ہو، اگرچہ ناشناس طور پر ہی موجود ہو، لیکن ایسے اجماع کی حُجیت کی دلیل دراصل سنت اور قولِ معصوم ہی کی حجیت ہے

[1] اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱ (اردو ترجمہ ص ۱۴۰) میں "خدا کی طرف سے ہدایت و گمراہی" کے زیر عنوان تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔

Marfat.com

نہ کہ درج بالا آیت حجیتِ اجماع پر دلیل ہے)۔

آیت کے حجیتِ اجماع پر دلیل نہ ہونے کے بارے میں عرض ہے کہ:

۱۔ جو سزائیں آیت میں معین ہوئی ہیں وہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو جانتے بوجھتے پیغمبر کی مخالفت کریں اور راہِ مومنین کے علاوہ کوئی راستہ منتخب کریں یعنی یہ دونوں امور جمع ہوں تو اس کا نتیجہ وہ ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے اور یہ وہ مخالفت ہے جو علم و آگاہی سے کی جائے اس صورتِ حال کا تو حجیتِ اجماع کے مسئلے سے کوئی ربط نہیں۔ اور یہ امر تنہا اجماع کو حجت قرار نہیں دیتا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ سبیل المومنین سے مراد راہِ توحید، خدا پرستی اور اصل اسلام ہے نہ کہ فقہی فتاویٰ اور فروعی احکام جیسا کہ شانِ نزول کے علاوہ آیت کا ظاہر بھی اس حقیقت پر گواہ ہے اور حقیقت میں راہِ مومنین سے ہٹ کر کوئی راہ اپنانے کا مطلب مخالفتِ پیغمبر کے علاوہ اور کچھ نہیں دونوں باتوں کی بازگشت ایک ہی مفہوم کی طرف ہے یہی وجہ ہے کہ امام باقر علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

> جس وقت حضرت امیرالمومنین علیؑ کوفہ میں تھے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے درخواست کی، آپ ہمارے لیے کسی پیش نماز کا انتخاب کریں (تاکہ ماہِ رمضان کی مستحب نمازیں جو تراویح کے نام سے مشہور ہیں اور حضرت عمر کے زمانے میں جماعت سے پڑھا کرتے تھے اس پیش نماز کے ساتھ پڑھ سکیں) امام علیہ السلام نے اس کام سے منع کیا اور ایسی جماعت سے روکا (کیونکہ نفلی نماز کے لیے جماعت صحیح نہیں ہے) اپنے امام و پیشوا کا قطعی حکم سننے کے باوجود یہ لوگ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے لگے انھوں نے داد و فریاد بلند کی: لوگو! آؤ اس ماہِ رمضان میں آنسو بہاؤ۔
>
> دوستانِ علی میں سے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور عرض کرنے لگے: کچھ لوگ آپ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔
>
> آپ نے فرمایا: انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو جسے چاہیں منتخب کرلیں اور اس (غیر مشروع) جماعت کو بجا لائیں۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: [1] و من یشاقق الرسول ...... الخ

ہم نے جو کچھ آیت کی تفسیر کے بارے میں کہا ہے یہ حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

۱۱۶۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ○

[1] نورالثقلین جلد ۱ صفحہ ۵۵۱

Marfat.com

ترجمہ

۱۱۶- خدا اپنے ساتھ کیے جانے والے شرک کو نہیں بخشتا (لیکن) اس سے کم تر کو جسے چاہے (اور مناسب سمجھے) بخش دیتا ہے اور جو شخص خدا کے لیے شریک کا قائل ہو، وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا ہے۔

تفسیر

شرک ـــــ ناقابلِ معافی گناہ

منافقین اور مرتدین یعنی اسلام قبول کر لینے بعد کفر پر پلٹ جانے والوں سے مربوط مباحث کے بعد، یہاں دوبارہ گناہ شرک کی شدت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسا گناہ ہے جو عفو و بخشش کے قابل نہیں ہے اور اس سے بڑھ کر کسی گناہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ فرق کے ساتھ یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۴۸ میں گذر چکا ہے۔

ایسی تکرار تربیتی مسائل میں لازمۂ بلاغت ہے کیونکہ بنیادی اور اہم مسائل کی فاصلے سے تکرار ہونا چاہیئے تاکہ وہ نفوس افکار میں راسخ ہو جائیں۔

درحقیقت گناہ بھی مختلف بیماریوں کی طرح ہیں جب تک بیماری بدن کے اصلی مراکز پر حملہ آور ہو کر انھیں بے کار نہیں کر دیتی بدن کی دفاعی قوّت صحت و بہبود کے لیے کارآمد رہتی ہے لیکن اگر مثال کے طور پر بیماری بدن کے اصلی مرکز یعنی دفاع پر حملہ کر دے اور اسے مفلوج کر دے تو امید کے دروازے بند ہو جائیں گے اور موت یقین کی صورت میں آ کھڑی ہوگی۔

شرک ایک ایسی ہی بیماری ہے جو روحِ انسانی کا حساس مرکز بے کار کر دیتی ہے اور انسانی جان پر تاریکی و ظلمت کا چھڑکاؤ کرتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے نجات کی کوئی امید نہیں ہے۔ لیکن اگر حقیقت توحید اور یکتا پرستی جو ہر طرح کی فضیلت، جنبش اور تحریک کا سرچشمہ ہے زندہ ہو تو پھر دیگر گناہوں سے بخشش کی امید کی جا سکتی ہے (ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذٰلک لمن یشاء)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ آیت اس سورہ میں کچھ فرق کے ساتھ دو مرتبہ آئی ہے تاکہ شرک و بت پرستی کے وہ آثار جو سالہا سال سے لوگوں کے نفوس کی گہرائیوں میں گھر بنا چکے تھے۔ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں اور توحید کے معنوی و مادی آثار ان کے شجرِ وجود پر آشکار ہو جائیں البتہ دونوں آیات میں تھوڑا سا فرق ہے یہاں فرمایا گیا ہے: و من یشرک باللہ فقد ضل ضلالا بعیدًا ــ یعنی ــــ جو شخص خدا کے لیے شریک کا قائل ہو وہ دور کی گمراہی میں گرفتار ہے ــــ لیکن گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا ہے: و من یشرک باللہ فقد افتری اثمًا عظیمًا ــ یعنی ــــ جو شخص کسی کو خدا کا شریک بنا دے اس نے بہت بڑا جھوٹ اور افتراء باندھا ہے۔

Marfat.com

درحقیقت وہاں جنبہ الٰہی اور خداشناسی کے لحاظ سے شرک کے عظیم نقصان کی طرف اشارہ ہوا ہے اور یہاں لوگوں کے لیے اس کے ناقابل تلافی نقصانات بیان ہوئے ہیں وہاں مسئلے کا علمی پہلو مدنظر رکھا گیا ہے اور یہاں اس کے عملی پہلو اور خارجی نتائج کا ذکر ہے واضح ہے کہ اصطلاح کے مطابق یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں[1]

۱۱۷۔ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۝

۱۱۸۔ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝

۱۱۹۔ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۝

۱۲۰۔ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝

۱۲۱۔ اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ۝

ترجمہ

۱۱۷۔ وہ خدا کو چھوڑ کر صرف بتوں کو پکارتے ہیں جن کا کوئی اثر نہیں اور (یا) وہ صرف سرکش اور تباہ کار شیطان کو پکارتے ہیں۔

۱۱۸۔ خدا نے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ میں تیرے بندوں سے ایک معین مقدار لے کر رہوں گا۔

۱۱۹۔ اور میں انھیں گمراہ کروں گا اور آرزوؤں اور تمناؤں کے حصول میں سرگرم رکھوں گا اور انھیں حکم دوں گا کہ وہ (بے ہودہ اور فضول کام انجام دیں اور) چوپایوں کے کان چیر دیں اور خدا کی (پاک) خلقت کو خراب کر دیں (فطرت توحید کو شرک آلود کر دیں) اور وہ لوگ جنھوں نے خدا کی بجائے شیطان کو اپنا ولی چنا ہے انھوں نے

---

[1] اس آیت کے سلسلے میں دیگر وضاحتیں تفسیر نمونہ جلد ۳ میں پیش کی جا چکی ہیں (دیکھیے اردو ترجمہ ص ۲۹۴)

Marfat.com

واضح نقصان کیا ہے۔

۱۲۰۔ شیطان ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا ہے اور انھیں آرزوؤں میں سرگرم رکھتا ہے اور مکر و فریب کے سوا انھیں کوئی وعدہ نہیں دیتا۔

۱۲۱۔ (شیطان کے) ان (پیروکاروں) کے رہنے کی جگہ جہنم ہے اور ان کے لیے کوئی راہِ فرار نہیں ہے۔

تفسیر

شیطانی سازشیں

پہلی آیت ان مشرکین کی حالت بیان کر رہی ہے جن کے منحوس انجام کا تذکرہ گذشتہ آیت میں کیا گیا ہے۔ اس میں درحقیقت ان کی سخت گمراہی کا سبب بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے؛ وہ اس قدر کوتاہ فکر ہیں کہ انھوں نے وسیع عالم ہستی کے خالق کو چھوڑ کر ایسے موجودات کے در پر رجوع کرتے ہیں کہ جن کا کچھ بھی مثبت اثر نہیں بلکہ بعض اوقات تو شیطان کی طرح تباہ کن اور گمراہ کن بھی ہوتے ہیں (ان یدعون من دونہ الا اناثا و ان یدعون الا شیطانا مریدا)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں مشرکین کے معبود دو چیزوں میں منحصر قرار دیئے گئے ہیں اول ——"اناث" اور دوم —— "شیطان مرید"

"اناث" جمع ہے "انثیٰ" کی جو کہ "انث" (بروزن "ادب") کے مادہ سے ہے "انثیٰ" نرم اور قابلِ انعطاف موجود کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ لوہا جب آگ میں نرم ہو جائے تو عرب "انث الحدید" کہتے ہیں۔ عورت کو بھی "اناث" یا "مؤنث" اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ زیادہ نرم دل، لطیف اور انعطاف پذیر صنف ہے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہاں قرآن کا اشارہ قبائل عرب کے مشہور بتوں کی طرف ہے ہر عرب قبیلے نے اپنا ایک بت بنا رکھا تھا جسے مونث نام دیا گیا تھا۔ مثلاً الللات —— جس کا معنی ہے "الھہ" اور یہ "اللہ" کا مونث ہے "عزیٰ" بھی مونث ہے۔ "اعز" کا اسی طرح "منات" "اساف" اور "نائلہ" بھی مونث نام ہیں۔

بعض دوسرے بزرگ مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہاں اناث سے مراد مونث کا مشہور معنی نہیں ہے بلکہ یہ لفظ یہاں اصل لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ ایسے معبودوں کی پرستش کرتے تھے جن کی حیثیت ایک کمزور مخلوق سے زیادہ نہ تھی اور جو آسانی سے انسان کے ہاتھوں ہر شکل میں ڈھل جاتے تھے ان کا پورا وجود دوسروں کے رحم و کرم پر جدھر چاہو ادھر مڑ جانے والا اور حوادث کے سامنے جھک جانے والا تھا۔ زیادہ کھُلے لفظوں میں وہ بے ارادہ اور بے اختیار معبود تھے جن سے کوئی نفع و نقصان نہ پہنچ سکتا تھا۔

باقی رہا لفظ "مرید" —— تو اس کی تشریح کچھ یوں ہے: یہ لفظ لغت کے لحاظ سے "مرد" (بروزن "زرد")

Marfat.com

کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے درختوں کی شاخیں اور پتے جھڑ جانا ۔ اسی لیے جس نوجوان کے چہرے پر ابھی بال نہ اگے ہوں اسے " امرد " کہا جاتا ہے ۔ لہٰذا " شیطان مرید " سے مراد وہ شیطان ہے جس کے شجرِ وجود کی تمام صفات فضیلت گر چکی ہوں اور بھلائی اور طاقت کی کوئی چیز اس میں باقی نہ رہی ہو یا پھر یہ لفظ مادہ " مرود " (بروزن " سرود ") سے ہے جس کا معنی ہے طغیان اور سرکشی ——— یعنی ان کا وجود تباہ کار اور ویرانیاں لانے والا شیطان ہے ۔

درحقیقت قرآن نے ان کے معبودوں کو دو گروپوں میں بیان کیا ہے ایک گروپ وہ ہے جو بے اثر اور بے خاصیت ہے اور دوسرا تباہ کار اور ویران گر ہے اور جو شخص ایسے معبودوں کے سامنے سر جھکائے وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہے ۔

اس کے بعد کی آیات میں شیطان کی صفات ، اس کے مقاصد و اہداف اور بنی آدم سے اس کی مخصوص دشمنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نیز اس کے لائحہ عمل کے مختلف حصّوں کی تشریح کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے ، خدا نے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے (لعنه الله) اس کی تمام تباہ کاریوں اور بدبختیوں کی بنیاد دراصل یہی ہے کہ وہ رحمتِ الٰہی سے دور ہو چکا ہے ، اور یہ دوری اس کے غرور و تکبّر کا نتیجہ ہے یہ بات واضح ہے کہ ایسا وجود جو رحمتِ خدا سے دور ہو کر ہر طرح کی خیر و خوبی سے محروم ہو چکا ہو ، وہ دوسروں کی زندگی کے لیے مفید نہیں ہو سکتا ۔ جس نے حیات بخشنے والے سے کچھ نہ پایا ہو وہ ہستی آفرین کیسے ہو سکتا ہے ایسا وجود نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہو سکتا بلکہ نقصان دہ بھی ہو گا ۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ شیطان نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ یہ کام سر انجام دے گا :

۱۔ تیرے بندوں سے ایک معیّن حصّہ لوں گا (وقال لا تخذن من عبادك نصيبًا مفروضًا) ۔

وہ جانتا ہے کہ وہ خدا کے سب بندوں کو گمراہ نہیں کر سکتا اور صرف ہوس پرست ، ضعیف ایمان والے اور کمزور ارادے کے مالک ہی اس کے سامنے جھکیں گے ۔

۲۔ انھیں گمراہ کروں گا (ولاضلنهم) ۔

۳۔ انھیں لمبی چوڑی امیدوں اور آرزوؤں کے سہارے مصروف رکھوں گا (ولامنينهم)[ل۵]

۴۔ انھیں فضول اور بے ہودہ کاموں کی دعوت دوں گا ان میں سے یہ بھی ہے کہ انھیں حکم دوں گا کہ وہ چوپایوں کے کانوں میں سوراخ کریں یا انھیں کاٹ ڈالیں (ولامرنهم فليبتكن اذان الانعام) ۔

یہ زمانہ جاہلیت کے ایک بدترین عمل کی طرف اشارہ ہے بُت پرستوں میں یہ کام مروّج تھا کہ وہ بعض چوپایوں کے کان چیر دیتے یا انھیں قطع کر دیتے پھر ان پر سواری کو ممنوع سمجھ لیتے اور ان سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہ اٹھاتے ۔

۵۔ انھیں اس کام پر ابھاروں گا کہ خدا کی پاک خلقت کو بگاڑ دیں (ولامرنهم فليغيرن خلق الله) ۔

یہ جملہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے انسان کی فطرتِ اولیٰ میں توحید ، یگانہ پرستی اور ہر طرح کی پسندیدہ صفت

ل۵ اس لفظ کا مادہ " منی " (بروزن " منع ") ہے جو تقدیر اور حساب لگانے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے بعض اوقات خیالی اندازوں اور موہوم آرزوؤں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ نطفہ کو بھی " منی " اسی لیے کہا جاتا ہے کہ زندہ موجودات کی ابتدا کا حساب اسی سے لگایا جاتا ہے ۔

Marfat.com

رکھی ہے لیکن شیطانی وسوسے اور ہوا و ہوس اسے اس صحیح راستے سے منحرف کر دیتے ہیں اور بے راہ روی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ اس بات کی شاہد سورۂ رُوم کی آیہ ۳۰ ہے۔

فاقم وجهك للدين حنيفًا فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم۔

اپنا چہرہ خالص توحیدی آئین کی طرف کر لو یہ وہی فطرت ہے کہ جس پر خدا نے شروع سے لوگوں کو رکھا ہے یہ آفرینش کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی ——— یہی حقیقی اور مستقیم دین ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ یہاں تغیر سے مراد فطرت توحید اور فرمانِ خدا میں تغیر ہے[۱] ——— اور یہ ایسا ضرر ہے جو قابل تلافی نہیں ——— شیطان یہ نقصان انسان کی سعادت کی بنیاد کو پہنچاتا ہے کیونکہ وہ حقائق کو اوہام میں تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد سعادت شقاوت میں بدل جاتی ہے۔

آخر میں ایک حکم عمومی بیان کیا گیا ہے؛ جو شخص خدا کی بجائے شیطان کو اپنا سرپرست بناتا ہے وہ کھلے نقصان کا مرتکب ہوا ہے (ومن يتخذ الشيطان وليًا من دون الله فقد خسر خسرانًا مبينًا)۔

اگلی آیت میں گذشتہ گفتگو کی دلیل کے طور پر چند نکات بیان کیے ہیں؛

شیطان ہمیشہ ان سے جھوٹے وعدے کرتا رہتا ہے اور انھیں لمبی چوڑی آرزوؤں میں محو رکھتا ہے لیکن مکر و فریب کے علاوہ کرتا ان کے لیے کچھ بھی نہیں ہے (يعدهم ويمنيهم وما يعدهم الشيطان الا غرورًا[۲])۔

محل بحث آیت میں سے آخری آیت میں شیطان کے پیروکاروں کے آخری انجام کا تذکرہ ہے۔ فرمایا گیا ہے: ان کا ٹھکانا جہنم میں ہے اور ان کے لیے بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے (اولئك مأوٰهم جهنم ولا يجدون عنها محيصًا)[۳]

۱۲۲۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ○

---

[۱] تفسیر تبیان ج ۳ ص ۳۳۴

[۲] "غرور" دراصل کسی چیز کے واضح اور آشکار اثر کو کہتے ہیں لیکن یہ لفظ زیادہ تر ان آثار کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا ظاہر پر فریب اور باطن ناپسندیدہ ہو اور ہر ایسی چیز کو غرور کہتے ہیں جو انسان کو فریب دے اور راہِ حق سے منحرف کر دے چاہے وہ مال و ثروت ہو یا مقام و اقتدار۔

[۳] "محیص" "حیص" کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے عدول کرنا اور نگاہ پھیر لینا۔ لہٰذا محیص کا معنی ہو گا عدول کا ذریعہ اور فرار کا وسیلہ۔

Marfat.com

ترجمہ

۱۲۲- اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک کام سرانجام دیئے ہم انھیں عنقریب ان باغات بہشت میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ان میں رہیں گے اللہ تم سے سچا وعدہ کرتا ہے اور کون ہے جو قول اور اپنے وعدوں میں اللہ سے زیادہ سچا ہو۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جو لوگ شیطان کو اپنا ولی بناتے ہیں وہ واضح طور پر خسارے اور نقصان میں ہیں شیطان ان سے جھوٹے وعدے کرتا ہے انھیں آرزوؤں میں محو رکھتا ہے اور اس کا وعدہ مکر و فریب کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلے میں اس آیت میں اہلِ ایمان کا انجام بیان کیا گیا ہے کہ، وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک اعمال انجام دیئے ہیں وہ بہت جلد فردوس بریں کے باغات میں جائیں گے، یہ وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں (والذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت سندخلھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھٰر) یہ نعمت دنیاوی نعمتوں کی طرح ناپائیدار نہیں ہے بلکہ ہمیشہ مومنین کو میسر رہے گی (خالدین فیھا ابدًا)۔

یہ وعدہ شیطان کے جھوٹے وعدوں کی طرح نہیں ہے بلکہ سچا ہے اور خدا کا وعدہ ہے (وعد اللہ حقًا) اور یہ واضح ہے کہ خدا سے بڑھ کر اپنے قول و قرار کا سچا کوئی نہیں ہو سکتا (ومن اصدق من اللہ قیلًا) کیونکہ وعدہ خلافی یا تو عجز و ناتوانی کی وجہ سے ہوتی ہے اور یا جہالت و احتیاج کی بنا پر جو کہ اللہ کی ساحت قدس سے بعید ہے۔

۱۲۳- لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ
وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○
۱۲۴- وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ○

ترجمہ

۱۲۳- تمھاری اور اہل کتاب کی آرزوؤں سے (فضیلت و برتری) نہیں ہوتی، جو شخص برا عمل کرے گا اسے سزا دی جائے گی اور وہ خدا کے علاوہ کسی کو اپنا ولی و یاور نہیں پائے گا۔

Marfat.com

۱۲۴۔ اور جو شخص اعمالِ صالح میں سے کچھ انجام دے، چاہے مرد ہو یا عورت، اگر وہ ایمان رکھتا ہے تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور ان پر تھوڑا سا ظلم بھی نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان اور دیگر تفاسیر میں ہے کہ مسلمان اور اہل کتاب ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے اہل کتاب کہتے کہ ہمارا پیغمبر تمہارے پیغمبر سے پہلے آیا ہے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے مقدم ہے اور مسلمان کہتے کہ ہمارا پیغمبر تمام پیغمبروں کا خاتم ہے اور اس کی کتاب آخری کتاب ہے اور دیگر آسمانی کتب سے زیادہ کامل و اکمل ہے لہٰذا ہم تم سے زیادہ افضل ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم برگزیدہ قوم ہیں اور جہنم کی آگ چند دنوں کے سوا ہم تک نہیں پہنچے گی (وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودة)۔[1]

اور مسلمان کہتے کہ ہم بہترین اُمت ہیں کیونکہ خدا نے ہمارے بارے میں فرمایا ہے:

(کنتم خیر امة اخرجت للناس)[2]

اِسی ضمن میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ان دعووں پر خط بطلان کھینچ دیا گیا اور یہ واضح کیا گیا کہ ہر انسان کی قدر و قیمت ان کے اعمال کے مطابق ہوگی۔

تفسیر

سچے اور جھوٹے امتیازات

ان دو آیات میں اسلام کی ایک بہت ہی اہم اساس کو بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ افراد کی وجودی قدر و قیمت اور جزاء و سزا، ان کے دعووں اور آرزوؤں سے مربوط نہیں ہے بلکہ صرف ایمان اور عمل سے وابستہ ہے اسلام کی یہ بنیاد ثابت اور سنت ہے اور غیر متبدل ہے یہ وہ قانون ہے جس کی نظر میں تمام امتیں یکساں ہیں لہٰذا پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: فضیلت و برتری کا انحصار تمہاری اور اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر نہیں ہے (لیس بامانیکم ولا امانی اهل الکتاب)۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: جو شخص کوئی عمل بجا لائے گا وہ اس کے بدلے اپنی سزا پائے گا اور خدا کے علاوہ کسی کو اپنا

---

[1] بقرہ۔ ۸۰
[2] آلِ عمران ـــ ۱۱۰

Marfat.com

ولی ویاور نہ پائے گا (من یعمل سوءًا یجز بہ ولا یجد لہ من دون اللہ ولیا ولا نصیرًا) اور اسی طرح جو لوگ نیک عمل بجالائیں گے اور صاحب ایمان ہوں گے وہ مرد ہوں یا عورتیں جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا (ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثی وھو مؤمن فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیرًا) [1]

اس طرح قرآن نے نہایت سادگی سے بقولے سب کے ہاتھ پر پاک پانی ڈالا ہے اور کسی مذہب سے دعوے کی حد تک خیالی، اجتماعی یا نسلی وابستگی کو بے فائدہ قرار دیا ہے اور نجات کی بنیاد اس مکتب کے اصولوں پر ایمان لانے اور اس کے پروگراموں پر عمل کرنے کو ٹھہرایا ہے۔

پہلی آیت کے ذیل میں بنیادی شیعہ سنی کتب میں ایک حدیث منقول ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد بعض مسلمان ایسی دہشت و پریشانی میں مبتلا ہوگئے کہ وہ ڈر کے مارے رونے لگے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انسان خطاکار ہے اور آخر اس سے گناہ سرزد ہونا تو ممکن ہی ہے اور اگر کسی قسم کی کوئی معافی اور بخشش نہیں اور تمام بُرے اعمال کی سزا ملے گی پھر یہ تو بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ لہٰذا انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس آیت نے ہمارے لیے تو کوئی صورت نہیں چھوڑی، اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

> اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بات وہی ہے جو اس آیت میں نازل ہوئی ہے تاہم میں تمھیں ایسی بشارت دیتا ہوں جو تمھارے لیے قربِ خدا اور نیک اعمال بجالانے کی تشویق کا سبب بنے گی اور وہ یہ کہ تمھیں جو مصیبتیں پہنچیں گی، تمھارے گناہوں کا کفارہ بنیں گی یہاں تک تمھارے پاؤں میں چبھنے والا ایک کانٹا بھی ہے [2]

ایک سوال کا جواب

ارشادِ الٰہی ہے، ولا یجد لہ من دون اللہ ولیًا ولا نصیرًا (یعنی وہ اپنے گناہوں کے مقابلہ میں کسی کو اپنا سرپرست ویاور نہیں پائے گا) ممکن ہے بعض لوگ اس سے استدلال کرتے ہوئے کہیں کہ اس جملے سے مسئلہ شفاعت وغیرہ کی بالکل نفی ہوجاتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ——— جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے کہ شفاعت کا معنی یہ نہیں ہے کہ شفاعت کرنے والے مثلاً انبیاء، آئمہ اور صلحا خدا کے مقابلے میں کوئی مستقل طاقت رکھتے ہیں بلکہ ان کی شفاعت بھی حکم خدا کے ماتحت ہے اور اس کی اجازت اور جس کی شفاعت کی جانا ہے اس کی اہلیت کے بغیر کبھی شفاعت نہیں کریں گے۔ لہٰذا ایسی شفاعت کی برگشت بالآخر خدا کی طرف ہے اور خدا کی سرپرستی، نصرت اور مدد کا ایک شعبہ شمار ہوتی ہے۔

---

[1] نقیر کے مفہوم پر اسی سورہ کی آیت ۵۳ میں بحث کی جاچکی ہے۔

[2] نور الثقلین جلد اول۔ص ۵۵۳

Marfat.com

۱۲۵- وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ
مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ○
۱۲۶- وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ
شَيْءٍ مُّحِيْطًا ○

ترجمہ

۱۲۵- جو اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دے اس سے بہتر کس کا دین ہے اور بھر جو نیکو کار بھی ہو اور ابراہیم کے خالص اور پاک دین کا پیرو ہو اور خدا نے ابراہیم کو اپنی دوستی کے لیے منتخب کر لیا ہے۔

۱۲۶- جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب خدا کا ہے اور خدا ہر چیز پر محیط ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ایمان و عمل کی تاثیر کے بارے میں گفتگو تھی۔ ان میں بتایا گیا تھا کہ کسی دین و آئین سے منسوب ہو جانا ہی کافی نہیں لیکن زیر نظر آیت میں اس بنا پر کہ کہیں گذشتہ بحث سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ دین اسلام کی تمام ادیان پر برتری کا اظہار یوں کیا گیا ہے: کون سا دین اس شخص کے دین سے بہتر ہے جو بارگاہ الٰہی میں سراپا تسلیم ہو اور نیک عمل سے دستبردار نہ ہو اور ابراہیم کے پاک اور خالص دین کا پیروکار ہو (ومن احسن دینا ممن اسلم وجهه لله وهو محسن واتبع ملة ابراهيم حنيفا)۔

البتہ آیت یہاں استفہامیہ صورت میں ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ سننے والے سے اس حقیقت کا اقرار لیا جائے۔

اس آیت میں تین چیزوں کو بہترین دین کے مقیاس کے طور پر شمار کیا گیا ہے:

پہلی: پورے طور پر خدا کے حضور سپردگی "اسلم وجهه لله"[1]۔

---

[1] "وجہ" لغت میں چہرے کو کہتے ہیں اور انسان کا چہرہ چونکہ اس کے قلب و روح کا آئینہ ہوتا ہے اور انسان کو خارجی دنیا سے مربوط کرنے والے حواس تقریباً سب چہرے میں واقع ہیں اس لیے یہ لفظ کبھی کبھی ذات کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ قصص آیت ۸۸ میں ہے

"كل شئ هالك الا وجهه"

ذات خدا کے علاوہ سب چیزیں ہلاک ہو جائیں گی۔

Marfat.com

دوسری: نیکوکاری (وھو محسن) یہاں نیکوکاری سے مراد دل، زبان اور عمل سے ہر طرح کی نیکی ہے تفسیر نور الثقلین میں اس آیت کے ذیل میں پیغمبر اسلام سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جو اس سوال کے جواب میں ہے کہ احسان سے کیا مراد ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فان یراک

(اس آیت میں) احسان سے مراد یہ ہے کہ جو کام بھی عبادتِ خدا کے لیے انجام دو وہ اس طرح ہو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے اور وہ تم پر شاہد و ناظر ہے۔

تیسری: ابراہیم کے پاک دین و آئین کی پیروی کرنا (واتبع ملۃ ابراھیم حنیفا)[1]

آیت کے آخر میں دینِ ابراہیم پر اعتماد کی یہ دلیل بیان کی گئی ہے کہ خدا نے ابراہیم کو اپنے خلیل کی حیثیت سے منتخب کرلیا ہے (واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا)۔

خلیل کسے کہتے ہیں؟

ہوسکتا ہے "خلیل" "خُلّت" (بروزن "حجت") کے مادہ سے ہو جس کا معنی ہے دوستی۔ یا پھر "خَلّت" (بروزن "ضربت") کے مادہ سے ہو جس کا مطلب ہے نیاز و احتیاج۔

مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ زیر نظر آیت میں کون سا معنی آیت کے مفہوم کے زیادہ قریب ہے۔ بعض کے خیال میں دوسرا معنی حقیقت آیت کے قریب تر ہے کیونکہ ابراہیمؑ اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے کہ وہ بلا استثنا تمام چیزوں میں خدا کے محتاج ہیں لیکن اوپر والی آیت کہتی ہے کہ خدا نے خود ابراہیمؑ کو یہ مقام دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد دوستی ہے کیونکہ اگر یہ کہیں کہ خدا نے دوست کی حیثیت سے ابراہیمؑ کو منتخب فرمایا تو یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں یہ مفہوم ہوسکتا ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ کا انتخاب اپنے محتاج کی حیثیت سے کیا ہے جبکہ باقی تمام مخلوق بھی خدا تعالیٰ کی محتاج اور نیازمند ہے لہٰذا یہ بات ابراہیمؑ سے مخصوص نہیں ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ

یعنی ــــ اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو۔ (فاطر ــــ ۱۵)

امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک روایت میں ہے:

---

[1] "ملت" کا معنی "دین" ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت خدا کی طرف نہیں ہوتی مثلاً "ملۃ اللہ" نہیں کہتے بلکہ پیغمبر کی طرف اس کی اضافت ہوتی ہے جبکہ لفظ دین کی اضافت اللہ کی طرف بھی، پیغمبر کی طرف بھی اور دیگر افراد کی طرف بھی ہوتی ہے۔

حنیف ــــ اس شخص کو کہتے ہیں جو ادیان باطل چھوڑ کر حق کی طرف مائل ہو اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اس کی تشریح جلد دوم میں کی جاچکی ہے (ص ۲۶۹ اردو ترجمہ)

Marfat.com

خدا نے ابراہیم کو اگر اپنا خلیل (اور دوست) بنایا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان کی دوستی کا محتاج تھا بلکہ یہ اس بنا پر تھا کہ ابراہیم خدا تعالیٰ کے مفید اور اس کی راہ میں کوشش کرنے والے بندے تھے۔[1]

یہ روایت بھی اس بات کی شاہد ہے کہ زیر بحث آیت میں خلیل کا مطلب دوست ہی ہے۔

رہا یہ سوال کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو یہ مقام کن خصوصیات کی بنا پر عطا فرمایا ہے تو اس سلسلے میں روایات میں کئی ایک وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ جو سب ابراہیمؑ کے انتخاب کی دلیل بن سکتی ہیں۔ ایک وجہ امام صادقؑ سے منقول ایک حدیث میں یوں بیان کی گئی ہے:

انما اتخذ اللہ ابراھیم خلیلا لانہ لم یرد احدًا ولم یسئل احدًا قط غیر اللہ۔

یعنی ـــــ خدا تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خلیل اس لیے بنایا کیونکہ انھوں نے کبھی کسی سوال اور تقاضا کرنے والے کو محروم نہیں کیا اور کبھی کسی سے سوال اور تقاضا نہیں کیا۔[2]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ مقام زیادہ سجدہ کرنے، بھوکوں کو کھانا کھلانے اور رات کی تاریکی میں نماز پڑھنے یا پروردگار کی اطاعت کے لیے کوشاں رہنے کی وجہ سے حاصل ہوا۔

اگلی آیت میں پروردگار کی مالکیت مطلقہ اور تمام اشیاء پر اس کے احاطے کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کی ملکیت ہے کیونکہ خدا تمام چیزوں پر محیط ہے (وللہ ما فی السمٰوات وما فی الارض وکان اللہ بکل شیء محیطا) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست اس وجہ سے نہیں بنایا کہ خدا کو کسی چیز کی ضرورت اور احتیاج تھی بلکہ خدا تو سب سے بے نیاز ہے۔ یہ انتخاب تو ابراہیمؑ کی خوبیوں اور بہترین صفات کی وجہ سے ہے۔

۱۲۷۔ وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ط قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ لا وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ لا وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ط وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ

---

[1] یہ حدیث مجمع البیان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

[2] تفسیر صافی اور تفسیر برہان ج ۱، ص ۴۱۷۔ بحوالہ عیون اخبار الرضا۔

Marfat.com

اللّٰہ کَانَ بِہٖ عَلِیۡمًا ○

ترجمہ

۱۲۷- تجھ سے عورتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ خدا اس بارے میں تمھیں جواب دیتا ہے اور جو کچھ قرآن میں یتیم عورتوں کے متعلق، جن کے حقوق تم ادا نہیں کرتے اور ان سے شادی کر لینا چاہتے ہو اور اسی طرح چھوٹے بچوں اور ناتوانوں کے متعلق تمھارے لیے بیان ہوا ہے (اس سلسلے میں خدا کی کچھ وصیتیں ہیں اور خدا یہ بھی سفارش کرتا ہے) کہ یتیموں کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کرو اور جو نیکیاں تم انجام دیتے ہو خدا ان سے آگاہ ہے (اور وہ تمھیں ان کا مناسب بدلہ دے گا)۔

تفسیر

حقوق نسواں کے بارے میں مزید گفتگو

زیر نظر آیت میں کچھ لوگوں کے اعتراضات اور سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو انھوں نے عورتوں (خصوصاً یتیم لڑکیوں) کے متعلق کیے تھے ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبر! تم سے عورتوں سے متعلق احکام پوچھتے ہیں۔ کہو کہ خدا اس سلسلے میں تمھیں جواب دیتا ہے (ویستفتونک فی النساء قل اللہ یفتیکم فیھن)۔

مزید ارشاد ہوتا ہے وہ یتیم لڑکیاں جن کے مال پر تم قبضہ کر لیتے تھے نہ ان سے شادی کرتے تھے اور نہ ان کا مال ان کے سپرد کرتے تھے تاکہ وہ کسی اور سے شادی کر لیں۔ قرآن مجید ان کے بارے میں کچھ اور سوالوں کا جواب دیتا ہے اور اس ظالمانہ روش کی برائی کو واضح کرتا ہے (و مایتلی علیکم فی الکتاب فی یتٰمی النساء اللاتی لا تؤتو ھن ماکتب لھن و ترغبون ان تنکحوھن)[1]۔

اس کے بعد چھوٹے بچوں کے بارے میں وصیت کی گئی ہے جو کہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق میراث سے محروم رہتے تھے فرمایا گیا ہے: خدا تمھیں وصیت کرتا ہے کہ تم کمزور بچوں کے حقوق کا لحاظ رکھو (والمستضعفین من الولدان)

---

[1] اس جملے کی مذکورہ تفسیر سے واضح ہوتا ہے کہ "ما یتلی" مبتداء ہے اور "یفتیکم فیھن" اس کی خبر ہے جو آیت کے سابق جملے کے قرینہ سے محذوف ہے اور لفظ "ترغبون" بھی یہاں مقابلہ نہ ہونے کے معنی میں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ "رغب" کا مادہ اگر "عن" کے ساتھ متعدی ہو تو یہ عدم تمائل اور اعراض کے معنی دیتا ہے اور اگر "فی" کے ساتھ متعدی ہو تو مائل و راغب ہونے کے معنی دیتا ہے قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "عن" مقدر ہے۔

Marfat.com

ایک مرتبہ پھر یتیموں کے حقوق کے بارے میں ایک مجموعی تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: خدا تمھیں وصیت کرتا ہے کہ یتیموں سے عدل کرو (وان تقوموا للیتامیٰ بالقسط)۔

آخر میں اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جیسا عمل خصوصاً یتیموں اور کمزوروں سے متعلق تم سے سرزد ہو وہ علم خدا کی نظر سے مخفی نہیں رہتا اور اس کی مناسب جزا ملے گی (و ما تفعلوا من خیر فان اللہ کان بہ علیمًا)۔

ضمناً اس طرف بھی توجہ رہے کہ "تستفتونک" دراصل "فتویٰ" اور "فتیا" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے مشکل مسائل کا جواب دینا۔ لغت میں اس کی بنیاد چونکہ "فتیٰ" ہے جس کا معنی ہے "نوجوان"، لہٰذا ممکن ہے پہلے پہل یہ لفظ ان مسائل کے لیے استعمال ہوتا ہو کہ جن کے جوابات جاذب اور تازہ ہوتے ہوں اور بعد ازاں ہر طرح کے مسائل کے جواب کے لیے استعمال ہونے لگا ہو۔

۱۲۸۔ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ○

ترجمہ

۱۲۸۔ اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے بارے میں اس بات سے خوفزدہ ہو کہ وہ سرکشی یا اعراض کا مرتکب ہوگا تو کوئی حرج نہیں کہ وہ آپس میں صلح کریں (اور عورت یا مرد صلح کی خاطر اپنے کچھ حقوق سے صرفِ نظر کرلیں) اور صلح بہتر ہے اگرچہ یہ لوگ (حبِ ذات کی فطرت کے مطابق ایسے مواقع پر) بخل سے کام لیتے ہیں اور اگر نیکی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو (اور صلح کی وجہ سے درگذر کردو) تو خدا اس سے آگاہ ہے جو کچھ تم انجام دیتے ہو (اور وہ تمھیں مناسب جزا دے گا)۔

شانِ نزول

بہت سی اسلامی تفاسیر اور کتب احادیث میں اس آیت کی شانِ نزول یوں بیان ہوئی ہے:

رافع بن خدیج کی دو بیویاں تھیں، ایک سن رسیدہ تھی اور دوسری جوان۔ (بعض اختلافات کی بنیاد پر) اس نے اپنی سن رسیدہ بیوی کو طلاق دے دی۔ ابھی عدت کی مدت ختم نہ ہوئی

Marfat.com

تھی کہ رافع نے اس سے کہا، اگر تم چاہو تو میں تم سے مصالحت کر لیتا ہوں البتہ اگر میں نے دوسری بیوی کو تجھ پر ترجیح دی تو تمھیں صبر کرنا ہوگا اور اگر ایسا نہ چاہو تو پھر عدت کی مدت ختم ہونے تک صبر کرو تاکہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

اس عورت نے پہلی تجویز قبول کر لی، یوں ان کی آپس میں صلح ہو گئی۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں اس معاملے کے بارے میں حکم شریعت بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر

صلح بہتر ہے

جیسا کہ اسی سورت کی چونتیسویں اور پینتیسویں آیات کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں[۱] کہ "نشوز" اصل میں "نشز" کے مادہ سے ہے اور اس کا مطلب ہے "بلند زمین"۔ یہ لفظ جب عورت اور مرد کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو سرکشی اور طغیان کا مفہوم دیتا ہے۔

گذشتہ آیات میں عورت کے "نشوز" سے مربوط احکام بیان ہوئے تھے اور زیرِ نظر آیت میں مرد کے "نشوز" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے؛ جب عورت یہ محسوس کرے کہ اس کا شوہر سرکشی اور اعراض کا ارتکاب کر رہا ہے تو کوئی حرج نہیں کہ حریم زوجیت کی حفاظت کے لیے اپنے کچھ حقوق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صلح کر لے (وان امرأۃ خافت من بعلھا نشوزًا او اعراضًا فلا جناح علیھما ان یصلحا بینھما صلحًا)۔

عورت نے چونکہ اپنے کچھ حقوق سے اپنی رضا و رغبت سے اعراض کر لیا ہے اور جبر و اکراہ والی کوئی بات نہیں۔ لہٰذا اس کا کوئی گناہ نہیں۔ اس کے لیے "لا جناح" (کوئی حرج اور گناہ نہیں) کا استعمال بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اس آیت کی شانِ نزول کی طرف توجہ کرنے سے ضمنی طور پر دو فقہی مسئلے بھی معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ دو بیویوں کے لیے ہفتہ بھر کے اوقات کی تقسیم جیسے احکام حقوق کے پہلو سے ہیں نہ کہ حکم کے حوالے سے۔ اسی لیے عورت یہ حق رکھتی ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار سے اپنے اس حق سے جزوی یا کلی طور پر صرفِ نظر کرلے۔

۲۔ ضروری نہیں کہ صلح کا معاوضہ مال ہی ہو بلکہ صلح کا معاوضہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنا حق چھوڑ دیا جائے۔

بعد ازاں صلح پر تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے؛ بہرحال صلح بہتر ہے (و الصلح خیر) یہ ایک چھوٹا سا پُر معنی اور پُر مغز جملہ ہے۔ اس آیت میں جملہ اگرچہ خانگی اختلافات سے متعلق آیا ہے لیکن واضح ہے کہ یہ ایک کلّی اور عمومی قانون ہے

---

[۱] تفسیر نمونہ جلد ۳

Marfat.com

جو ہر ایک کے لیے ہر مقام پر ہے۔ صلح وصفائی، دوستی اور محبت کو ہر مقام پر پیش نظر رکھنا چاہیے۔ نزاع و کشمکش اور ایک دوسرے سے دُوری انسان کی طبع سلیم اور پرسکون زندگی کے برخلاف ہے اس لیے استثنائی صورت میں جہاں ناگزیر ہو اس کے سوا نزاع اور دوری کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام کے اس حکم کے برعکس بعض مادہ پرستوں کا خیال ہے کہ انسانی زندگی کی پہلی بنیاد دیگر جانوروں کی طرح بقا کی کشمکش اور تنازع ہے اور اسی طرح سے تکامل اور ارتقاء صورت پذیر ہوتا ہے۔ شاید یہی طرز فکر گذشتہ چند صدیوں کی بہت سی جنگوں اور خوں ریزیوں کا سرچشمہ ہے۔ حالانکہ انسان اپنی عقل و ہوش کے سبب دیگر جانوروں سے مختلف ہے اور اس کی ارتقاء اور تکمیل کا ذریعہ تنازع نہیں تعاون ہے[1] اصولی طور پر تنازع بقاء کا نظریہ تو جانوروں کے تکامل کے لیے بھی کوئی قابل قبول بنیاد نہیں رکھتا۔

اس کے بعد بہت سے لڑائی جھگڑوں اور درگذر نہ کرنے کی بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: لوگ ذاتی طور پر اور حبّ ذات کی فطرت کے باعث بُخل کی موجوں میں پھنس کے رہ جاتے ہیں اور ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ اپنے حقوق بے کم وکاست وصول کرے اور یہی تمام لڑائی جھگڑوں کی بنیاد ہے (واحضرت الا نفس الشح)۔

لہٰذا اگر عورت اور مرد اس حقیقت کی طرف توجہ کریں کہ بہت سے اختلافات کا سرچشمہ بُخل ہے اور بُخل ایک مذموم صفت ہے پھر وہ اپنی اصلاح کی کوشش کریں اور درگذر کی راہ اختیار کریں تو نہ صرف یہ کہ خانگی اختلافات ختم ہو جائیں گے بلکہ بہت سے اجتماعی جھگڑے بھی جاتے رہیں گے۔ اس کے باوجود، اس بناء پر کہ مرد کہیں اس حکم سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں آیت کے آخر میں روئے سخن ان کی طرف کرتے ہوئے انھیں نیکی اور پرہیزگاری کی وصیت کی گئی ہے اور انھیں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اعمال و کردار پر نگاہ رکھیں اور راہِ حق و عدالت سے منحرف نہ ہوں، کیونکہ خدا ان کے تمام اعمال سے آگاہ ہے

(و ان تحسنوا و تتقوا فان الله کان بما تعملون خبیرًا)۔

۱۲۹۔ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا
تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوا وَ
تَتَّقُوا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

۱۳۰۔ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا
حَكِيْمًا ○

---

[1] اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد دوم میں تنازع بقاء کے زیر عنوان تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے (دیکھیے ص ۱۴۳ اردو ترجمہ)

Marfat.com

ترجمہ

۱۲۹- اور تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ (دلی محبّت کے اعتبار سے) عورتوں کے درمیان عدالت کرسکو چاہے جتنی بھی کوشش کرو لیکن اپنا میلان بالکل ایک طرف نہ رکھو اور دوسری کو معلق نہ چھوڑ دو اور اگر اصلاح اور پرہیزگاری کی راہ اختیار کرو تو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۱۳۰- اور اگر (صلح صفائی کی کوئی صورت نہ ہو اور) ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو خداوند عالم ان میں سے ہر ایک کو اپنے فضل و کرم سے مطمئن کر دے گا اور خدا صاحب فضل و کرم اور حکیم ہے۔

تفسیر

ایک سے زیادہ شادیوں کے لیے عدالت شرط ہے۔

گذشتہ آیت کے آخر میں جس جملے میں احسان، تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیا گیا ہے، وہ شوہروں کے بارے ایک طرح کی دھمکی بھی ہے کہ انھیں اپنے بیویوں کے بارے میں راہِ عدالت سے تھوڑا سا انحراف بھی نہیں کرنا چاہیے اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدالت تو دلی لگاؤ کے سلسلے میں بھی ممکن نہیں ہے لہٰذا متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں کیا کیا جائے۔

زیر بحث آیت اس سوال کے جواب میں کہتی ہے: محبّت کے حوالے سے تو بیویوں کے درمیان عدالت ممکن نہیں ہے چاہے اس کے لیے کتنی بھی کوشش کیوں نہ جائے (ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء و لو حرصتم)۔

"ولو حرصتم" سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جو اس سلسلے میں بہت کوشش کرتے تھے، شاید اس کی وجہ اسی سورہ کی آیت ۳ تھی جس میں فرمایا گیا ہے:

فان خفتم الا تعدلوا فواحدة

یعنی ——— اگر تم اس بات سے ڈرو کہ تم عدل قائم نہیں کرسکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو ———

یہ واضح ہے کہ ایک آسمانی قانون خلاف فطرت نہیں ہو سکتا اور ممکن نہیں کہ وہ "تکلیف مالا یطاق" یعنی ——— ایسی ذمہ داری جس کی انسان میں طاقت نہ ہو، کا حامل ہو۔ دل کی محبّت کے مختلف عوامل ہوتے ہیں جن میں سے بعض انسانی اختیار سے ماوراء ہیں لہٰذا ان کے بارے میں عدالت کا حکم نہیں دیا گیا ہے لیکن بیویوں سے برتاؤ اور ان کے حقوق کا لحاظ رکھنے کے بارے میں انسان پر عدالت کے لیے زور دیا گیا ہے جو کہ انسان کے بس میں ہے۔

اس بنا پر کہ مرد اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اس جملے کے بعد فرمایا گیا ہے، جب کہ تم محبّت کے حوالے سے بیویوں کے درمیان مساوات قائم نہیں کرسکتے تو پھر سارا رجحان اور قلبی لگاؤ تو ایک طرف نہ رکھو کہ جس سے دوسری بالکل معلق ہو کر ہی رہ جائے اور

Marfat.com

اس کے حقوق عملی طور پر ضائع ہو جائیں (فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقة)۔
آیت کے آخر میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو اس حکم کے نزول سے قبل اپنی بیویوں کے درمیان عدل میں کوتاہی کرتے تھے، ارشاد ہوتا ہے : اگر وہ اصلاح اور تقویٰ کی راہ اپنائیں اور گذشتہ رویے کی تلافی کریں تو خدا اپنی رحمت و بخشش ان کے شاملِ حال کرے گا (و ان تصلحوا و تتقوا فان اللہ کان غفورًا رحیمًا)۔

اسلامی روایات میں بیویوں کے درمیان عدالت ملحوظ رکھنے سے متعلق بہت سے مطالب مذکور ہیں جن سے اس قانون کی اہمیت اور عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت علیؑ جو دن کسی ایک بیوی سے تعلق رکھتے تھے، اس دن وضو بھی دوسری کے گھر نہیں کرتے تھے[1]

پیغمبر اکرمؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں بھی ہے کہ آپؐ بیماری کے عالم میں بھی کسی ایک بیوی کے گھر قیام نہیں کرتے تھے[2]

معاذ بن جبل کے بارے میں منقول ہے کہ اس کی دو بیویاں تھیں وہ دونوں طاعون کی بیماری کے باعث اکٹھی مر گئیں، تو معاذ نے ایک کو دوسری سے پہلے دفن کرنے کے لیے بھی قرعہ نکالا تاکہ اس سے کوئی خلاف عدالت کام نہ ہو جائے[3]

ایک اہم سوال کا جواب

جیسا کہ اس سورہ کی آیت ۳ کے ذیل میں ہم نے یاد دہانی کروائی ہے کہ بعض ناسمجھ لوگ اس آیت کو زیر بحث آیت سے ملا کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایک سے زیادہ شادیاں عدالت سے مشروط ہیں اور عدالت ممکن نہیں ہے لہٰذا ایک سے زیادہ بیویاں کرنا اسلام میں ممنوع ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ روایاتِ اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ اعتراض اٹھایا تھا امام جعفر صادقؑ کا ہم عصر تھا اور مادہ پرستوں میں سے تھا۔ اس کا نام ابن ابی العوجاء تھا۔ اس نے یہ سوال اسلام کے ایک مجاہد عالم ہشام بن حکم سے کیا۔ انھیں اس کا جواب معلوم نہ تھا لہٰذا وہ اپنے وطن جو ظاہراً کوفہ تھا سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تاکہ اس سوال کا جواب معلوم کر سکیں وہ امام صادقؑ کی خدمت میں پہنچے۔ حضرتؑ کو تعجب ہوا کہ وہ حج و عمرہ کے دنوں کے بغیر مدینہ کیوں چلے آئے تھے۔ ہشام نے بیان کیا کہ اس قسم کا سوال پیش آیا ہے۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا :

> سورۂ نساء کی تیسری آیت میں عدالت سے مراد نان نفقہ (اور حقوقِ زوجیت کا لحاظ رکھنا اور برتاؤ) ہے لیکن آیت ۱۲۹ میں عدالت جسے امرِ محال شمار کیا گیا ہے دلی لگاؤ اور میلان میں عدالت ہے (اس لیے تعدد ازدواج شرائط اسلامی کے احترام کی صورت میں ممنوع ہے نہ محال)۔

---

[1]، [2] تفسیر تبیان، ج ۳، صفحہ ۳۵۰

[3] تفسیر تبیان ج ۳، صفحہ ۳۵۰

Marfat.com

ہشام سفر سے لوٹ کر آئے اور یہ جواب ابن ابی العوجاء کو پیش کیا تو اس نے قسم کھا کر کہا:

یہ جواب خود تمھاری طرف سے نہیں ہے۔ [1]

واضح ہے کہ اگر ہم دو آیات میں " عدالت " کا الگ الگ مفہوم بیان کرتے ہیں تو یہ آیات میں موجود واضح قرینہ کی بناء پر ہے۔ محل بحث آیت میں صریحاً فرمایا گیا ہے کہ تمام قلبی لگاؤ ایک بیوی کی طرف نہ رکھو۔ لہٰذا دو بیویاں ہونا جائز شمار کیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس شرط کے ساتھ کہ عملی طور پر ان میں سے کسی پر ظلم نہ ہو اگرچہ دلی لگاؤ میں فرق ہو۔ نیز اسی سورت کی آیت ۳ میں صراحت کے ساتھ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی گئی ہے۔

پھر بعد کی آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ازدواجی زندگی کو باقی رکھنا طرفین کے لیے مشکل ہو گیا ہے اور ایسی وجوہ پیدا ہو گئی ہیں کہ جن سے افق حیات ان کے لیے تاریک ہو گیا ہے اور کسی طرح مصالحت نہیں ہو سکتی تو وہ مجبور نہیں ہیں کہ ایسی ازدواجی زندگی کو باقی رکھیں اور آخر دم تک زندان کے ماحول میں تلخ کامی سے رہیں بلکہ وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں۔ ایسے عالم میں انھیں چاہیے کہ جرأت سے اقدام کریں اور آنے والے حالات سے خوف زدہ نہ ہوں کیونکہ اگر وہ ان حالات میں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو خداوند بزرگ و برتر دونوں کو اپنے فضل و کرم سے مطمئن کر دے گا اور امید ہے کہ بہتر جیون ساتھی اور روشن تر زندگی ان کے انتظار میں ہو (وان یتفرقا یغن اللہ کلا من سعتہ) کیونکہ خدا کی حکمت آمیز رحمت بہت وسیع ہے (وکان اللہ واسعا حکیما)۔

۱۳۱۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ○

۱۳۲۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ○

۱۳۳۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ○

۱۳۴۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۲۰

Marfat.com

وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۱۳۱۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اللہ کا ہے اور جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تھیں ہم نے وصیت کی کہ خدا کی (نافرمانی) سے ڈرو اور پرہیز کرو اور اگر کافر ہو جاؤ تو (خدا کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کا مال ہے اور خدا بے نیاز ہے اور لائق تعریف ہے۔

۱۳۲۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خدا کے لیے ہے اور خدا ان کی حفاظت اور نگہبانی کے لیے کافی ہے۔

۱۳۳۔ اے لوگو! اگر وہ چاہے تو تھیں یہاں سے لے جائے اور (تمھاری جگہ) دوسرے لوگوں کو لے آئے اور خدا اس کام کی طاقت وقدرت رکھتا ہے۔

۱۳۴۔ جو لوگ دنیا کی جزا اور سزا چاہتے ہیں (اور معنوی اور اخروی نتائج کے طلبگار نہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ) خدا کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں کی جزا وثواب ہے اور وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ اگر حالات مجبور کریں کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو اس اقدام میں کوئی حرج نہیں اور آیندہ کے حالات سے نہیں ڈرنا چاہیے کیونکہ خدا انھیں اپنے فضل وکرم سے مطمئن اور بے نیاز کر دے گا۔

زیر نظر آیات میں سلسلہ کلام جاری ہے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم انھیں بے نیاز اور مستغنی کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے (وللہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض) جو ذات ایسی لامتناہی ملکیت اور بے پایاں قدرت رکھتی ہے وہ اپنے بندوں کو بے نیاز کرنے سے عاجز نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد اس موقع پر اور دیگر مواقع پر پرہیزگاری اختیار کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہود و نصاریٰ کو اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے صاحب کتاب ہیں اور اسی طرح تمھیں بھی ہم نے وصیت کی ہے کہ پرہیزگاری اختیار کرو (ولقد وصینا الذین اوتوا الکتاب من قبلکم وایاکم ان اتقوا اللہ)۔

اس کے بعد روئے سخن مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے فرمایا: تقویٰ اختیار کرنے کا یہ حکم تمھارے فائدے میں ہے اور خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے اور اگر تم روگردانی کرو، نافرمانی کی راہ اپناؤ تو خدا کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا

Marfat.com

کیونکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کی ملکیت ہے اور وہ بے نیاز ہے اور لائق ستائش ہے (وان تکفروا فان اللہ مافی السمٰوٰت ومافی الارض و کان اللہ غنیًا حمیدًا) دراصل حقیقی معنی میں غنی اور بے نیاز تو خدا ہی ہے کیونکہ وہ غنی بالذات ہے اور کسی اور کی بے نیازی اسی کی مدد سے ہے۔ ورنہ ذاتی طور پر تو سب کے سب محتاج اور نیازمند ہیں اسی طرح وہی بالذات لائق ستائش ہے کیونکہ جن کمالات کی وجہ سے وہ تعریف وستائش کے لائق ہے وہ اس کی ذات میں ہیں نہ کہ دوسروں کے کمالات کی طرح کہ جو عاریتاً انھیں دیئے جاتے ہیں اور کسی دوسرے کی طرف سے ہیں۔

بعد والی آیت میں یہ جملہ تیسری مرتبہ آیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے خدا کی ملکیت ہے اور خدا ان کی حفاظت ونگہبانی اور انتظام وانصرام کرتا ہے (و للہ مافی السمٰوٰت ومافی الارض و کفی باللہ و کیلًا)۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے مختصر سے فاصلے میں ایک مطلب کا تین مرتبہ تکرار کیوں کیا گیا ہے۔ کیا یہ تکرار صرف تاکید کے لیے ہے یا کچھ اور اشارے بھی اس میں مضمر ہیں۔ آیات میں غور وفکر کیا جائے اور دقت نظر سے کام لیا جائے تو ہر مرتبہ اس بات کے ذکر میں ایک نکتہ دکھائی دیتا ہے۔

پہلی مرتبہ دونوں میاں بیوی سے وعدہ کرتا ہے کہ ایک دوسرے سے الگ ہو جانے کے بعد خدا انھیں بے نیاز کر دے گا۔ اس موقع پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرنے پر قدرت رکھتا ہے اس نے اپنی زمین و آسمان کی وسعتوں کی ملکیت کا تذکرہ کیا ہے۔

دوسری مرتبہ تقویٰ وپرہیزگاری کی وصیت کے بعد یہ ذکر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ اس فرمان کی اطاعت کا خدا کو کوئی فائدہ نہیں ہے یا اس کی مخالفت اس کے لیے ضرررساں نہیں ہے۔ درحقیقت یہ بات اس کے مشابہ ہے جو حضرت امیرالمومنین علیؑ نے نہج البلاغہ میں خطبہ ہمام کی ابتداء میں فرمایا ہے:

ان اللہ سبحانہ و تعالیٰ خلق الخلق حین خلقھم غنیا عن طاعتھم امنا من معصیتھم لانہ لاتضرہ معصیۃ من عصاہ و لا تنفعہ طاعۃ من اطاعہ

یعنی ـــــ خدائے متعال نے انسانوں کو پیدا کیا جب کہ وہ ان کی اطاعت سے بے نیاز تھا اور ان کی نافرمانی سے امان میں تھا کیونکہ نہ تو گنہ گاروں کی نافرمانی اسے نقصان پہنچاتی ہے اور نہ اطاعت کرنے والوں کی اطاعت اسے فائدہ پہنچاتی ہے [1]

تیسری مرتبہ آیۃ ۱۳۲ میں موجود بحث کے عنوان کے طور پر اس کا تذکرہ ہے اس کے بعد فرمایا گیا ہے: خدا کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں کہ تمھیں ختم کر دے اور تمھاری جگہ زیادہ آمادہ پختہ ارادے والا گروہ پیدا کر دے جو اس کی اطاعت میں زیادہ کوشاں ہو اور خدا ایسا کرنے پر قادر ہے (ان یشأ یذھبکم ایھا الناس ویأت بآخرین و کان اللہ علی ذٰلک قدیرًا)۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳

Marfat.com

تفسیر تبیان اور مجمع البیان میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے اپنا ہاتھ سلمان کی پشت پر مارا اور فرمایا :

وہ گروہ عجم اور فارس کے یہ لوگ ہیں ۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ فرمان درحقیقت ان عظیم خدمات کی پیش گوئی ہے جو ایرانی مسلمانوں نے اسلام کے لیے کی ہیں ۔

آخری آیت میں ان لوگوں کے بارے میں بیچ میں گفتگو آگئی ہے جو خدا پر ایمان لانے کا دم بھرتے ہیں ، میدان جہاد میں شرکت کرتے ہیں اور احکام اسلام کی پابندی کرتے ہیں مگر ان کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول نہیں ہوتا ، بلکہ مادی نتائج مثلاً مالِ غنیمت کا حصول ہوتا ہے ارشاد فرمایا گیا ہے ، جو لوگ صرف دنیا کی جزا چاہتے ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ خدا کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں کی جزا اور ثواب ہے (من کان یرید ثواب الدنیا فعند الله ثواب الدنیا و الاٰخرة) لہٰذا وہ دونوں کی جستجو کیوں نہیں کرتے اور خدا سب کی نیتوں سے آگاہ اور ہر محل و مقام پر اس کی نظر ہے اور منافق صفت لوگوں کے اعمال سے باخبر ہے (و کان الله سمیعًا بصیرًا) ۔

یہ آیت ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت بیان کرتی ہے کہ اسلام کی نگاہ صرف معنوی اور اخروی پہلوؤں پر نہیں بلکہ وہ اپنے پیروکاروں کے لیے مادی اور روحانی دونوں طرح کی سعادتیں چاہتا ہے ۔

۱۳۵۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝

ترجمہ

۱۳۵۔ اے ایمان والو ، مکمل طور پر عدالت کے ساتھ قیام کرو ، خدا کے لیے گواہی دو اگرچہ یہ خود تمہارے لیے یا تمہارے والدین کے لیے یا تمہارے اقربا کے لیے نقصان وہ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اگر وہ غنی یا فقیر ہوں تو خدا حق رکھتا ہے کہ ان کی حمایت کرے اس لیے ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو ، اس طرح تو حق سے منحرف ہو جاؤ گے ۔ اور اگر حق میں تحریف کرو گے یا اس کے اظہار سے اعراض کرو گے تو جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے ۔

Marfat.com

تفسیر

عدالتِ اجتماعی

گذشتہ آیات میں خصوصیت سے یتیموں اور بیویوں سے عدالت کے بارے میں احکام تھے اب زیرِ نظر آیت میں بلا استثناء ایک بنیادی اور کُلی قانون کے ذریعے سب اہل ایمان کو اجرائے عدالت کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ عدالت قائم کریں اور عدالت سے کام لیں (یا ایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین بالقسط)۔

توجہ رہے کہ "قوامین" "قوام" کی جمع ہے یہ مبالغے کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے "بہت قیام کرنے والا"۔ یعنی ہر حالت میں، ہر کام میں، ہر مقام پر اور ہر دور میں عدالت کے ساتھ قیام کرو تاکہ یہ عمل تمھارے اخلاق اور عادات کا حصّہ بن جائے اور اس سے انحراف تمھاری طبیعت، مزاج اور روح کے خلاف ہو جائے۔

"قیام" شاید یہاں اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ عام طور پر کام کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور کام کے پیچھے لگ جائے اس لیے کسی کام کے لیے قیام کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کے لیے عزم راسخ اور مضبوط ارادے سے اقدام کیا جائے۔ اگرچہ وہ کام حکم قاضی کی مثل قیام و تحرک کا محتاج بھی نہ ہو۔ نیز ممکن ہے لفظ "قیام" کا استعمال اس لحاظ سے ہو کہ عام طور پر قائم اس چیز کو کہتے ہیں جو زمین پر عمودی شکل میں ہو اور کسی طرف بھی تھوڑا سا جھکاؤ بھی نہ رکھتی ہو یعنی تمھیں عدالت کا اجراء اس طرح سے کرنا چاہیے کہ تھوڑا سا انحراف بھی نہ ہو۔

اس کے بعد تاکید کے لیے مسئلہ شہادت کے حوالے سے ارشاد ہوتا ہے: خاص طور پر شہادت اور گواہی کے معاملے میں تمام مفادات اور تعلقات کو ایک طرف کر کے فقط خدا کے لیے گواہی دو اگرچہ وہ خود تمھاری ذات، تمھارے ماں باپ اور اعزا و اقرباء کے نقصان میں ہو (شھداء للّٰہ و لو علی انفسکم او الوالدین و الاقربین)۔

یہ بات تمام معاشروں میں موجود ہے اور خصوصاً زمانہ جاہلیت کا معاشرہ اس کا شکار تھا کہ عام طور پر گواہی دینے والے اپنی محبت و نفرت کے جذبات کے زیرِ اثر گواہی دیتے اور حق و عدالت کی ان کے ہاں کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ ابن عباس سے منقول ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نو مُسلم افراد مدینہ میں آجانے کے بعد بھی رشتہ داری کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے عزیزوں کے نقصان میں گواہی دینے سے احتراز کرتے تھے۔ مندرجہ بالا آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی اور اس کے ذریعے ایسے لوگوں کو تنبیہ کی گئی۔[1]

جیسا کہ آیت اشارہ کر رہی ہے یہ کام روحِ ایمان سے مطابقت نہیں رکھتا۔ حقیقی مومن وہی ہے جو حق اور عدالت کے سامنے کسی کا لحاظ نہ کرے یہاں تک کہ اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے مفادات کی پرواہ نہ کرے۔

---

[1] المنار جلد ۵ صفحہ ۴۵۵

Marfat.com

اس جملے سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عدالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے رشتہ دار ایک دوسرے کے نفع یا نقصان میں گواہی دے سکتے ہیں (ہاں البتہ اس میں اس تہمت کا اندیشہ نہ ہو کہ طرفداری یا تعصب سے کام لیا جا رہا ہے)۔

اس کے بعد اصولِ عدالت سے انحراف کے کچھ اور عوامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: نہ دولت مندوں کی دولت شہادتِ حق سے مانع ہو اور نہ فقیر کے فقر کو دیکھ کر پیدا ہونے والے جذبات۔ کیونکہ شہادتِ حق جس کے نقصان میں جاری ہو وہ دولت مند ہو یا فقیر، خدا اس کے حالات سے زیادہ آگاہ ہے۔ پروردگار کی حمایت کے مقابلے میں اہل ثروت و اہل اقتدار سچی گواہی دینے والے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے اور نہ عدالت کے اجراء سے فقیر بھوکا رہ سکتا ہے (ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بھما)۔

دوبارہ تاکید کے طور پر حکم دیا گیا ہے: ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو، مبادا اجرائے عدالت میں رکاوٹ پیدا ہو جائے (فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا[1])۔

اس جملے سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ظلم و ستم کا سرچشمہ ہوا پرستی ہے اور اگر کوئی معاشرہ ہوا پرست نہ ہو تو ظلم و ستم وہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔

دوبارہ قیام عدالت کی اہمیت کے پیش نظر فرماتا ہے: اگر تم حق دار تک اس کا حق پہنچنے میں حائل ہوئے یا حق میں تحریف کی یا حق آشکار ہو جانے کے بعد اس سے اعراض کیا تو خدا تمھارے اعمال سے آگاہ ہے (و ان تلووا[2] او تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا) "تلووا" دراصل تحریف حق اور حق میں تغیر و تبدل کی طرف اشارہ ہے۔ "تعرضوا" حق کے مطابق حکم کرنے سے اعراض اور منہ موڑنے کے معنی میں ہے۔ یہی بات امام باقرؑ سے منقول ایک حدیث میں بیان کی گئی ہے[3]۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیت میں "خبیر" کا لفظ آیا ہے "علیم" کا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "خبیر" عموماً اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کی جزئیات اور ذرہ ذرہ سے واقف ہو۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ حق سے تمھارے ذرا سے انحراف سے بھی واقف ہے چاہے تم اسے کسی بہانے سے کرو اور چاہے اسے حق بجانب قرار دے لو اور وہ اس کی سزا بھی دے گا۔

زیر نظر آیت اجتماعی عدالت کے بارے میں اسلام کی گہری دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے اور اس کی ہر شکل و صورت کو مکمل طور پر واضح کرتی ہے اس سلسلے میں عدالت اجتماعی کے بارے میں ان چند جملوں میں موجود طرح طرح کی تاکیدیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلام اس اہم انسانی مسئلے میں کس قدر حساس ہے البتہ یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ مسلمانوں کا عمل اور اسلام

---

[1] لفظ — تعدلوا ممکن ہے "عدالت" کے مادہ سے ہو یا "عدول" کے مادہ سے ہو اگر "عدالت" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی یہ ہو گا فلا تتبعو الھوی لان تعدلوا (ہوس پرستی کی راہ نہ اپناؤ تاکہ تم عدالت کا اجرا کر سکو) اور اگر "عدول" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی یوں ہو گا فلا تتبعوا الھوی فی ان تعدلوا (انحراف حق کی راہ میں ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو)۔

[2] "تلووا" مادہ "لی" (بروزن "طی") سے ہے اس کا معنی ہے "روکنا" یا "تاخیر"۔ یہاں دراصل ترجیح و تاب دینے کی معنی میں آیا ہے۔

[3] تفسیر تبیان جلد ۵ صفحہ ۳۵۶

Marfat.com

کے اس بلند پایہ حکم کے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ ہے اور مسلمانوں کی پس ماندگی کا ایک عامل ان کا یہ طرز عمل بھی ہے۔

۱۳۶۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى
رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ
بَعِيْدًا ○

ترجمہ

۱۳۶۔ اے ایمان لانے والو! (واقعی) ایمان لے آؤ خدا پر، اس کے پیغمبر پر، اس کی کتاب پر جو اس پر نازل ہوئی اور ان (آسمانی) کتب پر جو اس سے پہلے بھیجی گئی ہیں اور جو شخص خدا، اس کے ملائکہ، اس کی کتب، اس کے رسل اور روزِ آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں مُبتلا ہے۔

شانِ نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے بعض سربرآوردہ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان میں عبداللہ بن سلام، اسد بن کعب اور اس کا بھائی اسید بن کعب اور بعض دوسرے لوگ شامل تھے وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ابتداء میں خدمت پیغمبرؐ میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ پر، آپ کی کتاب پر، حضرت موسیٰ پر، تورات پر اور عزیر پر ایمان لائے ہیں لیکن ہم باقی آسمانی کتب اور اسی طرح دیگر انبیاء پر ایمان نہیں لائے۔

مندرجہ بالا آیت اسی سلسلے میں نازل ہوئی جس میں انھیں تعلیم دی گئی کہ انھیں سب پر ایمان لانا چاہیے (تفسیر مجمع البیان۔ المنار)

تفسیر

شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا روئے سخن اہل کتاب کے بعض مومنین کی طرف ہے جو مخصوص تعصبات کی وجہ سے اسلام قبول کر لینے کے بعد صرف اپنے سابق مذہب اور دین اسلام پر اظہار ایمان کرتے تھے اور باقی انبیاء اور آسمانی کتب کو قبول نہیں کرتے تھے لیکن قرآن انھیں نصیحت کرتا ہے کہ وہ تمام انبیاء اور آسمانی کتب کو باقاعدہ تسلیم کریں کیونکہ سب ایک ہی حقیقت کا تسلسل ہیں، سب کا ہدف ایک ہی ہے اور سب ایک ہی مبداء کی طرف سے مبعوث ہوئے ہیں (اگرچہ تعلیم کے درجوں کی مختلف کلاسوں کی طرح مراتب کا فرق موجود ہے اور ہر کوئی گذشتہ دین سے کامل تر دین کے ساتھ آیا ہے) اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے بعض کو تو قبول کر لیا جائے اور بعض کو نہ کیا جائے کیا ایک ہی حقیقت کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

Marfat.com

اور کیا تعصبات حقائق پر پردہ ڈال سکتے ہیں ——— لہٰذا آیت کہتی ہے :

اے ایمان لانے والو! خدا پر، اس کے پیغمبر (رسولِ اسلام) پر اور جو کتاب اس پر نازل ہوئی ہے اس پر نیز گذشتہ آسمانی کتب پر ایمان لے آؤ (یا ایھا الذین اٰمنوا اٰمنوا باللہ ورسولہ والکتاب الذی نزل علی رسولہ والکتاب الذی انزل من قبل)۔

مذکورہ شانِ نزول سے قطع نظر آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ روئے سخن ان تمام مومنین کی طرف ہو جو ظاہراً اسلام قبول کر چکے ہیں لیکن ابھی تک ایمان ان کی روح کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔ یہاں انھیں دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ صمیمِ قلب سے مومن بن جائیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ روئے سخن ان تمام مومنین کی طرف ہو جو اجمالی طور پر خدا اور پیغمبرؐ پر ایمان لا چکے ہیں لیکن اسلام کی جزئیات اور عقائد کی تفصیلات سے آشنا نہیں ہیں۔ یہاں قرآن انھیں حکم دیتا ہے کہ حقیقی مومنین کو چاہیے کہ وہ تمام انبیاء، گذشتہ کتب اور خدا کے فرشتوں پر ایمان لے آئیں، کیونکہ ان پر ایمان نہ لانے کا مطلب حکمتِ خداوندی کا انکار ہے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اللہ جو حکیم ہے اس نے گذشتہ انسانوں کو بغیر رہبر و رہنما کے چھوڑ دیا ہو کہ وہ میدانِ حیات میں سرگرداں رہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جن فرشتوں پر ایمان لانے کے لیے کہا گیا ہے ان سے مراد وحی لانے والے فرشتے ہیں کہ جن پر ایمان لانا انبیاء اور کتبِ آسمانی پر ایمان کے ساتھ لازم و ملزوم ہے یا پھر یہاں تمام فرشتے مراد ہیں کیونکہ جیسے ان میں سے بعض وحی و تشریع کے معاملے میں دخیل ہیں بعض عالمِ تکوین کی تدبیر پر بھی مامور ہیں اور ان پر ایمان لانا حکمتِ الٰہی پر ایمان لانے کا حصہ ہے۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جو ان حقائق سے غافل ہیں ارشاد ہوتا ہے: جو شخص خدا، ملائکہ، کتبِ الٰہی، خدا کے فرستادہ انبیاء اور یومِ آخرت کا انکار کرے تو وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا ہے (ومن یکفر باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاخر فقد ضل ضلالا بعیدا)۔ درحقیقت اس آیت میں پانچ اصولوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اور وہ ہیں مبداء، معاد، آسمانی کتب، انبیاء اور ملائکہ۔

ضلال بعید (دور کی گمراہی) یہ ایک لطیف تعبیر ہے یعنی ایسے لوگ اس طرح سے دور پھینک دیئے گئے ہیں کہ حقیقی شاہراہ کی طرف ان کی واپسی آسانی سے ممکن نہیں ہے۔

۱۳۷۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا ○

۱۳۸۔ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ○

Marfat.com

۱۳۹۔ الَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ؕ

ترجمہ

۱۳۷۔ وہ لوگ جو ایمان لاکر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے اور دوبارہ کافر ہو گئے پھر اپنے کفر میں بڑھ گئے خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا اور نہ ہی انھیں راہِ راست کی ہدایت کرے گا۔

۱۳۸۔ منافقین کو بشارت دو کہ دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

۱۳۹۔ جو لوگ اہلِ ایمان کی بجائے کفار کو اپنا دوست چن لیتے ہیں کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان سے عزت و آبرو حاصل کریں حالانکہ تمام عزتیں تو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تفسیر

ہٹ دھرم منافقین کا انجام

گذشتہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار دور کی گمراہی میں ہیں اب اسی مناسبت سے زیرِ نظر آیت میں سلسلہ کلام آگے بڑھتا ہے پہلی آیت میں ایک ایسے گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر روز اپنے آپ کو ایک نئی شکل وصورت میں پیش کرتا ہے یہ لوگ ایک دن مومنین کی صف میں ہوتے ہیں، دوسرے دن کفار کے ساتھ، اگلے روز پھر اہلِ ایمان کے ساتھ ہوتے ہیں پھر خطرناک اور متعصب کافروں کی صفوں میں موجود ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ بُت عیار کی طرح ہر لمحہ ایک نیا روپ اختیار کرتے ہیں ہر روز ایک نئے رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں اور آخر کار کفر اور بے ایمانی کی حالت میں جان دے دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت ایسے اشخاص کے انجام کے بارے میں کہتی ہے: وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے اور اپنے کفر میں بڑھ گئے خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا اور راہِ راست کی ہدایت نہیں کرے گا (ان الذین اٰمنوا ثم کفروا ثم اٰمنوا ثم کفروا ثم ازدادوا کفرًا لم یکن اللہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم سبیلا)۔

طرزِ روش کا یہ تغیر، ہر روز رنگ وروپ کی یہ تبدیلی اور تلون مزاجی کا یہ عالم دراصل اسلامی اصولوں کی صحیح طور پر تحقیق نہ کرنے کا نتیجہ ہے اور یا منافقین اور اہلِ کتاب میں سے متعصب کفار کی سازش ہے تاکہ حقیقی مومنین کو متزلزل کیا جا سکے کیونکہ ان کے زعم میں ان کی یہ آمد ورفت حقیقی مومنین کے ایمان کو ڈانواں ڈول کر دے گی۔ جیسا کہ سورۂ آلِ عمران

Marfat.com

آیۃ ۲، میں گذر چکا ہے۔

زیر بحث آیت میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہ ہونے کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے آیت کا موضوع سخن صرف وہ لوگ ہیں جو شدت کفر کی حالت میں بالآخر اس دنیا سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ایسے لوگ اپنے ایمان اور عمل کے پیش نظر بخشش کے لائق ہیں نہ ہدایت کے اہل مگر یہ کہ وہ اپنے معاملے میں تجدید نظر کریں۔

بعد ازاں اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: ان منافقین کو بشارت دیجیے کہ دردناک عذاب ان کے لیے تیار ہے (بشر المنافقین بان لھم عذابا الیما)۔

عذاب الیم" کے لیے "بشارت" یا تو ان کے لغو اور بے ہودہ افکار و نظریات کا استھزا ہے یا پھر "بشر" چہرہ کے معنی سے ہے جو ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور ہر اس خبر کو بشارت کہتے ہیں جو انسان کے چہرے پر اثر انداز ہو اور اسے مسرور یا مغموم کر دے۔

آخری آیت میں ان منافقین کی یوں توصیف کی گئی ہے: وہ مومنین کی بجائے کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں (الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین) پھر بتایا گیا ہے کہ اس میں ان کا ہدف اور مقصد کیا ہے: کیا وہ اس دوستی کے ذریعہ واقعی کوئی عزت و آبرو حاصل کرنا چاہتے ہیں (ایبتغون عندھم العزۃ) جبکہ تمام عزتیں خدا کے لیے مخصوص ہیں (فان العزۃ للہ جمیعا) کیونکہ علم کا سرچشمہ ہمیشہ علم و قدرت ہوتا ہے اور جن کی قدرت کی کوئی حیثیت نہ ہو اور ان کا علم بھی ان کی قدرت جیسا ہو وہ کسی کو کیا صاحب عزت کر سکتے ہیں۔

یہ آیت تمام مسلمانوں کو تنبیہ کرتی ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو کے لیے چاہے وہ اقتصادی یا ثقافتی پہلو سے ہو یا سیاسی حوالے سے دشمنانِ اسلام کی دوستی تلاش نہ کریں بلکہ وہ ذات الٰہی پر بھروسہ کریں جو تمام عزتوں کا سرچشمہ ہے۔ دشمنانِ اسلام کی اپنی بھی کوئی عزت نہیں وہ دوسروں کو کیا دیں گے اور اگر ان کی بظاہر کچھ عزت ہو بھی تو وہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں کیونکہ جب بھی ان کے مفاد کا تقاضا ہوا وہ فوراً اپنے مخلص ترین اتحادیوں کو بھی چھوڑ کر اپنی راہ لیں گے اور ان کی یہ حالت ہوگی جیسے کبھی شناسائی ہی نہ تھی۔ دورِ حاضر کی تاریخ بھی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

۱۴۰۔ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَۨا ۝

Marfat.com

ترجمہ

۱۴۰۔ اللہ نے قرآن میں تم پر (یہ حکم) نازل کیا ہے کہ جب تم سنو کہ کچھ لوگ آیاتِ الٰہی کا انکار اور استہزاء کر رہے ہیں تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک وہ کوئی اور گفتگو نہ کرنے لگیں ورنہ اس صُورت میں تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے۔ خدا منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں جمع کر دے گا۔

شانِ نزول

ابن عباس سے اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں منقول ہے کہ بعض منافقین یہودی علماء کی بیٹھکوں میں جا بیٹھتے تھے۔ ان میٹنگوں میں آیاتِ قرآنی کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اسی سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس کام کا بُرا انجام بتایا گیا۔

تفسیر

بُری مجلس میں نہ بیٹھو

سُورہ انعام قرآن حکیم کی مکّی سورتوں میں سے ہے اس کی آیت ۶۸ میں صراحت سے پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ :

اگر آپ دیکھیں کہ کچھ لوگ قرآنی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں اور ناپسندیدہ باتیں کہتے ہیں تو ان سے اعراض کیجئے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ یہ حکم نبی کریمؐ سے مخصوص نہیں بلکہ ایک عمومی حکم ہے البتہ اس میں خطاب پیغمبر سے کیا گیا ہے اس کا فلسفہ بھی بالکل واضح ہے کیونکہ یہ ایسے کاموں سے مقابلے کی ایک منفی صُورت ہے زیرِ بحث آیت میں اس اسلامی حکم کی تاکید کی گئی ہے اور مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ، قرآن میں تمھیں پہلے حکم دیا گیا ہے کہ جب سنو کہ کچھ لوگ آیات قرآنی سے کفر کرتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں تو اس وقت تک ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک کہ اس کام سے صرفِ نظر کر کے دوسرا کام شروع نہ کریں (وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم اٰیٰت اللہ یکفر بھا ویستھزء بھا فلا تقعدوا معھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ)۔

اس کے بعد اس کام کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے ، اگر تم ایسی مجالس میں شرکت کرو گے تو ان جیسے ہو جاؤ گے اور تمھارا انجام بھی ان جیسا ہوگا (انکم اذاً مثلھم)۔

تاکید مزید کے لیے فرمایا گیا ہے : ایسی میٹنگوں میں شرکت روحِ نفاق کی علامت ہے اور خدا منافقین اور کفار سب کو جہنم میں جمع کر دے گا (ان اللہ جامع المنٰفقین والکافرین فی جھنم جمیعًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ مجلس گناہ میں شرکت ارتکابِ گناہ کی مانند ہے اگرچہ شریک ہونے والا خاموش ہی بیٹھا رہے کیونکہ ایسی خاموشی ایک طرح کی رضامندی اور عملی تائید ہے۔

۲۔ نہی عن المنکر اگر "مثبت" صورت میں ممکن نہ ہو تو کم از کم "منفی" صُورت میں ہی انجام دینا چاہیے اس طرح سے کہ انسان گناہ کے ماحول اور گناہ کی مجلس سے ہی دور رہے۔

Marfat.com

۳۔ جو لوگ سکوت اور ایسی مجالس میں شریک ہو کر عملی طور پر گناہگاروں کی تشویق کا باعث بنتے ہیں ان کی سزا بھی ارتکاب گناہ کرنے والوں کی طرح ہے۔

۴۔ کفار کے ساتھ اس صورت میں نشست و برخاست جبکہ وہ آیات خداوندی کی توہین نہ کریں اور ان سے کوئی خطرہ بھی نہ ہو ممنوع نہیں ہے کیونکہ "حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ" کے جملہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام مباح ہے۔

۵۔ ایسے گنہ گاروں سے اچھا برتاؤ نفاق کی علامت ہے کیونکہ حقیقی مسلمان کسی ایسی مجلس میں ہرگز شرکت نہیں کر سکتا جس میں آیات خداوندی اور احکام الٰہی کی توہین ہو رہی ہو ایسا ہو نہیں سکتا کہ ایک حقیقی مسلمان ایسی مجلس میں ہو اور نہ اعتراض کرے اور نہ اظہار ناپسندیدگی کے لیے محفل کو چھوڑے۔

۱۴۱۔ الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِنَ اللَّهِ قَالُوا أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ ۚ وَإِنْ كَانَ لِلْكَافِرِينَ نَصِيبٌ قَالُوا أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝

ترجمہ

۱۴۱۔ منافقین وہ ہیں جو ہمیشہ منتظر رہتے ہیں اور تمھارے نگران رہتے ہیں اگر تمھیں فتح و کامیابی نصیب ہو تو کہتے ہیں کیا ہم تمھارے ساتھ نہیں تھے (لہٰذا ہم بھی افتخار، اعزاز اور مال غنیمت میں تمھارے شریک ہیں) اور اگر کفار کامیاب ہو جائیں تو انھیں کہتے ہیں کیا ہم نے تمھیں جنگ اور مومنین کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی ترغیب نہیں دی تھی (لہٰذا ہم تمھارے ساتھ اس کامیابی میں شریک ہیں) خدا تمھارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اور اس نے ہرگز مومنین پر کافروں کے غلبے کی راہ نہیں بنائی۔

تفسیر

منافقین کی صفات

زیر نظر آیت اور اس کے بعد کی کچھ آیات میں منافقین کی صفات اور ان کے افکار پریشاں کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: منافق وہ ہیں جو ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ ہر پیش آنے والے واقعہ سے مفاد اٹھائیں اگر تمھیں کامیابی حاصل ہو جائے

Marfat.com

تو فوراً اہلِ ایمان کی صفوں میں آکھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کیا ہم تمھارے ساتھ نہیں تھے کیا ہماری بھاری امداد اس کامیابی میں تمھارے کام نہیں آئی لہٰذا ہم بھی ان تمام فوائد میں اور مادی و معنوی منافع میں تمھارے شریک اور حصہ دار ہیں (الذین یتربصون بکم فان کان لکم فتح من الله قالوا الم نکن معکم)۔

لیکن اگر کامیابی اسلام کے دشمنوں کو ہوئی تو فوراً اپنے آپ کو ان کے قریب کر لیتے ہیں اور اس پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ ہم ہی تھے جو تمھیں مسلمانوں سے جنگ کرتے اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے اس لیے ہم بھی تمھاری ان کامیابیوں میں حصہ دار ہیں (وان کان للکفرین نصیب قالوا الم نستحوذ[۱] علیکم ونمنعکم من المؤمنین)۔

اس طرح یہ لوگ اپنی موقع پرستی کے ذریعے چاہتے ہیں کہ مومنین کی کامیابی کی صورت میں افتخار و اعزاز پائیں یہاں تک مالِ غنیمت میں بھی حصہ دار بنیں اور ان پر احسان جتلائیں اور دوسری طرف کفار کی کامیابی پر بھی خوش ہوتے ہیں انھیں کفر میں پختہ تر کرتے ہیں مسلمانوں کے خلاف ان کے حق میں جاسوسی کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کی راہ ہموار کرتے ہیں گویا وہ "رفیق قافلہ" بھی ہیں اور "شریک راہزن" بھی۔ وہ اپنی زندگی اسی دوہرے کھیل میں گزار دیتے ہیں۔

قرآن ایک مختصر سے جملے میں ایسے لوگوں کا انجام بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: آخر کار ایک دن آ ہی جائے گا جب پردے اُٹھ جائیں گے اور ان کے بُرے چہروں سے نقاب پلٹ دیئے جائیں گے ہاں "قیامت کے دن تمھارے درمیان خدا فیصلہ کرے گا" (فالله یحکم بینکم یوم القیٰمة) لہٰذا حقیقی مومنین کو چاہیے کہ ان سے مرعوب نہ ہوں۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: کبھی خدا مومنین پر کافروں کے تسلط کی راہ نہیں بناتا (ولن یجعل الله للکافرین علی المؤمنین سبیلا) کیا اس جملے سے مراد یہ ہے کہ منطق و استدلال کے لحاظ سے کفار کبھی مومنین پر غلبہ نہیں پائیں گے یا اس سے فوجی کامیابی یا ایسی کوئی اور کامیابی مراد ہے اس سلسلے میں ہم بعض پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔

لفظ "سبیل" اصطلاح کے مطابق "نکرہ سیاق نفی میں" کے قبیل سے ہے جو کہ عمومیت کے معنی دیتا ہے لہٰذا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف منطق و استدلال سے بلکہ سیاسی، فوجی، ثقافتی، اقتصادی غرض کسی لحاظ سے بھی کفار اہلِ ایمان پر غالب نہیں آئیں گے آج اگر مختلف میدانوں میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کفار مسلمانوں پر غالب ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر مسلمان حقیقی مومن نہیں ہیں۔ آج مسلمان ایمان کے تقاضے، اپنی ذمہ داریاں، اپنا حقیقی طرزِ عمل اور اسلامی افکار سب کچھ فراموش کر چکے ہیں نہ ان میں اتحاد اور اخوت اسلامی کی کوئی خبر ہے نہ حقیقی معنی میں جہاد کرتے ہیں اور نہ وہ علم و آگہی کے حامل ہیں، حالانکہ

---

[۱] "استحوذ" کا مادہ "حوذ" ہے یہ رانوں کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں۔ ساربان جب اونٹ کو تیز چلانا چاہتا ہے تو اس کے پیچھے ہو کر اس کی رانوں اور پشت پر مارتا ہے لہٰذا "استحواذ" چلانے اور متحرک کرنے کے حوالے سے تسلط و غلبہ کا مفہوم دیتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت بھی اسی معنی میں ہے۔

Marfat.com

اسلام نے ان سب پر حصولِ علم لمحہ ولادت سے لے کر لحظہ موت تک لازم قرار دے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بعض فقہا نے حقوق اور حکم کے حوالے سے مختلف مسائل میں مومنین پر کفار کے عدم تسلط کے لیے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ آیت کی عمومیت کے پیشِ نظر یہ بات زیادہ بعید نظر نہیں آتی (غور کیجیے گا)۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کی کامیابی کے لیے "فتح" کا لفظ استعمال ہوا ہے جبکہ کفار کی کامیابی کے لیے لفظ "نصیب" استعمال ہوا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کفار کو کچھ کامیابیاں نصیب ہوں تو وہ محدود، وقتی اور ناپائیدار ہوں گی آخری فتح تو اہلِ ایمان ہی کو حاصل ہوگی۔

۱۴۲۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

۱۴۳۔ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝

ترجمہ

۱۴۲۔ منافقین اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ انھیں دھوکا دیتا ہے (یعنی ان کا فریب باطل کر دیتا ہے) اور جب وہ نماز کے لیئے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ سستی اور کسالت کے ساتھ، لوگوں کے سامنے ریاکاری کرتے ہیں اور خدا کو یاد نہیں کرتے مگر تھوڑا سا۔

۱۴۳۔ وہ بے ہدف افراد ہیں نہ اِن کی طرف مائل ہیں نہ اُن کی طرف (نہ اہل ایمان کی صف میں ہیں نہ کافروں کی قطار میں) اور جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لیے تمھیں کوئی راہ نہ ملے گی۔

تفسیر

منافقین کی پانچ صفات

وہ اپنے منحوس مقاصد کی تکمیل کے لیے دھوکا اور فریب دہی کی راہ اختیار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ چاہتے ہیں کہ

Marfat.com

خدا کو بھی دھوکا دے دیں۔ حالانکہ جب وہ ایسا کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں خود فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ وہ ناچیز اور حقیر سرمایے کے حصول کے لالچ میں اپنا وجود اور انسانیت کا عظیم سرمایہ اپنے ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں (ان المنافقین یخادعون اللہ وھو خادعھم)۔

مندرجہ بالا تفسیر "وھو خادعھم" کی واؤ سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہاں واؤ حالیہ ہے۔

بعض بزرگوں سے ایک قصہ منقول ہے، ایک بزرگ پیشہ وروں سے کہتے تھے:

"ڈرو، کہیں غریب مسافر تمھیں دھوکا نہ دے دیں۔"

کسی نے کہا: وہ تو انجان اور سادہ لوح ہوتے ہیں اور ہم انھیں دھوکا دے سکتے ہیں۔

بزرگ نے کہا: میرا مقصد بھی یہی ہے کہ اس طرح دھوکا دے کر تم ناچیز سرمایہ تو حاصل کر بیٹھتے ہو اور ایمان کا عظیم سرمایہ گنوا بیٹھتے ہو۔

۲۔ وہ خدا سے دور ہیں، اس سے راز و نیاز کی لذت سے محروم ہیں لہٰذا "جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سرتاپا کسالت، سستی اور بے حالی میں غرق ہوتے ہیں (واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالی)۔

۳۔ وہ چونکہ خدا اور اس کے عظیم وعدوں پر ایمان نہیں رکھتے لہٰذا اگر کوئی عبادت یا کوئی نیک کام انجام بھی دیتے ہیں تو وہ بھی ریاکاری کے لیے نہ کہ خدا کے لیے (یراءون الناس)۔

۴۔ وہ اگر کوئی ذکر بھی کرتے ہیں یا خدا کو یاد کرتے ہیں تو صمیم قلب سے نہیں اور نہ آگاہی و بیداری سے اور اگر ہو بھی تو بہت ہی کم (ولا یذکرون اللہ الا قلیلا)۔

۵۔ یہ لوگ سرگرداں اور بے ہدف جیتے ہیں ان کے پاس نہ زندگی کا کوئی پروگرام ہے نہ کوئی واضح راستہ۔ نہ وہ مومنین میں سے ہیں اور نہ کفار میں سے (مذبذبین بین ذٰلک لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء)۔

توجہ رہے کہ "مذبذب" اسم مفعول ہے اس کا مادہ "ذبذب" ہے یہ ایک مخصوص صدا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب کوئی چیز آویزاں ہو، ہوا کی موجیں اسے حرکت دیں تو جو آواز اس ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے اسے "ذبذب" کہتے ہیں، بعد ازاں یہ لفظ متحرک اشیاء، سرگرداں اور بے ہدف لوگوں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ منافقین کے بارے میں قرآن حکیم میں استعمال ہونے والی یہ لطیف ترین تعبیر ہے۔ ضمناً یہ تعبیر اس مطلب کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ ایسا نہیں کہ منافقین کو پہچانا نہ جا سکے بلکہ ان کا یہ تذبذب ایک خاص آہنگ سے ہم رنگ ہوتا ہے جس کی طرف توجہ کرنے سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ اس تعبیر سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ منافقین ایک معلق اور آویزاں جسم کی طرح ہیں اور ذاتی طور پر ان کے بس میں کچھ نہیں یہ تو مختلف ہوائیں چلتی ہیں جو انھیں ادھر ادھر حرکت دیتی ہیں جدھر کو ہوا کا رخ ہو ان کی حرکت بھی ادھر کو ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں ان کا انجام اس طرح بیان کیا گیا ہے، وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے اعمال کے باعث اللہ نے اپنا دست حمایت ان سے اٹھا لیا اور انھیں بے راہ رویوں میں گمراہ چھوڑ دیا ہے اور "جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لیے تمھیں کبھی راہ نجات نہیں ملے گی" (ومن یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلا)۔

Marfat.com

خدا کے گمراہ کرنے سے متعلق اور یہ کہ اس سے اختیار اور ارادے کی نفی نہیں ہوتی ـــــــ تفسیر نمونہ جلد اول سورۂ بقرہ آیت ۲۶ کے ذیل میں بحث کی جا چکی ہے۔

۱۴۴۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ط
اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ○
۱۴۵۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج وَلَنْ تَجِدَ
لَهُمْ نَصِیْرًا ○
۱۴۶۔ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا
دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ط وَسَوْفَ یُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ
اَجْرًا عَظِیْمًا ○

ترجمہ

۱۴۴۔ اے ایمان والو! مومنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور سہارا نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ (ایسا کر کے) اپنے خلاف بارگاہ الٰہی میں ایک واضح دلیل قائم کر لو۔

۱۴۵۔ (کیونکہ) منافقین تو دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہیں اور تمھیں ان کا ہرگز کوئی مددگار نہیں ملے گا (لہٰذا دشمنان خدا کی دوستی سے پرہیز کرو کیونکہ یہ نفاق کی علامت ہے)۔

۱۴۶۔ مگروہ جو توبہ کر لیں اور اصلاح و تلافی کر لیں اور خدا (کے لطف کے دامن) سے وابستہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو خدا کے لیے خالص کر لیں وہ مومنین کے ساتھ ہوں گے اور خدا اہل ایمان کو اجر عظیم عطا کرے گا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں منافقوں اور کافروں کی کچھ صفات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ان آیات میں پہلے تو مومنین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ مومنین کی بجائے کافروں (اور منافقوں) کو اپنا سہارا اور ولی نہ سمجھیں (یآیھا الذین امنوا لا تتخذوا الکافرین اولیاء من دون المؤمنین) کیونکہ یہ قانون شکنی اور خدا سے شرک کے مترادف ہے اور عدالت الٰہی کے قانون کے

Marfat.com

مطابق اس کی بہت سخت سزا ہے اسی لیے فرماتا ہے: کیا تم چاہتے ہو کہ بارگاہِ الٰہی میں اپنے خلاف ایک دلیل قائم کرلو (اتریدون ان تجعلوا للہ علیکم سلطانا مبینا)[1]۔

بعد والی آیت میں ان منافقین کی حالت واضح کی گئی ہے جن کی دوستی کا طوق غافل مسلمانوں نے اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے۔ یا پھر انھی کی حالت بیان کی گئی ہے جو اظہار اسلام کے باوجود نفاق کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے، منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور تمھیں ان کا کوئی مددگار دکھائی نہ دے گا (ان المنٰفقین فی الدرک الاسفل من النار ولن تجد لھم نصیرا)[2]۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں نفاق کفر کی بدترین اقسام میں سے ہے اور منافق خدا سے سب سے زیادہ دور ہیں اسی لیے ان کا ٹھکانا جہنم کا بدترین اور پست ترین طبقہ ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ انسانی معاشرے کو منافقین سے جو خطرات لاحق ہوتے ہیں ان کا کسی اور خطرے سے موازنہ نہیں کیا جا سکے گا۔ اظہار ایمان کی وجہ سے جو مقام اور تحفظ انھیں حاصل ہوتا ہے وہ اسے بے دفاع افراد کے خلاف بزدلانہ طریقے سے استعمال کرتے ہیں اور پشت کی جانب سے خنجر گھونپتے ہیں یہ بات مسلم ہے کہ جو بزدل اور خطرناک دشمن دوستی کے روپ میں حملہ آور ہو وہ اس سے کہیں بدتر ہے جو کھلے بندوں دشمنی کا اعلان کرے اور اپنے آپ کو واضح طور پر پیش کرے۔ دراصل نفاق کا راستہ گھٹیا، پست، بزدل، بے وقعت اور ہر لحاظ سے آلودہ افراد ہی اختیار کرتے ہیں۔

یہ بات واضح کرنے کے لیے کہ ایسے افراد بھی جو اس قدر آلودۂ گناہ ہیں چاہیں تو خدا کی طرف لوٹ آئیں اور اپنی اصلاح کریں، مزید فرمایا: مگر یہ کہ ایسے لوگ توبہ کریں، اپنے اعمال کی اصلاح کریں (اور گذشتہ اعمال کی تلافی کریں)، لطف الٰہی سے متمسک ہوں اور اپنا دین و ایمان اللہ کے لیے خالص کریں (الا الذین تابوا و اصلحوا و اعتصموا باللہ واخلصوا دینھم للہ)۔ ایسے لوگ آخرکار نجات یافتہ ہو سکتے ہیں اور مومنین کے ساتھی بن سکتے ہیں (فاولٰئک مع المؤمنین) اور خدا تمام صاحبانِ ایمان کو اجر عظیم اور جزائے جزیل سے نوازے گا (وسوف یؤت اللہ المؤمنین اجرا عظیما)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ مومنین کے ہمراہ ہوں گے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ثابت قدم مومنین کا مقام ان سے برتر ہوگا وہ اصل ہیں اور یہ فرع۔ یہ تو سچے مومنین کے پرتو سے نور حاصل کریں گے۔

---

[1] "سلطان" کا مادہ "سلاطہ" (بروزن "مقالہ") ہے جس کا معنی ہے دوسرے کو مقہور و مغلوب کرنے کی قدرت۔ خود لفظ "سلطان" اسم مصدر کا معنی رکھتا ہے اور ہر قسم کے تسلط کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی بنا پر "دلیل" کو بھی "سلطان" کہا جاتا ہے جو کہ ایک انسان کے دوسرے پر غلبہ کا باعث بنتی ہے بعض اوقات صاحبانِ قدرت کو بھی "سلطان" کہتے ہیں لیکن مندرجہ بالا آیت میں "سلطان" "دلیل و حجت" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[2] "درک" (بروزن "مرگ") دریا کی گہرائی کے گہرے ترین مقام کو کہتے ہیں نیز رسیوں کو گرہ دے کر دریا میں ڈالا جائے تو آخری رسی جو گہرائی تک جا پہنچے اسے درَک (بروزن "فلک") کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب الفاظ کسی چیز کو پہچاننے اور اس تک پہنچ جانے کا مفہوم دیتے ہیں بعض اوقات تہ خانے کی سیڑھیوں کو بھی درک کہتے ہیں جب کہ چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کو "درجہ" کہتے ہیں۔

Marfat.com

دوسری بات جو قابل غور ہے یہ ہے کہ منافقین کا انجام بیان کرنے کے لیے انھیں دوزخ کا پست ترین طبقہ قرار دیا گیا ہے جب کہ مومنین کے بارے میں "اجرِ عظیم" کی بشارت دی گئی ہے جس کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے اور اس اجر کی عظمت لطفِ الٰہی سے وابستہ ہے۔

۱۴۷۔ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ○

ترجمہ

۱۴۷۔ خدا تھیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر ادا کرو (اور نعمتوں کو مناسب طریقے سے استعمال کرو) اور ایمان لے آؤ، خدا شکر گذار (قدردان) اور آگاہ ہے (ان کے اعمال اور نیتوں کو جانتا ہے اور جو اچھا ہے اسے اچھی جزا دے گا)۔

تفسیر

خدا کی سزا انتقامی نہیں

گذشتہ آیات میں کافروں اور منافقوں کے لیے سخت سزاؤں کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں ایک اہم حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ یہ کہ خدا کی طرف سے دردناک سزائیں اس بنا پر نہیں ہیں کہ وہ چاہتا ہے کہ گنہ گار بندوں سے انتقام لے یا اپنی قدرت کا مظاہرہ کرے یا ان کی نافرمانی اور عصیان سے اسے کوئی نقصان پہنچا ہے جس کی وہ تلافی کرنا چاہتا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں تو کسی نقص اور کمی کا مظہر ہیں جبکہ خدا کی ذات ہر نقص اور کمی سے مبرا ہے بلکہ یہ سب سزائیں خود انسانوں کے بُرے افکار و اعمال کا ردِ عمل اور نتیجہ ہیں۔ اسی لیے فرماتا ہے، اگر تم شکر گذاری کرو اور ایمان لے آؤ تو خدا کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ تھیں سزا دے (ما یفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم و اٰمنتم)۔

شکر کا مفہوم یہ ہے کہ ہر نعمت کو اس طریقے سے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا جملے سے مراد یہ ہے کہ اگر تم ایمان لے آؤ اور عملِ صالح کرو، نعماتِ الٰہی کو مناسب طور پر استعمال کرو اور ان سے غلط فائدہ نہ اٹھاؤ تو بلاشبہ تھوڑی سی سزا بھی تمھارے دامن کو نہ چھوئے گی۔

تاکید مزید کے لیے کہتا ہے؛ خدا تمھارے اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے اور تمھارے نیک اعمال کے بدلے میں وہ بھی شاکر اور جزا دینے والا ہے (وکان اللہ شاکرًا علیمًا)۔

Marfat.com

زیر نظر آیت میں "شکر" کو "ایمان" پر مقدم رکھا گیا ہے یہ اس بناء پر ہے کہ انسان جب تک اس کی نعمتوں کو پہچان نہ لے اور شکر گذاری کے مقام تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک خود اسے نہیں پہچان سکتا۔ کیونکہ اس کی نعمتیں اس کی معرفت کا ذریعہ ہیں۔ اسلامی عقائد کی کُتب میں بھی "وجوب معرفت الٰہی" کے لیے بعض لوگ "وجوب شکر منعم" کی دلیل پیش کرتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ شکر گذاری انسانی فطرت ہے اور نعمتیں بخشنے والے کا شکر ادا کرنا واجب ہے لہٰذا اس نعمتیں عطا کرنے والے کی معرفت بھی واجب ہے (غور کیجیے گا)۔

۱۴۸۔ لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝

۱۴۹۔ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝

ترجمہ

۱۴۸۔ خدا پسند نہیں کرتا کہ کوئی شخص بُری باتیں کہے مگر یہ کہ جو ظلم و ستم سے مجبور ہو اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۱۴۹۔ (لیکن) اگر نیکیوں کو آشکار کرو یا مخفی رکھو یا برائیوں سے صرف نظر رکھو (تو تمھیں اس کی جزا دی جائے گی) خدا بخشنے والا اور قادر و توانا ہے (اور انتقام کی قدرت کے باوجود عفو و درگذر کرتا ہے)۔

تفسیر

اسلام کے چند اخلاقی احکام

ان دو آیتوں میں اسلام کے کچھ اخلاقی احکام بیان ہوئے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے: خدا پسند نہیں کرتا کہ بدگوئی کی جائے یا بعض لوگوں کے عیب اور بُرے کام برملا بیان کیے جائیں (لا یحب اللّٰہ الجھر بالسوء من القول) کیونکہ خدا خود ستار العیوب ہے وہ پسند نہیں کرتا کہ لوگوں کی پردہ دری کی جائے اور لوگوں کے عیب فاش کیے جائیں اور ان کی عزت و آبرو برباد کی جائے۔ علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان کے عام طور پر کچھ نہ کچھ کمزور اور مخفی پہلو ہوتے ہیں اگر یہ عیب ظاہر ہو جائیں تو پورے معاشرے میں بداعتمادی کی ایک ایسی فضا پیدا ہو جائے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل ہو جائے لہٰذا اجتماعی رشتوں کا استحکام اور

Marfat.com

بشری تقاضوں کو ملحوظ نظر رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ کسی صحیح مقصد کے بغیر کسی کے مخفی اور کمزور پہلوؤں کا اظہار نہ ہو۔

ضمناً توجہ رہے کہ "سوء" سے مراد ہر طرح کی برائی اور قباحت ہے اور "جہر"، "من القول" سے مراد ہر قسم کا لفظی اظہار ہے، چاہے وہ شکایت کی صورت میں ہو یا چغلی کی۔ یہی وجہ ہے کہ جن آیات سے غیبت کی حرمت کے بارے میں استدلال کیا گیا ہے ان میں زیر نظر آیت بھی شامل ہے لیکن آیت کا مفہوم غیبت میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس میں ہر طرح کی بدگوئی کی ممانعت کی گئی ہے۔

اس کے بعد بدگوئی کی استثنائی صورت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مگر وہ شخص جو ظلم وستم کے ہاتھوں مجبور ہو (الا من ظلم) ایسے لوگ حق رکھتے ہیں کہ اپنے دفاع کے لیے ظالم کے ظلم کی شکایت کریں یا واضح طور پر ظلم وستم کی مذمت کریں اور ان پر تنقید کریں اور جب تک اپنا حق نہ لے لیں اور ظلم وستم کا ازالہ نہ کرلیں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں۔

درحقیقت یہ استثناء اس لیے ہے کہ کہیں مندرجہ بالا حکم سے ظالم اور ستمگر غلط فائدہ نہ اٹھائیں یا یہ حکم ظلم وستم کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا بہانہ نہ بن جائے۔

واضح ہے کہ ایسے مواقع پر صرف ظالم کے ظلم اور مظلوم کے دفاع سے مربوط باتوں پر ہی اکتفا کیا جانا چاہیے۔

آیت کے آخر میں قرآن اپنی روش کے مطابق کہ کہیں کوئی مظلوم بن کر اس استثناء سے سوء استفادہ نہ کرے اور بلاوجہ لوگوں کے عیب بیان کرتا پھرے، فرماتا ہے: خدا باتوں کو سنتا اور نیتوں سے واقف ہے (و کان اللہ سمیعًا علیمًا)۔

بعد والی آیت میں اس حکم کے نقطہ مقابل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، فرمایا: اگر لوگوں کی نیکیوں کو ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو تو اس میں کوئی حرج نہیں (جبکہ برائیاں استثنائی مواقع کے علاوہ مطلقاً چھپائی جانا چاہییں) نیز اگر برائیوں کے مقابلے میں لوگوں سے عفو وبخشش کی راہ اپناؤ تو بہتر ہے کیونکہ درحقیقت یہ الٰہی طرز عمل ہے کہ جو ہر قسم کے انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود اپنے اہل بندوں کے بارے میں عفو وبخشش سے کام لیتا ہے (ان تبدوا خیرا او تخفوه او تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفوًا قدیرًا)۔

دوسری آیت دراصل دو پہلوؤں سے پہلی آیت کا نقطہ مقابل قرار دی جاسکتی ہے پہلا یہ کہ برائیوں کے اظہار کے مقابلے میں نیکیوں کا اظہار اور دوسرا جن پر ظلم وستم ہوا ان کی طرف سے عفو وبخشش۔

ظالم سے درگذر اس کی تقویت کا سبب نہیں؟

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ستم گر سے درگذر حقیقت میں اس کے ظلم کی تائید نہیں اور کیا یہ کام ایسے ظلم کے جاری رہنے کے لیے تشویق وترغیب کا باعث نہیں ہوگا اور کیا یہ عمل مظلوموں کے ذہنوں کو سلا دینے والا نہیں ہے اور کیا منفی ردعمل پیدا نہیں کرے گا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عفو ودرگذر کا اپنا محل ومقام ہے اور اظہار حق اور ظلم کے مقابلے کا موقع جدا ہے۔ اسی لیے احکام اسلامی میں ایک طرف ہے:

"لا تظلمون ولا تظلمون"

Marfat.com

"نہ ظلم کرو اور نہ ظلم گوارا کرو" ——— (بقرہ ——— ۲۷۹)

اور یہ بھی کہ :-

کونا للظالم خصما و للمظلوم عونا

یعنی ——— ظالم کے دشمن بنو ، اور مظلوم کے ساتھی ۔ [1]

نیز یہ بھی کہ :-

فقاتلوا التی تبغی حتی تفئ الی امر اللہ

یعنی ——— ظالموں سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں ۔

(حجرات ——— ۹)

دوسری طرف عفو و درگذر اور بخشش کا حکم دیا گیا ؛

و ان تعفوا اقرب للتقوی

اور ——— اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب تر ہے ۔

(بقرہ ——— ۲۳۷)

یہ بھی فرمایا کہ :

ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم

یعنی ——— معاف کر دو اور درگذر سے کام لو، کیا تم پسند نہیں کرتے کہ خدا تمھیں بخش دے ۔

(نور ——— ۲۲)

ہو سکتا ہے کہ بعض کوتاہ نظر لوگوں کو ابتداء میں ان احکام میں تفاوت اور تضاد نظر آئے لیکن اسلامی مصادر اور کتب میں موجود احادیث کی طرف توجّہ کی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عفو و درگذر کا اپنا مقام ہے اور ظلم کی سرکوبی کے لیے مقابلے کا ایک الگ موقع و محل ہے ۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ عفو و درگذر اس موقع کے لیے ہے جہاں قدرت اور دشمن پر کامیابی حاصل ہو اور دشمن آخری شکست سے دوچار ہو جائے یعنی جہاں دشمن کی طرف سے کوئی نیا خطرہ محسوس نہ ہوتا ہو ۔ اس موقع پر عفو و درگذر ایک طرح سے اصلاحی اور تربیتی اقدام ہے اور یہ طرزِ عمل دشمن کو اپنے طرزِ عمل پر نظرثانی پر آمادہ کرے گا ۔ تاریخ اسلام میں ایسے بہت سے مواقع کا تذکرہ موجود ہے حضرت امیر المومنینؑ کا یہ فرمان اس نقطہ نظر پر شاہد ہے ، آپؑ نے فرمایا :

"اذا قدرت علی عدوك فاجعل العفو عنه شكرا للقدرة عليه"

جب دشمن پر کامیابی حاصل کر لو تو عفو و بخشش کو اس کامیابی کی زکوٰۃ اور شکر کا ذریعہ قرار دو ۔ [2]

---

[1] نہج البلاغہ ، وصیت نامہ نمبر ۴۷

[2] نہج البلاغہ ، کلمات قصار ، کلمہ ۱۰

Marfat.com

دوسری طرف ایسے مواقع جہاں دشمن کا خطرہ ابھی باقی ہو اور احتمال ہو کہ درگذر کرنا اسے جرأت دے گا اور اس کی حوصلہ افزائی کرے گا یا یہ کہ عفو و بخشش یہاں ظلم کی تائید شمار ہو گی تو اسلام ایسی بخشش اور معافی کی کبھی اجازت نہیں دیتا اور ایسے مواقع پر رہبران اسلام نے کبھی عفو و بخشش کی راہ نہیں اپنائی۔

۱۵۰۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ ○

۱۵۱۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ○

۱۵۲۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ ع

ترجمہ

۱۵۰۔ جو لوگ خدا اور پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں اور ان میں تبعیض اور فرق روا رکھنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان دو کے درمیان کوئی راہ منتخب کریں۔

۱۵۱۔ وہ پکے کافر ہیں اور کفّار کے لیے ہم نے ذلّت آمیز سزا فراہم کر رکھی ہے۔

۱۵۲۔ (لیکن) وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق روا نہیں رکھتے انھیں ان کی جزا دیں گے، خدا سننے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

انبیاء میں فرق نہیں ہے

ان آیات میں کفّار اور مومنین کی حالت بیان کی گئی ہے اور ان کے انجام کا تذکرہ ہے یہ آیات گذشتہ آیات کی تکمیل کرتی ہیں جن میں منافقین کا ذکر تھا۔

Marfat.com

پہلے تو ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو انبیاءِ الٰہی میں فرق روا رکھتے ہیں۔ بعض کو حق پر سمجھتے ہیں اور بعض کو باطل پر۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو خدا اور اس کے پیغمبروں کے کافر اور منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ خدا اور اس کے پیغمبروں میں فرق روا رکھیں اور کہتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض پر تو ایمان رکھتے ہیں اگرچہ بعض کو قبول نہیں کرتے۔ اپنے گمان میں وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کی کوئی راہ نکالیں یہی حقیقی کافر ہیں (ان الذین یکفرون باللہ و رسلہ و یریدون ان یفرقوا بین اللہ و رسلہ و یقولون نؤمن ببعض و نکفر ببعض و یریدون ان یتخذوا بین ذٰلک سبیلا اولئک ھم الکافرون حقا)۔

یہ جملہ دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کی حالت بیان کر رہا ہے یہودی حضرت عیسیٰؑ کو نہیں مانتے اور یہودی اور عیسائی دونوں حضرت پیغمبر اسلامؐ کو نہیں مانتے حالانکہ ان کی اپنی کتابوں کے مطابق ان پیغمبروں کی نبوت ثابت شدہ ہے۔ حقائق کو قبول کرنے میں اس تبعیض کا سرچشمہ ہوا و ہوس اور جاہلانہ تعصبات ہیں اور بعض اوقات بے وجہ کا حسد اور تنگ نظری سد راہ ہوتی ہے یہ طرز عمل دراصل خدا پر اور انبیاء پر ایمان نہ لانے کی نشانی ہی ہے کیونکہ ایمان یہ نہیں ہے کہ جو کچھ اپنی طبیعت اور میلان کے مطابق ہو اسے تسلیم کر لیا جائے اور جو مزاج اور ہوس کے خلاف ہو اسے رد کر دیا جائے یہ تو ایک طرح کی نفس پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی حقیقی ایمان تو یہ ہے کہ انسان حقیقت کو قبول کرے چاہے اس کے میلان طبع کے خلاف ہی کیوں نہ ہو لہٰذا قرآن ایسے افراد کو مندرجہ بالا آیت میں کافر قرار دیتا ہے اگرچہ وہ خدا پر اور بعض انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں (ان الذین یکفرون باللہ و رسلہ ....
اس لیے جن چیزوں پر وہ اظہار ایمان کرتے ہیں اسے بھی بے وقعت قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس ایمان کا سرچشمہ جستجوئے حق نہیں ہے۔

آخر میں انھیں سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے کفّار کے لیے ذلت آمیز اور رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے (واعتدنا للکفرین عذابا مھینا)۔ اس میں عذاب کو "مُہِین" (ذلت آمیز) قرار دیا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انھوں نے انبیاء میں تبعیض اور فرق روا رکھ کے دراصل ان میں سے بعض کی توہین کی ہے لہٰذا ان کی سزا ان کے عمل کی مناسبت سے ہونا چاہیے۔

گناہ اور سزا میں تناسب

سزا بعض اوقات "عذاب الیم" کی شکل میں ہوتی ہے مثلاً کوڑے لگانا اور بدنی تکلیف پہنچانا، بعض اوقات رسوا کن ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کے لباس پر کیچڑ ڈالنا وغیرہ۔ کبھی شور و شین سے مملو عذاب عظیم کی صورت میں، مثلاً کچھ لوگوں کی موجودگی میں سزا دینا اور بعض اوقات سزا کا اثر وجود انسانی پر گہرا ہوتا ہے اور ایک مدت تک باقی رہتا ہے جسے عذابِ شدید کہتے ہیں۔ مثلاً طویل المدت قید بامشقت اور دیگر سزائیں۔

واضح ہے کہ عذاب کی ان میں سے کوئی بھی نوعیت گناہ کی نوعیت کی مناسبت سے ہے۔ اسی لیے بہت سی آیاتِ قرآنی میں ظالموں کی سزا "عذابِ الیم" قرار دی گئی ہے کیونکہ بندگانِ خدا پر دردناک ظلم کرنے سے یہی سزا مناسبت رکھتی ہے۔

Marfat.com

جن کا گناہ توہین آمیز ہے ان کی سزا بھی ذلّت آمیز ہے۔ اس طرح جو لوگ بڑے اور شدید گناہ کرتے ہیں ان کی سزا بھی اسی قسم کی ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں کا مقصد مطلب کو ذہن نشین کرانا ہے ورنہ اس جہان کی سزاؤں کا قیاس اُس جہان کی سزاؤں پر نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد مومنین کی کیفیت اور انجام کا ذکر ہے، فرمایا: وہ لوگ جو خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے ہیں اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور اس طرح حق کے سامنے اپنے جذبۂ تسلیم اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں اور وہ ہر طرح کے ناروا تعصب کے مقابلے میں اپنے قیام کا ثبوت دیتے ہیں خدا بہت جلد انھیں جزا دے گا (والذین امنوا باللہ ورسلہ ولم یفرقوا بین احد منھم اولٰئک سوف یؤتیھم اجورھم)۔

البتہ پیغمبروں پر ایمان لانا اور عملاً انھیں تسلیم کرلینا اس بات کے منافی نہیں کہ ان میں سے بعض کو بعض سے افضل مانا جائے کیونکہ ان کی ماموریت اور ذمہ داریوں کے فرق کے لحاظ سے انکے مراتب میں فرق یقینی ہے۔ مقصد یہاں یہ ہے کہ انبیاء پر ایمان لانے اور انھیں عملاً تسلیم کرنے میں ہم کوئی فرق نہ کریں۔

آیت کے آخر میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ مومنین پہلے ایسے تعصبات اور تفریق کے قائل رہے ہیں، یا دوسرے گناہوں کے مرتکب رہے ہیں تو اب اگر وہ اپنے ایمان کو خالص کر کے خدا کی طرف لوٹ آئیں تو خدا انھیں بخش دے گا اور خدا ہمیشہ سے بخشنے والا اور مہربان ہے (وکان اللہ غفورًا رحیمًا)۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ زیرِ نظر آیات میں انبیاء میں تبعیض و تفریق کے قائل لوگوں کو حقیقی کفار قرار دیا گیا ہے لیکن جو سب پر ایمان لائے ہیں انھیں حقیقی مومن نہیں کہا گیا بلکہ صرف مومن کہا گیا ہے شاید فرق اس بنا پر ہو کہ حقیقی مومن وہ ہیں جو ایمان کے علاوہ عمل کے لحاظ سے بھی بالکل پاک اور صالح ہوں۔ اس بات کی شاہد وہ آیات ہیں جو سورۂ انفال کی ابتداء میں آئی ہیں جن میں خدا پر ایمان لانے کے بعد مومنین کی صفات میں ایک مثبت اور زندہ سلسلہ اعمال بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اخلاقی، اجتماعی اور ایمانی رشد کے علاوہ نماز، زکوٰۃ اور توکل بر خدا کی صفات بھی شامل ہیں اور اس کے بعد فرماتا ہے:

اولٰئک ھم المؤمنون حقًّا

یہ ہیں پکے اور حقیقی مومن۔ (انفال ــــــ ۴)

۱۵۳- یَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ○

Marfat.com

۱۵۴۔ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ بِمِيۡثَاقِهِمۡ وَقُلۡنَا لَهُمُ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا
وَّقُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِى السَّبۡتِ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا
غَلِيۡظًا ○

ترجمہ

۱۵۳۔ اہلِ کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ (ایک ہی مرتبہ) آسمان سے ایک کتاب ان پر نازل کر دو (حالانکہ یہ تو ایک بہانہ ہی ہے) انھوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بہت بڑا سوال کیا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں ظاہر بظاہر خدا دکھا دے۔ اسی ظلم کی وجہ سے بجلی نے انھیں آلیا تھا۔ پھر انھوں نے ان واضح دلائل کے باوجود جو ان کے لیے آئے تھے (سامری کے) گؤ سالہ کو (خدا کے طور پر) منتخب کر لیا پھر بھی ہم نے انھیں معاف کر دیا اور موسیٰ کو ہم نے واضح برتری عطا کی۔

۱۵۴۔ اور ہم نے کوہِ طور ان کے اوپر بلند کیا اور اسی حالت میں ان سے عہد و پیمان لیا اور ان سے کہا کہ (توبہ کے طور پر بیت المقدس کے) دروازے سے خضوع کے ساتھ آؤ (نیز) ہم نے ان سے کہا کہ ہفتہ کے روز تجاوز نہ کرو (اور کاروبار سے ہاتھ کھینچ لو) اور (ان تمام باتوں کے بارے میں) ہم نے ان سے محکم عہد و پیمان لیا۔

شانِ نزول

تفسیر تبیان، مجمع البیان اور روح المعانی میں ان آیات کی شانِ نزول میں لکھا ہے کہ کچھ یہودی پیغمبر اسلام کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے کہ اگر تم اللہ کے پیغمبر ہو تو اپنی آسمانی کتاب ایک ہی دفعہ ہمارے سامنے پیش کرو جیسا کہ موسیٰ تورات کو اکٹھا لے کر آئے تھے۔

تفسیر

یہودیوں کی بہانہ سازی

آیات میں پہلے اہلِ کتاب (یہودیوں) کے تقاضے کا تذکرہ ہے۔ فرمایا: اہلِ کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ (یکجا) ایک کتاب آسمان سے ان پر نازل کرو (یسئلك اهل الكتاب ان تنزل عليهم كتابًا من السمآء)۔

Marfat.com

اس میں شک نہیں کہ ان کی اس فرمائش میں حسنِ نیّت شامل نہ تھی کیونکہ کُتبِ آسمانی کے نزول کا مقصد ارشاد، ہدایت اور تربیّت ہے۔ بعض اوقات یہ ہدف آسمانی کتب کے یکجا نازل ہونے سے حاصل ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کی تدریجی تنزیل اس مقصد کے لیے زیادہ مددگار ہوتی ہے لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ پیغمبر سے دلیل کا مطالبہ کریں اور اعلیٰ وارفع تعلیمات کی فرمائش کریں نہ یہ کہ آسمانی کتب کے نزول کی کیفیت معیّن کریں لہٰذا اس کے بعد خدا نے ان کے عدم حسن نیّت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور اپنے پیغمبرؐ کی تسلّی کے لیے یہودیوں کی سابقہ ہٹ دھرمی، عناد اور بہانہ جوئی کا تذکرہ کیا ہے جو وہ اپنے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰؑ بن عمران سے کرتے رہے تھے فرمایا: انھوں نے موسیٰ سے اس سے بڑی اور زیادہ عجیب چیزوں کی خواہش کی تھی اور کہا تھا کہ ہمیں ظاہر بظاہر خدا دکھا دے (فقد سألوا موسی اکبر من ذٰلک فقالوا ارنا الله جهرة)۔

یہ عجیب وغریب اور غیر منطقی فرمائش تھی جس سے بُت پرستوں کا سا عقیدہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کو جسم میں اور محدود دیکھنے کا تقاضا کر رہے تھے اور بلاشُبہ اس کی وجہ ہٹ دھرمی اور عناد تھی ان کے اسی ظلم کے باعث صاعقۂ آسمانی نے انھیں آلیا (فاخذتهم الصّعقة بظلمهم)۔

اس کے بعد ان کے ایک اور بُرے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے "گوسالہ پرستی"۔ فرمایا: انھوں نے ان معجزات اور واضح دلائل کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود بچھڑے کو اپنا معبود قرار دے دیا (ثم اتخذوا العجل من بعد ما جاءتهم البینٰت)۔

ان تمام چیزوں کے باوجود اس لیے کہ وہ صحیح راستے کی طرف لوٹ آئیں اور ہٹ دھرمی اور عناد کی سواری سے اتر پڑیں ارشاد فرمایا: پھر بھی ہم نے انھیں بخش دیا اور موسیٰ کو برتری عطا کی اور واضح حکومت بخشی۔ نیز سامری اور بچھڑا پرستوں کی بساط الٹ دی (فعفونا عن ذٰلك واتینا موسی سلطانا مبینًا)۔

وہ پھر بھی خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے اور مرکبِ غرور سے نیچے نہ اُترے اسی لیے ہم نے کوہِ طور کو ان کے سروں پر متحرک کر دیا اور اسی حالت میں ان سے پیمان لیا اور ان سے کہا کہ اپنے گناہوں کی توبہ کے طور پر بیت المقدس کے دروازے سے خضوع وخشوع کے ساتھ داخل ہو جاؤ نیز انھیں تاکید کی کہ ہفتے کے روز کسب وکار سے دست کش ہو جاؤ اور تجاوز کی راہ نہ لو نیز اس دن دریائی مچھلیوں کا شکار نہ کرو کیونکہ جو اس دن حرام ہے اور ان تمام چیزوں کے بارے میں ہم نے ان سے سخت عہد وپیمان لیا" لیکن انھوں نے ان میں سے کسی بھی تاکیدی عہد کو پورا نہیں کیا[۱]۔ (ورفعنا فوقهم الطور بمیثاقهم وقلنا لهم ادخلوا الباب سجدًا وقلنا لهم لا تعدوا فی السبت واخذنا منهم میثاقًا غلیظًا)۔

توکیا یہ لوگ اس تاریک ماضی کے ہوتے ہوئے تم سے اپنے اس تقاضے میں سچے ہو سکتے ہیں؟ اگر یہ سچ کہتے ہیں تو پھر اپنی آسمانی

---

[۱] کوہِ طور کے یہودیوں کے سروں پر مسلط ہونے کے بارے میں اور یہ کہ ایسا زلزلے کے زیر اثر تھا یا کسی اور عامل کی وجہ سے اور اسی طرح یہودیوں کے سابقہ بُرے اعمال کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل میں بحث کی جا چکی ہے۔ (صفحہ ۲۲۴ اردو ترجمہ دیکھیے)

Marfat.com

کتب میں آخری پیغمبر کی صریح نشانیوں کے بارے میں عمل کیوں نہیں کرتے اور انھوں نے تمھارے بارے میں ان کھلی نشانیوں سے چشم پوشی کیوں اختیار کر رکھی ہے۔

دو اہم نکات

۱۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اعمال تو پہلے یہودیوں سے مربوط تھے پیغمبر اسلامؐ کے معاصر یہودیوں کا ان سے کیا واسطہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے بڑوں کے اعمال پر معترض نہیں تھے بلکہ ان سے موافق نظریئے کا اظہار کرتے تھے اس لیے سب ایک ہی صف میں قرار پاتے ہیں۔

۲۔ مندرجہ بالا آیات میں جو یہ آیا ہے کہ یہودی مدعی تھے کہ تورات یکبارگی نازل ہوئی ہے تو یہ کوئی مسلم بات نہیں ہے شاید اس توہم کا سبب وہ دس فرامین ہیں، جنھیں دس وصیتیں کہا جاتا ہے جو کہ اکٹھی تختیوں کی صورت میں حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئے تھے۔ جبکہ تورات کے دیگر احکام کے یکجا نازل ہونے کے بارے میں کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔

۱۵۵۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ
بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

۱۵۶۔ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝

۱۵۷۔ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا
قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا
فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا
قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝

۱۵۸۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

ترجمہ

۱۵۵۔ وہ اس بنا پر کہ انھوں نے اپنا عہد توڑ دیا، آیاتِ الٰہی کا انکار، انبیاء کو ناحق قتل کیا اور وہ (بطور تمسخر) کہتے تھے کہ

Marfat.com

ہمارے دلوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے (اور ہم انبیاء کی باتوں کو سمجھ نہیں پاتے)، (لہٰذا وہ بارگاہِ الٰہی سے دھتکارے گئے) جی ہاں! خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مُہر لگادی ہے لہٰذا تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ باقی ایمان نہیں لائیں گے (اور یہ وہ ہیں جو راہِ حق پر چلتے ہیں اور ہٹ دھرمی نہیں کرتے)

۱۵۶۔ نیز ان کے کفر کے باعث اور اس عظیم تہمت کی وجہ سے جو انھوں نے مریم پر لگائی ہے۔

۱۵۷۔ اور ان کا یہ کہنا کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم پیغمبر خدا کو قتل کر دیا حالانکہ نہ انھوں نے اسے قتل کیا ہے اور نہ سولی پر لٹکایا ہے مگر یہ کہ معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا اور جنھوں نے اس کے قتل کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ اس کے متعلق شک میں ہیں اور اس کا علم نہیں رکھتے اور صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور انھوں نے یقیناً اسے قتل نہیں کیا۔

۱۵۸۔ بلکہ خدا اسے اپنی طرف لے گیا اور خدا توانا و حکیم ہے۔

تفسیر

یہودیوں کی کچھ اور کارستانیاں

ان آیات میں بنی اسرائیل کی کچھ اور کارستانیوں، قانون شکنیوں، عداوتوں اور انبیاءِ الٰہی سے دشمنیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں ان میں سے ایک گروہ کی پیمان شکنی، کفر اور قتل انبیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے انھیں پیمان شکنی کی وجہ سے اپنی رحمت سے دور کر دیا یا اپنی بعض پاکیزہ نعمتوں کو ان پر حرام قرار دے دیا (فبما نقضھم میثاقھم.....)[ل]

اس عہد شکنی کے بعد انھوں نے آیات الٰہی کا انکار کیا اور مخالفت کا راستہ اختیار کیا (وکفرھم بآیات اللہ) اور انھوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایک اور بڑے جرم کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ یہ کہ راہِ حق کے ہادیوں یعنی انبیاء کو بلا جواز قتل کیا (وقتلھم الانبیاء بغیر حق)۔

وہ خلافِ حق اعمال میں اس قدر جسارت مند اور بے باک تھے کہ انبیاء کی گفتگو کا مذاق اڑاتے تھے اور انھیں صراحت سے

ل "فبما نقضھم" قواعدِ ادب کے اعتبار سے جار مجرور ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا کوئی عامل ہو ممکن ہے اس کا عامل "لعناھم" (ہم نے ان پر لعنت کی) محذوف و مقدر ہے یا "حرمنا علیھم......" (ہم نے ان پر حرام کر دیا) ہو جو آیہ ۱۶۰ میں ہے اس بنا پر جو کچھ درمیانی کلام میں آیا ہے وہ جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے جو ایسے مواقع پر کلام کی خوبی اور زیبائی کا باعث ہوتا ہے۔

Marfat.com

کہتے تھے: ہمارے دلوں پر تو پردہ ڈال دیا گیا ہے جو تمھاری دعوت کو سننے اور اسے قبول کرنے میں حائل ہے (و قولھم قلوبنا غلف)۔ یہاں قرآن مجید مزید کہتا ہے: جی ہاں! ان کے دلوں پر واقعی مُہر لگا دی گئی ہے، اب کوئی حق بات ان میں جاگزیں نہیں ہو سکتی لیکن اس کا عامل ان کا اپنا کفر اور بے ایمانی ہے اس لیے تھوڑے سے افراد جو ایسی ہٹ دھرمیوں میں نہیں پڑتے وہی ایمان لائیں گے باقی نہیں (بل طبع اللہ علیھا بکفرھم فلا یؤمنون الا قلیلا)۔

ان کی قانون شکنیاں صرف یہیں تک محدود نہیں ہیں وہ کفر کی راہ میں اتنے تیز دوڑتے ہیں کہ انھوں نے مریم جیسی پاک دامن خاتون اور خدا کے ایک عظیم پیغمبر کی والدہ جو حکم خدا سے بغیر شوہر کے حاملہ ہو گئی تھی، پر بہت بڑی تہمت لگائی (و بکفرھم وقولھم علی مریم بھتانًا عظیمًا)۔ یہاں تک وہ قتل انبیاء پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے ہم نے عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا (وقولھم انا قتلنا المسیح عیسی بن مریم رسول اللہ) شاید مسیح کو رسول اللہ تمسخر اور استہزاء کے طور پر کہتے تھے۔ وہ قتل عیسیٰ کے بارے میں اپنے دعوے میں جھوٹے تھے انھوں نے ہرگز مسیح کو قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر لٹکایا، بلکہ ایک اور شخص کو جو اُن سے مشابہت رکھتا تھا اشتباہ میں سُولی پر لٹکا دیا (وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم)۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: مسیح کے بارے میں اختلاف کرنے والے خود شک میں تھے اور اپنی کہی ہوئی بات پر ایمان نہیں رکھتے تھے وہ صرف تخمینے اور اندازے کی پیروی کرتے تھے (وان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ مالھم بہ من علم الا اتباع الظن)۔ اس بارے میں کہ انھوں نے کس بات میں اختلاف کیا مفسرین میں اختلاف ہے بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے اختلاف حضرت مسیحؑ کی اصل حیثیت اور مقام کے بارے میں کیا تھا ایک گروہ جناب مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتا تھا اور بعض یہودیوں کی طرح انھیں پیغمبر ہی نہیں سمجھتے تھے اور یہ سب کے سب اشتباہ میں تھے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے قتل کی کیفیت کے بارے میں اختلاف ہو بعض کہتے ہیں کہ وہ قتل ہو گئے ہیں اور بعض کہتے کہ وہ قتل نہیں ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی اپنی بات پر مطمئن نہیں تھا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے قتل کے مدعی انھیں نہ پہچاننے کی وجہ سے شک میں ہوں اور وہ یہ ہے کہ جسے انھوں نے قتل کیا تھا وہ مسیحؑ ہی تھے یا ان کی جگہ کوئی اور شخص تھا۔

اس پر قرآن تاکیداً کہتا ہے انھوں نے قطعاً اسے قتل نہیں کیا بلکہ خدا اسے اپنی طرف اٹھا لے گیا اور خدا قادر و حکیم ہے (وما قتلوہ یقینًا بل رفعہ اللہ الیہ وکان اللہ عزیزًا حکیمًا)۔

مسیحؑ قتل نہیں ہوئے

زیر نظر آیت میں قرآن کہتا ہے: مسیحؑ قتل نہیں ہوئے اور نہ سولی پر چڑھے بلکہ معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا اور انھوں نے خیال کیا کہ انھیں سولی پر لٹکا دیا ہے حالانکہ یقیناً انھوں نے انھیں قتل نہیں کیا۔

موجودہ چاروں اناجیل (متی، لوقا، مرقس اور یوحنا) میں حضرت مسیحؑ کو سولی پر لٹکائے جانے اور ان کے قتل کا ذکر ہے۔

Marfat.com

یہ بات چاروں انجیلوں کے آخری حصّوں میں تشریح و تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ آج کے عام مسیحیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو قتل مسیح اور انھیں مصلوب کیا جانا موجودہ مسیحیت کے اہم ترین بنیادی مسائل میں سے ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ عیسائی حضرت مسیح کو ایسا پیغمبر نہیں مانتے جو مخلوق کی ہدایت، تربیت اور ارشاد کے لیے آیا ہو بلکہ وہ انھیں خدا کا بیٹا اور تین خداؤں میں سے ایک کہتے ہیں جس کا اس دنیا میں آنے کا اصلی ہدف ہی خدا ہونا ہے اور اپنی قربانی کے عوض نوعِ بشر کے گناہوں کا سودا کرنا ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ وہ اس لیے آئے تاکہ ہمارے گناہوں کا فدیہ بن جائیں وہ سولی چڑھے اور قتل ہوئے تاکہ نوعِ بشر کے گناہوں کو دھو ڈالیں اور عالمین کو سزا سے نجات دلائیں۔ اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ راہِ نجات مسیح سے رشتہ جوڑنے اور ان کے مصلوب ہونے کا عقیدہ رکھنے میں منحصر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مسیحیت کو "مذہبِ نجات" یا "مذہب خدا" کہتے ہیں اور مسیح کو "ناجی" یا "فادی" کہتے ہیں یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی صلیب کا نشان بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں، اور صلیب ان کا شعار ہے اسی کی وجہ ان کا یہی عقیدہ ہے۔

یہ تھا حضرت مسیح کی سرنوشت کے بارے میں عیسائیوں کے عقیدے کا خلاصہ، لیکن کوئی مسلمان بھی اس میں شک نہیں رکھتا کہ یہ عقیدہ باطل ہے اس کی وجوہات یہ ہیں۔

۱۔ حضرت مسیح دیگر انبیاء کی طرح ایک پیغمبر تھے نہ وہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے۔ خدا یکتا و یگانہ ہے اس کا کوئی شبیہ و نظیر مثل و مانند اور بیوی بیٹا نہیں ہے۔

۲۔ گناہوں کا فدیہ بننا بالکل غیر منطقی بات ہے ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ اور ذمّہ دار ہے اور راہ نجات خود انسان کا اپنا ایمان اور عمل صالح ہے۔

۳۔ گناہ گار کے فدیہ کا عقیدہ فساد، تباہی اور آلودگی کی ترغیب و تشویق کرتا ہے یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن خصوصیت سے مسیح کے مصلوب نہ ہونے کا ذکر کرتا ہے حالانکہ ظاہراً ایک معمولی سی بات نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ فدیے اور امت کے گناہ خریدنے کے بے ہودہ اور فضول عقیدے کی سختی سے سرکوبی کی جائے اور عیسائیوں کو اس خرافاتی عقیدے سے نکالا جائے تاکہ وہ نجات کے لیے اپنے اعمال کو درست کریں نہ کہ عقیدۂ صلیب کا سہارا لیں۔

۴۔ بہت سے قرآئن ایسے موجود ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دیئے جانے کے عقیدے کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً:

و۔ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ چاروں انجیلیں جو حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کا ذکر کرتی ہیں سب کی سب حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعے لکھی گئی ہیں اور اس بات کا مسیحی مؤرخ بھی اعتراف کرتے ہیں۔

نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جناب مسیح کے شاگرد دشمنوں کے حملے کے وقت بھاگ گئے تھے اور اناجیل بھی اس بات کی گواہ ہیں[ۂ]۔ لہٰذا انھوں نے مسیح کے مصلوب ہونے کے بارے میں عوام میں گردش کرتی ہوئی افواہ یا شہرت سنی اور وہیں سے

ۂ "اُس وقت تمام شاگرد انھیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے" (انجیل متی باب ۲۶ جملہ ۵۶)

Marfat.com

یہ بات حاصل کی اور جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائے گا کہ حالات ایسے پیش آئے کہ مسیح کی جگہ دوسرا شخص اشتباہ میں پکڑ لیا گیا۔

ب۔ دوسرا عامل جو یہ امکان ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی بجائے اشتباہ میں دوسرا شخص پکڑا گیا ہو یہ ہے کہ شہر کے باہر جستیمانی باغ میں جو لوگ جناب عیسٰیؑ کو گرفتار کرنے کے لیے گئے وہ رومی لشکر کا ایک دستہ تھا یہ لوگ چھاؤنی میں اپنی فوجی ذمہ داریوں میں مشغول تھے یہ لوگ نہ یہودیوں کو پہچانتے تھے نہ وہاں کی زبان اور نہ آداب و رسوم جانتے تھے اور نہ ہی یہ لوگ حضرت عیسٰیؑ کو ان کے شاگردوں میں سے پہچان سکتے تھے۔

ج۔ اناجیل کے مطابق حملہ رات کے وقت حضرت عیسٰیؑ کی رہائش گاہ پر ہوا اس صورت میں تو اور بھی آسان ہے کہ تاریکی میں اصل انسان نکل جائے اور کوئی دوسرا اس کی بجائے گرفتار ہو جائے۔

د۔ تمام انجیلوں کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ گرفتار شدہ شخص نے رومی حاکم پیلاطس کے سامنے خاموشی اختیار کی اور اس کی گفتگو کے جواب میں اپنے دفاع کے لیے بہت کم ہی کچھ کہا۔ یہ بات بہت بعید ہے کہ حضرت عیسٰیؑ اپنے آپ کو خطرے میں دیکھیں اور اپنے بیانِ رسا، قوت گویائی اور شجاعت و شہامت کے باوجود اپنا دفاع نہ کریں۔

تو کیا اس سے یہ احتمال پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ان کی جگہ پکڑا گیا ہو اور وحشت و اضطراب کا ایسا شکار ہوا ہو کہ اپنے دفاع میں کچھ کہہ بھی نہ سکا ہو۔ قوی احتمال یہ ہے کہ وہ اسخر یوطی نامی یہودی تھا جس نے حضرت مسیحؑ سے خیانت کی اور ان کے خلاف جاسوس کا کردار ادا کیا۔ کہتے ہیں کہ وہ جناب عیسٰی سے بہت مشابہت رکھتا تھا خصوصاً جبکہ موجودہ اناجیل میں ہے کہ اسخریوطی یہودی اس واقعے کے بعد دیکھا نہیں گیا اور اناجیل ہی کے مطابق اس نے خودکشی کر لی تھی۔[1]

ہ۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے شاگرد اناجیل کی شہادت کے مطابق خطرہ محسوس کرتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے دوست احباب بھی اس دن چھپ گئے ہوں گے اور دور سے حالات پر نظر رکھے ہوں گے۔ لہذا گرفتار شدہ شخص رومی فوجیوں کے محاصرے میں تھا اور اس کے دوستوں میں سے کوئی اس کے گرد موجود نہیں تھا۔ اس لیے کون سے تعجب کی بات ہے کہ اشتباہ ہو گیا ہو۔

س۔ اناجیل میں ہے کہ جس شخص کو تختہ دار پر لٹکانے کا حکم دیا گیا اس نے تختہ دار پر خدا سے شکایت کی۔

تو نے مجھے کیوں تنہا چھوڑ دیا اور کیوں مجھے قتل ہونے کے لیے دشمن کے ہاتھ میں دے دیا۔[2]

لہذا اگر حضرت مسیحؑ دنیا میں اس لیے آئے تھے کہ وہ سولی پر لٹکائے جائیں اور نوعِ انسانی کے گناہوں کا فدیہ ہو جائیں تو پھر ایسی ناروا باتیں انھیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔ یہ جملہ واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ وہ شخص نہایت کمزور، ڈرپوک اور عاجز و ناتواں تھا اسی لیے ایسی باتیں کر رہا تھا ورنہ مسیحؑ ہوتے تو ایسی باتیں ہرگز نہ کرتے۔[3]

---

[1] انجیل متی باب ۲۷ جملہ ۶
[2] ... عیسٰی نے بلند آواز سے پکار کر کہا ... ایلی ! ایلی ! لما سبقتنی
یعنی ... الہی! الہی! تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا (متی باب ۲۷، جملہ ۴۶ - ۴۷)
[3] مندرجہ بالا چند قرائن کے لیے کتاب "قهرمان صلیب" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

Marfat.com

س۔ مسیحوں کے نزدیک قابلِ قبول چار انجیلوں کے علاوہ موجودہ بعض اناجیل مثلاً انجیل برنابا میں واضح طور پر حضرت عیسٰیؑ کے مصلوب ہونے کی نفی کی گئی ہے[1]۔ یہاں تک کہ بعض محققین کا یہ نظریہ ہے کہ عیسیٰ نام کے دو شخص تھے ایک عیسیٰ کو سولی دی گئی تھی اور دوسرے کو نہیں دی گئی تھی اور دونوں میں پانچ سو سال کا فاصلہ تھا[2]۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ قرائن مجموعی طور پر حضرت مسیحؑ کے قتل اور صلیب دیئے جانے کے بارے میں قرآن کے دعویٰ اشتباہ کو واضح کرتے ہیں۔

۱۵۹۔ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ

ترجمہ

۱۵۹۔ کوئی اہلِ کتاب ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قابلِ ملاحظہ ہے:۔

۱۔ آیت کہتی ہے: کوئی اہلِ کتاب نہیں مگر یہ کہ وہ مسیح پر "اپنی موت" سے پہلے ایمان لے آئے گا (وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ)۔

اور یہ وقت وہ ہوگا جب انسان موت کے دہانے پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا ربط اس جہان سے کمزور پڑ جاتا ہے اور بعد والے جہان سے قوی ہو جاتا ہے، پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جاتے ہیں، بہت سے حقائق اسے نظر آنے لگتے ہیں اور وہ ان کے بارے میں آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ اس موقع پر اس کی حقیقت بیں آنکھیں مقامِ مسیحؑ کو دیکھتی ہیں اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتی ہیں۔ جو اس کے منکر تھے اب مومن ہو جاتے ہیں اور جو اسے خدا سمجھتے تھے اب اپنے اشتباہ کو جان لیتے ہیں۔

یہ ایمان فرعون اور دیگر ایسے لوگوں کا سا ایمان ہے جو عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اپنی بربادی کا سامان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ پھر اظہارِ ایمان کرتے ہیں ایسا ایمان انھیں کوئی فائدہ نہیں دیتا لہٰذا کس قدر اچھا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۲۴

[2] المیزان ج ۲ صفحہ ۲۴۵

Marfat.com

ایسے حساس لمحے پر ایمان لائیں جبکہ ایمان انھیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا ابھی ایمان لے آئیں اور مومن بن جائیں جب ایمان ان کے لیے فائدہ مند بھی ہے۔

اس تفسیر کے مطابق " قبل موتہ " کی ضمیر اہلِ کتاب کے بارے میں ہے۔

۲۔ دوسری تفسیر کے مطابق تمام اہلِ کتاب حضرت مسیحؑ پر " ان کی موت " سے پہلے ایمان لے آئیں گے۔ یہودی ان کی نبوت قبول کرلیں گے اور عیسائی ان کی الوہیت کے عقیدے سے دست کش ہوجائیں گے یہ اس وقت ہوگا جب اسلامی روایات کے مطابق حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے موقع پر حضرت عیسیٰؑ آسمان سے اتریں گے اور ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے، یہود و نصاریٰ بھی انھیں دیکھیں گے اور ان پر اور حضرت مہدی علیہ السّلام پر ایمان لے آئیں گے۔

واضح رہے کہ حضرت مسیحؑ کا دین گذشتہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے اور اب ان کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ دینِ اسلام کی پیروی کریں جس کے جاری اور نافذ کرنے والے حضرت مہدی علیہ السلام ہوں گے۔

اس تفسیر کے مطابق " قبل موتہ " کی ضمیر کا تعلق حضرت مسیحؑ سے ہے نہ کہ اہلِ کتاب سے۔ بہت سی اسلامی کتب میں یہ حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

كيف انتم اذا نزل فيكم ابن مريم و امامكم منكم۔

اس وقت تمھارا کیا حال ہوگا جب فرزندِ مریم تم میں نازل ہوگا اور تمھارا امام و پیشوا خود تم میں سے ہوگا۔ [۱]

علی بن ابراہیم کی تفسیر میں شہر بن حوشب سے منقول ہے:

ایک دن حجاج نے کہا، قرآن میں ایک آیت ہے جس نے مجھے تھکا دیا ہے اور میں اس کے معنی میں ڈوبا رہتا ہوں۔

شہر نے کہا: کون سی آیت ہے، اے امیر!؟

حجاج نے کہا: و ان من اهل الكتاب .... کیونکہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کو قتل کرتا ہوں لیکن ایسے ایمان کی کوئی نشانی ان میں نہیں دیکھتا۔

شہر نے کہا: "تم آیت کی یہ تفسیر صحیح نہیں کرتے ہو"

حجاج بولا: کیسے؟ آیت کی صحیح تفسیر کیا ہے؟

شہر نے جواب دیا، مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اس دنیا کے ختم ہونے سے پہلے اتریں گے اور کوئی یہودی یا غیر یہودی ایسا باقی نہیں رہے گا جو حضرت عیسیٰؑ کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آئے، عیسیٰؑ، حضرت مہدیؑ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

---

[۱] تفسیر المیزان کے مطابق یہ حدیث مسند احمد، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن بیہقی میں موجود ہے۔

Marfat.com

حجاج نے یہ بات سنی تو کہنے لگا، "وائے ہو تم پر، یہ تفسیر کہاں سے لائے ہو؟"
شہر نے کہا: محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام سے میں نے یہ تفسیر سُنی ہے۔
حجاج کہنے لگا:۔ واللہ جئت بھا من عین صافیہ (یعنی ——— بخدا صاف وشفاف سرچشمہ سے لایا ہے)[1]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: قیامت کے دن حضرت مسیحؑ ان پر گواہ ہوں گے (و یوم القیامۃ یکون علیھم شھیدًا)۔ حضرت مسیحؑ کی ان کے خلاف گواہی سے مراد یہ ہے کہ وہ گواہی دیں گے کہ میں نے تبلیغ رسالت کی اور انھیں کبھی اپنی الوہیت کی دعوت نہیں دی بلکہ پروردگار کی ربوبیت کی دعوت دی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۷ کے مطابق حضرت مسیحؑ قیامت کے دن اپنی گواہی اپنی اس زندگی کے دوران کے بارے میں دیں گے جب وہ اپنی اُمّت میں موجود تھے لیکن اس کے بعد کی ذمہ داری قبول نہیں کریں گے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

وکنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وانت علی کل شیء شھید۔

یعنی ——— (حضرت عیسیٰ کہیں گے) جب تک میں ان کے درمیان تھا تو ان پر شاہد اور ناظر تھا لیکن جب تو نے ان میں سے مجھے اٹھا لیا تو تُو ان پر نگران ہے اور تو ہر چیز پر شاہد و گواہ ہے۔

لیکن زیر بحث آیت میں ہے کہ حضرت مسیحؑ قیامت کے دن ان سب کے بارے میں گواہی دیں گے چاہے وہ ان کے زمانے میں تھے یا نہیں تھے۔

دونوں آیات پر غور وخوض کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت حضرت مسیحؑ کی طرف سے تبلیغ رسالت اور الوہیت کی نفی کے بارے میں گواہی سے متعلق ہے جبکہ سُورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۷ اُن کے عمل کے بارے میں گواہی سے مربوط ہے۔
اس کی وضاحت یہ ہے کہ زیر بحث آیت کہتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ان تمام لوگوں کے خلاف گواہی دیں گے جنھوں نے ان کی الوہیت کا عقیدہ رکھا، چاہے وہ آپ کے زمانے میں تھے یا اس کے بعد اور کہیں گے کہ میں نے انھیں ہرگز ایسی کسی چیز کی دعوت نہیں دی تھی۔ لیکن سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۷ کہتی ہے کہ وہ کہیں گے کہ میں نے انھیں صحیح اور کافی و وافی تبلیغ رسالت

---

[1] تفسیر برہان جلد ۱ صفحہ ۴۲۶

Marfat.com

کی ہے جب تک میں ان کے درمیان موجود تھا تو عملاً ان کے انحراف کو روکتا رہا لیکن میرے بعد یہ ہوا کہ وہ میری الوہیت کے قائل ہو گئے اور انھوں نے انحراف کا راستہ اختیار کیا ان دنوں میں ان کے درمیان نہ تھا کہ ان کے اعمال کا گواہ بنوں اور یہ کہ انھیں اس سے روکتا۔

۱۶۰۔ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ۝
۱۶۱۔ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ
وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝
۱۶۲۔ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا
عَظِيْمًا ۝ ع

ترجمہ

۱۶۰۔ اس ظلم کی وجہ سے جو یہودیوں نے کیا نیز راہ خدا سے بہت زیادہ روکنے کی بنا پر کچھ پاکیزہ چیزیں جو ان پر حلال تھیں ہم نے حرام قرار دے دیں۔

۱۶۱۔ اور (اسی طرح) ان کی سود خوری (بھی)، جبکہ انھیں اس سے منع کر دیا گیا تھا اور باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کی وجہ سے اور ان میں سے کافروں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۱۶۲۔ لیکن ان میں وہ لوگ جو علم میں راسخ ہیں اور وہ جو ایمان لائے ہیں، ان تمام چیزوں پر جو تم پر نازل ہوئی ہیں اور ان پر جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہیں ایمان لا چکے ہیں اور وہ جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ جو خدا اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں ہم جلد ہی ان سب کو اجر عظیم دیں گے۔

Marfat.com

تفسیر

یہودیوں میں سے صالح اور غیر صالح افراد کا انجام

گذشتہ آیات میں یہودیوں کی قانون شکنی کے چند نمونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ مندرجہ بالا آیات میں ان کے کچھ اور ناشائستہ اعمال کا ذکر کرنے کے بعد ان سزاؤں کا تذکرہ ہے جو ان کے اعمال کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں ان کے دامن گیر ہوئیں اور ہوں گی۔

پہلے ارشاد فرمایا : اس ظلم و ستم کی وجہ سے جو یہودیوں نے کیا اور لوگوں کو راہِ خدا سے باز رکھنے کی وجہ سے کچھ پاک و پاکیزہ چیزیں ہم نے ان پر حرام کر دیں اور انھیں ان سے استفادہ سے محروم کر دیا (فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم و بصدھم عن سبیل الله کثیرًا)۔

نیز اس بنا پر کہ وہ سُود کھاتے تھے حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا اور اسی طرح لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے ان کے یہی کام ان کی اس محرومیت کا سبب بنے (و اخذھم الربوا وقد نھوا عنہ و اکلھم اموال الناس بالباطل)۔

اس دنیاوی سزا کے علاوہ ہم انھیں اخروی سزاؤں میں مبتلا کریں گے اور ان میں سے جو کافر ہیں ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے (و اعتدنا للکافرین منھم عذابًا الیمًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **یہودیوں کے لیے طیّبات کی حُرمت :** طیبات کی حُرمت سے مراد وہی ہے جس کی طرف سورہ انعام آیہ ۱۴۶ میں اشارہ ہوا ہے، جہاں فرمایا گیا ہے :

> ہم نے یہودیوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے ہر جانور جس کا سم پھٹا ہوا نہ ہو ان پر حرام قرار دے دیا۔ نیز گائے اور بھیڑ بکری کی چربی بھی کہ جس سے انھیں لگاؤ تھا ان پر حرام کر دی مگر اس کا وہ حصہ جو جانور کی پشت یا آنتوں کے اطراف میں ہو یا ہڈی کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

لہٰذا مذکورہ حُرمت تحریم تشریعی و قانونی تھی، تحریم تکوینی نہ تھی۔ یعنی یہ نعمتیں طبعی اور فطری طور پر تو ان کے پاس تھیں، لیکن شرعًا انھیں ان کے کھانے سے روک دیا گیا تھا۔

موجودہ تورات کے سفر لاویان کی گیارہویں فصل میں ان میں سے کچھ چیزوں کی حرمت کا ذکر موجود ہے لیکن یہ بات اس میں نہیں کہ یہ حُرمت سزا کے طور پر تھی [1]

---

[1] تفسیر نمونہ جلد سوم کی طرف رجوع کیجیے (دیکھیے ص ۲۹ اردو ترجمہ)

Marfat.com

۲۔ کیا یہ حُرمت عمومی تھی ؟ یہ حرمت ظالم لوگوں کے لیے ہی تھی یا سب کے لیے ـــــــ اس سلسلے میں مندرجہ بالا آیت اور سُورہ انعام کی آیت ۱۴۶ کے ظاہری مفہوم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ تحریم عمومی تھی کیونکہ آیت میں "لھم" کہا گیا ہے جبکہ اخُروی سزا کے لیے "للکافرین منھم" آیا ہے، یعنی ان میں سے کافروں کے لیے، لہٰذا ظالموں کے لیے تو یہ حرمت سزا کے طور پر تھی جبکہ نیک لوگ جو کم تعداد میں تھے ان کے لیے آزمائش اور انضباط کے پہلو سے تھی۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ تحریم فقط ستمگروں کے لیے تھی اور بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے تفسیر برہان میں سورۂ انعام کی آیت ۱۴۶ کے ذیل میں امام صادق علیہ السّلام سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا :

> بنی اسرائیل کے حُکّام اور رؤسا فقیر اور نادار لوگوں کو پرندوں کے گوشت اور جانوروں کی چربی کھانے سے روکتے تھے۔ خدا نے ان کے اس ظلم و ستم کی وجہ سے ان چیزوں کو خود ان پر حرام قرار دے دیا[1]

۳۔ سود کی حُرمت قبل از اسلام سے ہے : اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سود کی حُرمت اسلام ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ یہ گذشتہ قوموں میں بھی حرام تھا اگرچہ موجودہ تحریف شدہ تورات میں اس کی حرمت برادران دینی میں حرام شمار کی گئی ہے[2]

یہودیوں میں سے اہل ایمان

زیر نظر آیات میں سے آخری آیت میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے جس کا قرآن نے بارہا اظہار کیا ہے اور وہ یہ کہ قرآن اگر یہودیوں کی مذمت کرتا ہے تو یہ نسلی اور گروہی جھگڑے کے حوالے سے نہیں ہے۔ اسلام کسی قوم و قبیلے کی مذمت قوم اور قبیلے کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ اس مذمت کا ہدف صرف آلودۂ گناہ اور منحرف لوگ ہوتے ہیں اسی لیے اس آیت میں یہودیوں میں سے صاحبِ ایمان اور پاک دامن افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور ان کی تعریف کی گئی ہے اور انھیں اجرِ عظیم کی بشارت دی گئی ہے قرآن کہتا ہے، لیکن یہودیوں میں سے وہ لوگ جو علم و دانش میں راسخ ہیں، خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لے آئے ہیں ہم بہت جلد انھیں اجرِ عظیم سے نوازیں گے (لکن الراسخون فی العلم منھم و المؤمنون یؤمنون بما انزل الیک و مآ انزل من قبلک و المقیمین الصلٰوۃ و المؤتون الزکٰوۃ و المؤمنون باللہ و الیوم الاٰخر اولٰئک سنؤتیھم اجرًا عظیمًا[3])۔

---

[1] تفسیر برہان ج ۱ ص ۵۵۹

[2] تورات، سفر تثنیہ فصل ۲۳ جملہ ۱۹، ۲۰۔ برادران دینی سے ظاہرًا اولاد حضرت اسماعیلؑ مراد ہے (مترجم)

[3] "الراسخون فی العلم" کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد دوم ص ۲۵۵ (اُردو ترجمہ) میں تفصیلی وضاحت کی جاچکی ہے۔

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کے بڑے لوگوں میں ایک جماعت اسلام کے ظہور اور اس کی حقانیت کو دیکھتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی اور دل وجان سے اس کی حمایت کی۔ یہ لوگ پیغمبر اسلامؐ اور باقی مسلمانوں کے لیے قابل احترام قرار پائے۔

۱۶۳۔ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ
الْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا
دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ ○
۱۶۴۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ
عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ ○
۱۶۵۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ
الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○
۱۶۶۔ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰۗئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۭ ○

ترجمہ

۱۶۳۔ ہم نے تم پر وحی کی جس طرح کہ نوح اور اس کے بعد والے انبیاء پر وحی کی تھی نیز ابراہیم، اسماعیل، اسحاق یعقوب (بنی اسرائیل میں سے) اسباط، عیسٰی، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر وحی کی اور (جیسے) داؤد کو ہم نے زبور دی۔

۱۶۴۔ اور وہ پیغمبر جن کی سرگذشت ہم تمھیں پہلے بیان کر چکے ہیں اور وہ پیغمبر کہ جن کا قصہ ہم نے بیان نہیں کیا اور خدا نے موسٰی سے کلام کیا۔

Marfat.com

۱۶۵۔ وہ پیغمبر کہ جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے تاکہ لوگوں کے لیے ان پیغمبروں کے بعد خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے (اور سب پر اتمام حجت ہوجائے) اور خدا توانا و حکیم ہے۔

۱۶۶۔ لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے وہ اس نے اپنے علم کی رُو سے نازل کیا ہے اور فرشتے (بھی) گواہی دیتے ہیں اگرچہ خدا کی گواہی کافی ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہودی انبیاء میں فرق کرتے تھے بعض کی تصدیق کرتے تھے اور بعض کی تردید کرتے تھے۔ زیرِ نظر آیات میں دوبارہ انھیں جواب دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے، ہم نے تجھ پر وحی نازل کی جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد والے انبیاء پر وحی بھیجی تھی اور جیسے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، وہ پیغمبر جو اولادِ یعقوب میں سے تھے، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ پر وحی نازل کی تھی اور داؤدؑ کو زبور دی تھی (انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعده واوحینا الی ابراهیم و اسمٰعیل و اسحٰق ویعقوب والاسباط وعیسٰی وایوب و یونس وهٰرون وسلیمٰن و اٰتینا داوٗد زبورًا) لہٰذا ان بزرگ انبیاء میں کیوں تفریق کرتے ہو جب کہ سب کے سب ایک ہی راستے کے مسافر ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت کے مخاطب عرب کے مشرکین اور بُت پرست ہوں جو پیغمبر اسلامؐ پر نزولِ وحی پر تعجب کرتے تھے، آیت کہتی ہے کہ اس میں کون سی تعجب کی بات ہے، کیا پہلے پیغمبروں پر وحی نازل نہیں ہوئی۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ انبیاء جن پر وحی نازل ہوئی وہ یہی نہیں تھے بلکہ دوسرے پیغمبر کہ جن کا ذکر تم سے پہلے کیا جا چکا ہے اور وہ پیغمبر کہ جن کا قصہ ابھی تک بیان نہیں ہوا۔ سب کی یہی ماموریت تھی اور ان پر بھی وحی نازل ہوتی رہی (ورسلا قد قصصناهم علیک من قبل ورسلا لم نقصصهم علیک) اور اس سے بالاتر یہ کہ خدا نے موسیٰ سے کلام کیا (وکلم الله موسٰی تکلیمًا)۔

لہٰذا رشتہ وحی تو ہمیشہ سے نوعِ بشر میں تھا اور کیسے ممکن ہے کہ ہم نوعِ انسانی کو بغیر راہبر و راہنما کے چھوڑ دیں، اور پھر ان کے لیے جوابدہی اور ذمہ داری کے بھی قائل ہوں؟ لہٰذا ہم نے "ان پیغمبروں کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا قرار دیا تاکہ خدا کی رحمت اور ثواب کا لوگوں کو امیدوار بنائیں اور اس کی سزاؤں سے ڈرائیں تاکہ اس طرح ان پر اتمام حجت ہوجائے اور ان کے پاس کوئی بہانہ نہ رہے" (رسلا مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی الله حجة بعد الرسل)۔

خدا نے ان رہبروں کو بھیجنے کا پروگرام نہایت باریک بینی سے منظم اور جاری کیا ہے ایسا کیوں نہ ہو جبکہ "وہ تمام چیزوں پر توانائی رکھتا ہے اور حکیم (بھی) ہے" (وکان الله عزیزًا حکیمًا) اس کی حکمت سبب بنتی ہے

Marfat.com

کہ یہ کام عملی صورت اختیار کرے اور اس کی قدرت راہ ہموار کرتی ہے کیونکہ ایک صحیح پروگرام اگر انجام پذیر نہ ہو تو اس کی وجہ یا عدم حکمت ہوگی یا عدم قدرت ـــــ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی نقص خدا کی ذات پاک میں نہیں ہے۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرمؐ کی دلجوئی اور تسلّی کے لیے کہتا ہے: اگر یہ لوگ تیری نبوّت و رسالت کا انکار کرتے ہیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ خدا نے جو کچھ تجھ پر نازل کیا ہے وہ خود اس کا گواہ ہے (لکن اللہ یشھد بما انزل الیک) البتہ اس مقصد کے لیے تمھارا انتخاب بلاوجہ نہیں تھا بلکہ تمھاری اصلیت کو جانتے ہوئے اس نے یہ آیات تم پر نازل کی ہیں (انزلہ بعلمہ)۔

ممکن ہے یہ جملہ ایک اور مفہوم کا بھی حامل ہو اور وہ یہ کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس کا سرچشمہ علم الٰہی کا دریائے بے کنار ہے اور اس کے مضامین شاہد ہیں کہ ان کا سرچشمہ علم الٰہی ہے اس لیے تمھارے دعویٰ کی صداقت کی گواہی خود متنِ آیات میں ثبت ہے اور کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے کیسے ممکن ہے کہ جس شخص نے کسی کے سامنے زانوئے تمّلذ طے نہیں کیا وہ علمِ الٰہی کے بغیر ایک ایسی کتاب لے کر آئے جو اعلیٰ ترین تعلیمات، فلسفوں، قوانین، اخلاقی احکام اور اجتماعی پروگرام پر مشتمل ہو۔

آخر میں مزید فرماتا ہے: نہ صرف خدا تمھاری حقانیت کی گواہی دیتا ہے بلکہ فرشتگان الٰہی بھی گواہی دیتے ہیں، اگرچہ خدا کی گواہی کافی ہے (والملٰئکۃ یشھدون وکفیٰ باللہ شھیدا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **اسلام تمام ادیان کی خوبیوں کا امتزاج ہے:** بعض مفسرین " انا اوحینا الیک کما اوحینا..... الخ" کے جملے سے یہ استفادہ کرتے ہیں کہ قرآن چاہتا ہے کہ پیغمبر سے یہ نکتہ کہے کہ تمھارے دین میں تمام خصوصیات اور امتیازات جمع ہیں جو گذشتہ ادیان میں تھے ـــــ گویا

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یعنی ـــــ جو خوبیاں ان سب میں الگ الگ ہیں وہ تجھ اکیلے میں جمع ہیں

بعض روایات اہلِ بیتؑ میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مفسرین نے بھی دراصل انھی روایات سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے[1]

۲۔ **آسمانی کتب کی اقسام:** مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ زبور آسمانی کتب میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو دی تھی۔ یہ بات اس امر کے منافی نہیں جو مسلّم اور مشہور ہے کہ نئی شریعت کے حامل اور صاحب کتاب اولوالعزم پیغمبر پانچ سے زیادہ نہیں ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ آیات قرآنی اور روایاتِ اسلامی سے معلوم ہوتا ہے، پیغمبرانِ الٰہی پر نازل ہونے والی

---

[1] تفسیر صافی ص ۱۲۹، تفسیر برہان ج ۱ ص ۴۲۲ اور تفسیر نور الثقلین ج ۱ ص ۵۰۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

آسمانی کتب دو طرح کی ہیں۔

پہلی قسم۔ ان کتب کی ہے جن میں احکام تشریعی تھے اور جو نئی شریعت کا اعلان کرتی تھیں اور وہ پانچ سے زیادہ نہیں ہیں جو کہ پانچ اولوالعزم پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔

دوسری قسم۔ ان کتب کی ہے جن میں کوئی نئے احکام نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں پند و نصائح، رہنمائی، وصیتیں اور دعائیں ہوتی تھیں۔ زبور بھی اسی طرح کی کتاب ہے۔ "مزامیر داؤد" یا "زبور داؤد" جو کہ عہد قدیم کی کتب میں شمار ہوتی ہے اس حقیقت پر شاہد ہے اگرچہ یہ کتاب بھی عہد قدیم و جدید کی دیگر کتب کی طرح تحریف و تغییر سے محفوظ نہیں رہی لیکن پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی حد تک وہ اپنی شکل و صورت میں باقی ہے یہ کتاب ایک سو پچاس فصلوں پر مشتمل ہے جن میں ہر ایک کو مزمور کہتے ہیں اس کی تمام فصلیں پند و نصائح اور دعا و مناجات پر مشتمل ہیں۔

حضرت ابوذر سے ایک روایت میں منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ انبیاء کی تعداد کتنی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

ایک لاکھ چوبیس ہزار۔

میں نے عرض کیا: ان میں سے رسول کتنے تھے؟

آپؐ نے فرمایا: تین سو تیرہ، اور باقی صرف نبی تھے۔

ابوذر کہتے ہیں میں نے پوچھا: آسمانی کتابیں جو ان پر نازل ہوئیں وہ کتنی تھیں؟

آپؐ نے فرمایا: وہ ایک سو چار کتابیں ہیں، جن میں سے دس کتابیں آدم پر، پچاس کتابیں شیث پر، تیس کتابیں ادریس پر اور دس کتابیں ابراہیم پر (جو کل سو ہوئیں) اور تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید۔[1]

۳۔ اسباط سے کیا مراد ہے: اسباط جمع ہے سبط (بروزن سَبَد) کی جس کا مطلب ہے۔ بنی اسرائیل کے قبائل، لیکن یہاں مقصود وہ پیغمبر ہیں جو ان قبائل میں مبعوث ہوئے تھے۔[2]

۴۔ انبیاء پر نزول وحی کی کیفیت: انبیاء پر نزولِ وحی کی کیفیت مختلف تھی کبھی نزول وحی کے فرشتے کے ذریعے وحی آتی، کبھی دل میں الہام کے ذریعے سے اور کبھی آواز سنائی دیتی۔ اس طرح کہ خدا تعالیٰ فضا میں یا اجسام میں صوتی لہریں پیدا کر دیتا اور اس طرح سے اپنے پیغمبر سے گفتگو کرتا، ان میں سے کہ جنھیں واضح طور پر یہ امتیاز حاصل ہوا ایک حضرت موسیٰ بن عمران تھے جو کبھی شجرہ وادیٔ ایمن سے صوتی لہریں سنتے اور کبھی کوہ طور سے انھیں آواز سنائی دیتی۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ کا لقب دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں حضرت موسیٰؑ کا جدا گانہ تذکرہ شاید ان کے اسی امتیاز کی وجہ سے ہو۔

٭ ٭ ٭ ٭

---

[1] مجمع البیان ج ۱۰ صفحہ ۴۰۶

[2] "اسباط" کے بارے میں تفصیلی وضاحت، تفسیر نمونہ جلد اوّل میں کی جاچکی ہے (دیکھیے اردو ترجمہ ص۴۴۳)

Marfat.com

۱۶۷۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ قَدۡ ضَلُّوۡا ضَلٰلًاۢ
بَعِیۡدًا ۝
۱۶۸۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَظَلَمُوۡا لَمۡ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغۡفِرَ لَہُمۡ وَلَا لِیَہۡدِیَہُمۡ
طَرِیۡقًا ۝
۱۶۹۔ اِلَّا طَرِیۡقَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی
اللّٰہِ یَسِیۡرًا ۝

ترجمہ

۱۶۷۔ جو لوگ کافر ہوگئے ہیں اور انھوں نے (لوگوں کو) راہِ خُدا سے روکا ہے وہ دُور دراز کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

۱۶۸۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور (اپنے اوپر اور دوسروں پر) ظلم کیا خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا اور انھیں کسی راستے کی ہدایت نہیں کرے گا۔

۱۶۹۔ مگر جہنم کے راستے کی کہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بے ایمان افراد اور اہلِ ایمان کے بارے میں متعدد مباحث گزر چکے ہیں۔ ان آیات میں ایک اور گروہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے بدترین قسم کا کفر انتخاب کر رکھا ہے۔ انھوں نے اپنی گمراہی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر بھی ظلم و ستم روا سمجھتے ہیں اور دوسروں پر بھی کیونکہ نہ وہ خود راہِ ہدایت پر چلتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی راہِ ہدایت پر نہ چلیں۔

لہٰذا پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: جو لوگ کافر ہوگئے ہیں اور لوگوں کے راہِ خدا میں قدم اٹھانے میں حائل ہوتے ہیں وہ بہت دور کی گمراہی کا شکار ہیں (ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ قد ضلوا ضلٰلا بعیدًا)۔ یہ لوگ جادۂ حق سے اس لیے دُور ترین ہیں، کیونکہ یہ ضلالت و گمراہی کے مبلغ ہیں اور بہت بعید نظر آتا ہے کہ ایسے لوگ اس راہ سے دست بردار ہوجائیں کہ جس کی طرف وہ خود دعوت دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کفر کے ساتھ ہٹ دھرمی اور عناد کو بھی ملا لیا ہے اور بے راہ روی کی طرف قدم اٹھایا ہے کہ جو راہِ حق سے بہت دُور ہے۔

Marfat.com

اگلی آیت میں مزید کہتا ہے: جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے ظلم کیا ہے (انھوں نے حق پر بھی ظلم کیا ہے کہ جو چیز اس کے شایانِ شان تھی اسے انجام نہیں دیا اور اپنے اوپر بھی ظلم کیا ہے کہ خود کو سعادت سے محروم کر دیا ہے اور وہ گمراہی میں جا پڑے ہیں، نیز دوسروں پر بھی ظلم کیا ہے کہ انھیں راہِ حق سے روکا ہے) ایسے افراد کو پروردگار کی مغفرت میسر نہیں آئے گی اور خدا انھیں راہِ جہنم کے علاوہ کسی اور راستے کی راہنمائی نہیں کرے گا (ان الذین کفروا وظلموا لم یکن اللہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم طریقًا الا طریق جھنم) اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے (خالدین فیھا ابدًا) انھیں جاننا چاہیے کہ خدائی تہدید اور دھمکی عمل پذیر ہو کے رہے گی کیونکہ خدا کے لیے یہ کام آسان ہے اور وہ اس پر قدرت رکھتا ہے (وکان ذٰلک علی اللہ یسیرًا)۔

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ مندرجہ بالا آیات ایسے کفار اور ان کی سزا کے بارے میں خاص تاکید کرتی ہیں ایک طرف ان کی گمراہی کو ضلال بعید کہا گیا ہے اور دوسری طرف " لم یکن اللہ " سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں بخش دینا مقامِ خداوندی کے لائق نہیں ہے اور تیسری طرف خلود اور "ابدا" سے اس پر مزید تاکید کی گئی ہے یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ وہ خود گمراہ ہونے کے علاوہ دوسروں کو گمراہ کرنے میں کوشاں رہتے تھے اور اس پر ان کی جوابدہی بہت عظیم ہو گئی تھی۔

۱۷۰۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَقِّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ فَاٰمِنُوۡا خَيۡرًا لَّـكُمۡ‌ ؕ وَاِنۡ تَكۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۝

ترجمہ

۱۷۰۔ اے لوگو! (جس) پیغمبر (کے انتظار میں تم تھے وہ) پروردگار کی طرف سے حق کے (پروگرام کے ساتھ) تمھارے پاس آگیا ہے اس پر ایمان لے آؤ کہ اس میں تمھارا فائدہ ہے اور اگر کافر ہو جاؤ (تو خدا کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کے لیے ہے لہٰذا اللہ دانا و حکیم ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں غیر مومن افراد کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ اب اس آیت میں ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے اور اس کے نتیجے کا ذکر کیا گیا ہے اور مختلف تعبیرات جو انسان میں اشتیاق پیدا کریں ان میں سب کے ذریعے تمام لوگوں کو اس بلند مقصد کی ترغیب دی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اے لوگو! وہی پیغمبر کہ جس کے تم منتظر تھے اور جس کے بارے میں گذشتہ آسمانی کتب میں نشاندہی کی جا چکی ہے وہ دین حق لے کر تمہاری طرف آچکا ہے (یاایها الناس قد جاءکم الرسول[1] بالحق[2])۔

اس کے بعد فرمایا: یہ پیغمبر اس ذات کی طرف سے آیا ہے جس نے تمہاری پرورش و تربیت اپنے ذمے رکھی ہے (من ربکم) پھر مزید فرمایا: اگر ایمان لے آؤ تو تمہارے فائدے میں ہے اس سے تم کسی دوسرے کی خدمت نہیں کرو گے بلکہ یہ خود تمہاری اپنی خدمت ہوگی (فامنوا خیرا لکم) اور آخر میں فرمایا: یہ خیال نہ کرو کہ اگر تم نے راہ کفر اختیار کی تو اس سے خدا کو کوئی نقصان ہوگا، ایسا نہیں ہے کیونکہ خدا ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں (وان تکفروا فان لله ما فی السموٰت والارض) علاوہ ازیں چونکہ خدا عالم اور حکیم ہے اس نے جو احکام تمہیں دیئے ہیں، اور جو پروگرام ترتیب دیئے ہیں سب میں حکمت اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں اور تمہارے فائدے میں ہیں (وکان الله علیما حکیما) لہٰذا اگر اس نے انبیاء اور پروگرام بھیجے ہیں تو یہ اس لیے نہیں کہ اسے ضرورت تھی بلکہ اس کے علم و حکمت کا تقاضا ہے۔ اس لیے ان تمام پہلوؤں کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کیا یہ مناسب ہے کہ تم راہ ایمان کو چھوڑ کر راہ کفر پر گامزن ہو جاؤ۔

۱۷۱۔ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ وَلَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ ؕ
اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ
اَلۡقٰٮهَاۤ اِلٰى مَرۡيَمَ وَرُوۡحٌ مِّنۡهُ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا
تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوۡا خَيۡرًا لَّـكُمۡ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبۡحٰنَهٗۤ
اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ۝

ترجمہ

۱۷۱۔ اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو (اور زیادہ روی) نہ کرو اور حق کے سوا خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ مسیح

---

[1] ظاہراً "الرسول" کی الف لام عہد کی اور اس پیغمبر کی طرف اشارہ ہے جس کے وہ انتظار میں تھے نہ صرف یہود و نصاریٰ بلکہ مشرکین بھی۔ کیونکہ وہ اہل کتاب سے اس ضمن میں کچھ مطالب سن چکے تھے اور وہ بھی منتظر تھے۔

[2] طرق اہل بیتؑ سے منقول بعض روایات میں حق کی تفسیر "ولایت حضرت علیؑ" سے کی گئی ہے اور جیسا کہ بارہا کہا جا چکا ہے ایسی تفسیر میں واضح مصداق کو بیان کیا جاتا ہے ورنہ آیت اس معنی میں منحصر نہیں ہوتی۔

Marfat.com

عیسٰی بن مریم صرف خدا کے فرستادہ اور اس کا کلمہ (اور مخلوق) ہیں کہ جنھیں اس نے مریم کی طرف القا کیا اور وہ اس کی طرف سے (شائستہ) روح تھے۔ اس لیے خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور نہ یہ کہو کہ (خدا) تین ہیں۔ اس بات سے رُک جاؤ کہ یہ (بات) تمھارے فائدے میں نہیں ہے۔ خدا تنہا معبود یگانہ ہے۔ وہ منزہ ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو (بلکہ) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اس کا ہے اور ان کی تدبیر و سرپرستی کے لیے خدا کافی ہے۔

تفسیر

خیالی تثلیث

اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں کفار اور اہلِ کتاب کے بارے میں جاری مباحث کے حوالے سے مسیحی معاشرے کے اہم ترین انحراف کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے تثلیث یا تین خداؤں کا مسئلہ۔ مختصر سے استدلالی جملوں کے ساتھ انھیں اس عظیم انحراف کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے۔

پہلے انھیں خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اپنے دین میں غلو کی راہ نہ چلو اور حق کے علاوہ خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو (یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم ولا تقولوا علی اللہ الا الحق)۔

آسمانی ادیان سے انحراف میں ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ لوگوں نے پیشواؤں اور راہنماؤں کے بارے میں غلو سے کام لیا۔ انسان چونکہ اپنے آپ سے لگاؤ رکھتا ہے لہذا وہ چاہتا ہے کہ اپنے رہبروں کو بھی ان کے اصل مقام سے بلند تر بنا کر پیش کرے تاکہ اس طرح اس کی اپنی عظمت میں اضافہ ہو۔ بعض اوقات لوگ اس ہولناک بھنور میں اس لیے پھنس جاتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ پیشواؤں کے بارے میں غلو ان سے عشق اور لگاؤ کی نشانی ہے غلو کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ مذہب کی اصلی بنیاد یعنی خدا پرستی اور توحید کو خراب کر دیتا ہے اسی لیے غالیوں کے بارے میں اسلام کا رویہ نہایت شدید اور سخت ہے اور عقائد و فقہ کی کتب میں غالیوں کو کفار کی بدترین قسم قرار دیا گیا ہے۔

تثلیث اور الوہیتِ مسیح کا ابطال

اس سلسلے میں چند نکات پیش خدمت ہیں:۔

۱۔ عیسٰی مریم کے بیٹے ہیں: قرآنِ حکیم میں عیسٰی کا نام ان کی والدہ کے نام کے ساتھ سولہ مرتبہ آیا ہے (انما المسیح عیسی ابن مریم) یعنی عیسٰی صرف مریم کے بیٹے ہیں یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ مسیح بھی دیگر انسانوں کی طرح رحمِ مادر میں رہے اور ان پر بھی جنین کا دور گذرا وہ دیگر انسانوں کی طرح پیدا ہوئے، دودھ پیا اور آغوشِ مادر میں پرورش پائی

Marfat.com

یعنی تمام بشری صفات ان میں موجود تھیں۔ لہذا کیسے ممکن ہے کہ ایسا شخص جو قوانین طبیعت اور عالم مادہ کا متمول و محکوم ہو وہ خدائے ازلی و ابدی بن جائے۔

خصوصاً لفظ "انما" جو زیر بحث آیت میں آیا ہے وہ اس وہم کا جواب ہے کہ اگر عیسیٰ کا باپ نہیں تو اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے بلکہ وہ صرف مریم کا بیٹا ہے۔

۲۔ عیسیٰ خدا کے رسول ہیں: عیسیٰ خدا کے فرستادہ اور رسول ہیں (رسول اللہ) عیسیٰ کا یہ مقام اور حیثیت بھی ان کی الوہیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی مختلف باتیں جن میں سے کچھ اناجیل موجودہ میں بھی ہیں، سب کی سب انسانی ہدایت کے لیے ان کی نبوت و رسالت کی حکایت کرتی ہیں نہ کہ ان کی الوہیت اور خدائی کی۔

۳۔ عیسیٰ خدا کا کلمہ ہیں: عیسیٰ خدا کا کلمہ ہیں جو مریمؑ کی طرف القاء ہوا (وکلمته القاها الی مریم) قرآن کی چند آیات میں عیسیٰ کو کلمہ کہا گیا ہے یہ تعبیر مسیح کے مخلوق ہونے کی طرف اشارے کے لیے ہے جیسے ہمارے کلمات، ہماری مخلوق اور ایجاد ہیں، اسی طرح عالم آفرینش کے موجودات بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ نیز جیسے ہمارے کلمات ہمارے اندرونی اسرار کا مظہر ہوتے ہیں اور ہمارے جذبات و صفات کے ترجمان ہوتے ہیں اسی طرح مخلوقاتِ عالم بھی خدا کی صفاتِ جمال و جلال کو واضح کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیات قرآنی میں متعدد مقامات پر تمام مخلوقات کے لیے لفظ "کلمة" استعمال کیا گیا ہے (مثلاً کہف ۱۰۹ اور لقمان ۲۹) البتہ یہ کلمات آپس میں مختلف ہیں۔ بعض بہت اہم اور بلند ہیں اور بعض نسبتاً معمولی اور کم تر ہیں۔ حضرت عیسیٰ آفرینش کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ مقام رسالت کے علاوہ یہ امتیاز بھی رکھتے تھے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے۔

۴۔ عیسیٰؑ روح ہیں: حضرت عیسیٰ روح ہیں، جنھیں خدا نے پیدا کیا ہے (و روح منه) یہ تعبیر قرآن حکیم میں حضرت آدمؑ کے بارے میں بھی آئی ہے۔ ایک معنیٰ کے لحاظ سے تمام نوعِ انسانی کے بارے میں ہے یہ اس روح کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جسے خدا نے دیگر انسانوں میں عموماً اور حضرت مسیحؑ اور باقی انبیاء میں خصوصیت سے پیدا کیا۔

بعض لوگوں نے حضرت مسیحؑ کے بارے میں اس تعبیر سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے انھوں نے کہا ہے کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ عیسیٰ خدا کا جزء ہیں اور "منه" اس کیلئے دلیل ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسے مواقع پر "من" تبعیض کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اصطلاح کے مطابق یہ "من" نشویه ہے۔ جو کسی چیز کی پیدائش کا سرچشمہ اور منشاء بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ تواریخ میں ہے کہ ہارون رشید کا ایک عیسائی طبیب تھا اس نے ایک روز علی بن حسین واقدی سے مناظرہ کیا، واقدی علماءِ اسلام میں سے تھا۔

طبیب نے کہا: تمھاری آسمانی کتاب میں ایک آیت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحؑ خدا کا جزو ہیں پھر اس نے زیر بحث آیت کی تلاوت کی۔

Marfat.com

واقدی نے فوراً قرآن کی یہ آیت تلاوت کی:

وسخر لکم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض جمیعًا منہ

یعنی ــــــ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے مسخر کیا گیا ہے اور یہ سب اس کی طرف سے ہے[1]

اور مزید کہا:

اگر "من" جزو بتانے کے لیے ہے تو پھر اس آیت کے مطابق آسمانوں و زمین کے تمام موجودات خدا کا جزو ہیں۔

یہ بات سن کر عیسائی طبیب فوراً مسلمان ہوگیا۔ ہارون رشید اس واقعے سے بہت خوش ہوا اور اس نے واقدی کو بہت انعام دیا[2]

علاوہ ازیں یہ امر تعجب خیز ہے کہ عیسائی حضرات والد کے بغیر حضرت عیسٰیؑ کی ولادت کو ان کی الوہیت کی دلیل قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت آدمؑ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے اس مخصوص خلقت کو کوئی بھی ان کی الوہیت کی دلیل نہیں سمجھتا۔

اس بیان کے بعد قرآن کہتا ہے: اب جبکہ ایسا ہے تو خدائے یگانہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں اور اگر اس بات سے اجتناب کرو تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے (فامنوا باللہ و رسلہ ولا تقولوا ثلاثۃ انتھوا خیرًا لکم)۔

دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ خدا ہی معبود یکتا ہے (انما اللہ الٰہ واحد) یعنی تم اس بات کو مانتے ہو کر تثلیث کے ہوتے ہوئے بھی خدا اکیلا اور یگانہ ہے۔ حالانکہ اگر اس کا بیٹا ہو تو وہ اس کا شبیہ ہوگا، تو پھر یکتائی کا کوئی معنی نہیں رہے گا۔ کیسے ممکن ہے کہ خدا کا کوئی بیٹا ہو جبکہ وہ بیوی اور بیٹے کی احتیاج کے نقص سے اور جسم اور عوارض جسم کے نقص سے مبرا و منزہ ہے (سبحانہ ان یکون لہ ولد)۔

علاوہ ازیں وہ ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمان و زمین میں ہیں سب اس کی مخلوق ہیں اور وہ ان کا خالق ہے اور مسیح بھی ان کی مخلوق میں سے ایک ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ ان کے لیے ایک استثنائی حالت کا قائل ہوا جائے۔ کیا ممکن ہے کہ مملوک و مخلوق اپنے خالق و مالک کا بیٹا بن جائے (لہ ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض) خدا صرف ان کا خالق و مالک ہے بلکہ ان کا مدبر، محافظ، رزاق اور سرپرست بھی ہے (وکفیٰ باللہ وکیلا)۔

اصولی طور پر وہ خدا جو ازلی و ابدی ہے اور ازل تا ابد تمام مخلوقات کی سرپرستی اپنے ذمہ لیے ہوئے ہے اسے بیٹے کی کیا

---

[1] جاثیہ ۱۳ (القرآن)

[2] تفسیر المنار جلد ۶ صفحہ ۸۴

Marfat.com

ضرورت ہے، کیا وہ ہماری طرح ہے کہ اپنی موت کے بعد جانشینی کے لیے بیٹے کی خواہش رکھتا ہو۔

تثلیث ــــ عیسائیت کی سب سے بڑی کجروی

عیسائیت جن انحرافات اور کجرویوں کا شکار ہے ان میں سے تثلیث سے بدتر کوئی نہیں۔ وہ تصریح سے کہتے ہیں کہ خدا تین ہیں اور یہ بھی کہ اس کے باوجود وہ ایک اور یکتا ہے یعنی وہ وحدت کو بھی حقیقی سمجھتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ اس بات نے عیسائیت کے محققین کے لیے ایک بہت بڑی مشکل پیدا کر دی ہے اگر خدا کی یکتائی کو مجازی اور تثلیث کو حقیقی سمجھتے تو بھی ایک بات تھی اور اگر توحید کو حقیقی مان لیتے اور تثلیث کو مجازی، پھر بھی معاملہ آسان تھا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ دونوں کو حقیقی اور واقعی سمجھتے ہیں۔

اس آخری دور میں عیسائیوں کی طرف سے بے خبر لوگوں کو بعض تبلیغی تصانیف دی گئی ہیں، جن میں انھوں نے تثلیث مجازی کا ذکر کیا ہے یہ اصل میں ریاکاری ہے جو مسیحیت کے اصلی منابع و کتب اور ان کے علماء کے حقیقی عقائد سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مسیحی ایک غیر معقول مطلب سے دوچار ہیں۔ کیونکہ ۱ = ۳ کو تو ایک ابجد پڑھنے والا بچہ بھی قبول نہیں کر سکتا۔ اسی لیے تو وہ عموماً کہتے رہتے ہیں کہ اس مسئلے کا تعلق میزانِ عقل سے نہیں بلکہ جذبۂ عبادت اور دل سے ہے۔

یہیں سے منطق و عقل سے مذہب کی لاتعلقی کا معاملہ شروع ہوتا ہے اور مسیحیت کو اس خطرناک وادی میں کھینچ لے جاتا ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ مذہب عقلی پہلو نہیں رکھتا بلکہ وہ صرف قلبی و تعبدی پہلو رکھتا ہے یہاں سے علم اور مذہب کی بے گانگی سامنے آتی ہے اور موجودہ مسیحیت کی منطق سے دونوں کا تضاد واضح ہوتا ہے۔ کیونکہ علم کہتا ہے کہ تین کا عدد ہرگز ایک کے عدد کے مساوی نہیں ہے لیکن موجودہ مسیحیت کہتی ہے کہ مساوی ہے۔

تثلیث کے بارے میں چند اہم نکات

۱۔ **اناجیل میں عقیدۂ تثلیث نہیں ہے:** موجودہ کسی انجیل میں بھی مسئلہ تثلیث کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے، اسی لیے عیسائی محققین کا نظریہ ہے کہ تثلیث کا سرچشمہ اناجیل میں مخفی اور غیر واضح ہے۔

ایک امریکی مصنف مسٹر ہاکس کہتا ہے:

لیکن مسئلہ تثلیث عہد عتیق اور عہد جدید میں مخفی اور غیر واضح ہے[1]

جیسا کہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مسئلہ تثلیث تقریباً تیسری صدی کے بعد عیسائیوں میں پیدا ہوا۔ یہ ایک بدعت ہے جو ایک طرف سے غلو کی بنا پر اور دوسری طرف سے عیسائیوں کے دیگر اقوام سے میل جول کی بنا پر حقیقی مسیحیت میں داخل ہو گئی۔
بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ عیسائیوں کی تثلیث اصولی طور پر ہندوؤں کی سہ گانہ پرستی جسے "ثالوث ہندی"

---

[1] قاموس مقدس ص ۳۴۵ طبع بیروت

Marfat.com

کہتے ہیں۔ سے لی گئی ہے۔[1]

۲۔ عقیدۂ تثلیث خلاف عقل ہے: تثلیث خصوصاً تثلیث در وحدت (یعنی۔ ایک ہوتے ہوئے تین) ایک ایسا مطلب ہے جو بالکل نامعقول اور بداہت عقلی کے خلاف ہے اور ہم جانتے ہیں کہ دین کبھی عقل و علم سے جدا نہیں ہو سکتا۔ حقیقی علم حقیقی مذہب سے ہمیشہ ہم آہنگ ہوتا ہے اور یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں یہ بات کہ مذہب کو تعبد ہونے کے ناتے قبول کر لیا جائے بہت ہی غلط ہے کیونکہ اگر کسی مذہب کے اصول قبول کرنے میں عقل کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور تعبد ہونے کے حوالے سے ہی اسے قبول کر لیا جائے تو پھر اس مذہب اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ اس موقع پر پھر کون سی دلیل ہے کہ کہا جائے کہ انسان کو خدا پرست ہونا چاہیے نہ کہ بُت پرست اور یونہی پھر کیوں آخر مسیحی اپنے مذہب کی تبلیغ کریں، لیکن دوسرے مذاہب نہ کریں اور وہ کون سی خصوصیات ہیں جو وہ مسیحیت کے لیے سمجھتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ لوگ اس کی طرف آئیں یہ سب سوالات اس بات کی دلیل ہیں کہ مذہب کو منطق کے ذریعے پہچانا جائے اور یہ بات اس دعویٰ کے بالکل خلاف ہے کہ جس کے مطابق وہ مسئلہ تثلیث میں مذہب کو عقل سے جدا کرتے ہیں۔

بہر حال مذہب کی بنیادوں کو توڑنے کے لیے اس سے بدتر کوئی بات نہیں کہ ہم کہیں کہ مذہب عقلی و منطقی پہلو نہیں رکھتا بلکہ تعبد ہونے کے حوالے سے اختیار کیا جاتا ہے۔

۳۔ خدا ہر لحاظ سے یکتا ہے: توحید کی بحث میں بہت سی دلیلیں پیش کی گئی ہیں جو ذاتِ خدا کی یکتائی اور یگانگی کو ثابت کرتی ہیں اور ہر طرح کی دوگانگی، سہ گانگی یا تعدد کی نفی کرتی ہیں۔ خدا ایک ہی ہے جو لامتناہی وجود ہے، جو علم، قدرت اور توانائی کے لحاظ سے ازلی و ابدی اور غیر محدود ہے ہم جانتے ہیں کہ لامتناہی وجود میں تعدد اور دوگانگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر دو کو لامتناہی فرض کریں تو دونوں ہی محدود ہوں گے کیونکہ پہلا وجود دوسرے کی قدرت و توانائی اور ہستی کا فاقد ہے اور دوسرا وجود اسی طرح پہلے وجود اور اس کے امتیازات و خصوصیات کا فاقد ہے یعنی پہلے وجود کا اپنا وجود اور امتیازات میں اور دوسرے کا اپنا وجود اور امتیازات اس بنا پر پہلا وجود بھی محدود ہو گا اور دوسرا بھی۔ واضح تر الفاظ میں اگر دو وجود تمام جہات سے لامتناہی فرض کر لیے جائیں تو یقیناً پہلا "لامتناہی" وجود جب دوسرے "لامتناہی" وجود کی حد تک پہنچے گا تو وہ تمام ہو جائے گا اور دوسرا "لامتناہی" وجود جب پہلے "لامتناہی" وجود کی حد تک پہنچے گا تو وہ بھی تمام ہو جائے گا۔ لہٰذا دونوں محدود اور متناہی ہوں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ذاتِ خدا جو ایک لامتناہی وجود ہے اس میں ہرگز تعدد نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اگر ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ ذاتِ خدا تین اقنوم یا تین ذاتوں سے مرکب ہے تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ تینوں محدود ہوں نہ کہ غیر محدود اور لامتناہی۔

علاوہ ازیں ہر مرکب اپنے اجزاء کا محتاج ہے اور اس کا وجود ان کے وجود کا معلول ہے ذاتِ خدا میں بھی ترکیب ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ محتاج اور معلول ہو حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بے نیاز ہے اور عالم ہستی کی پہلی علت ہے۔

---

[1] بیسویں صدی کے دائرۃ المعارف (فرید وجدی) کے مادہ ثالوث کی طرف رجوع کریں۔ ہندوؤں کے تین خدا برہما، فیشنو اور سیفا تھے۔

Marfat.com

۴۔ خدا انسانی لباس میں کیونکر ممکن ہے : ان سب باتوں سے قطع نظر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ذات خدا انسانی روپ میں ظاہر ہو اور اسے جسم، مکان، غذا اور لباس وغیرہ کی احتیاج پیدا ہو جائے۔ خدائے ازلی و ابدی کو ایک انسان کے جسم میں محدود کرنا اور اسے مادر رحم میں جنین کی حالت میں سمجھنا بدترین تہمتوں میں سے ہیں جو ذات مقدس الٰہی سے وابستہ کی جائیں۔ اسی طرح خدا کی طرف بیٹے کی نسبت دینا ایک غیر منطقی اور بالکل نامعقول بات ہے کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خدا کے لیے مختلف عوارض جسمانی کا قائل ہوا جائے یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے مسیحیت کے ماحول میں پرورش نہیں پائی اور بچپن سے ان موہوم اور غلط تعلیمات کی عادت نہیں ہے وہ فطرت و عقل کے خلاف یہ باتیں سن کر کڑھنے لگتا ہے خود عیسائی "باپ خدا" اور "بیٹا خدا" جیسی باتیں سن کر اس لیے پریشان نہیں ہوتا کیونکہ وہ بچپن سے ان غلط مفاہیم سے مانوس ہو چکا ہوتا ہے۔

۵۔ پرفریب تشبیہیں : اس دور میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض مسیحی مبلغین بے خبر لوگوں کو غافل رکھنے کیلئے پُرفریب مثالوں کا سہارا لیتے ہیں۔ مثلاً وحدت در تثلیث (یعنی تین ہوتے ہوئے ایک) کو کُرہ آفتاب۔ اس کا نور اور اس کی حرارت سے تشبیہ دیتے ہیں یعنی یہ تین چیزیں ہیں اس کے باوجود ایک حقیقت ہیں۔ اسی طرح وہ اسے ایسے وجود سے تشبیہ دیتے ہیں جس کا عکس تین آئینوں میں پڑ رہا ہو باوجودیکہ وہ ایک ہی وجود ہے پھر بھی تین وجود نظر آتے ہیں۔ اسی طرح وہ مثلث کی مثال دیتے ہیں جس کے تین زاویے ہوتے ہیں لیکن اگر ان زاویوں کو اندر کو بڑھائیں تو ایک ہی نقطے تک جا پہنچتے ہیں۔

تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان مثالوں کا زیر بحث مسئلے سے کوئی ربط نہیں مسلّم ہے کہ کرہ آفتاب اور اس کا نور دو چیزیں ہیں نور قرمزی رنگ سے مافوق لہروں کو کہتے ہیں وہ سائنسی نقطہ نظر سے حرارت سے مختلف ہے جو کا مواج مادون قرمز ہیں اگر انھیں ایک کہا جائے تو یہ غلط فہمی اور مجاز سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

اس سے زیادہ واضح جسم اور آئینوں کی مثال ہے کیونکہ جو عکس آئینوں میں پڑتا ہے وہ انعکاسِ نور کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں اور مسلّم ہے کہ روشنی کا انعکاس خود جسم کے علاوہ چیز ہے اس لیے انھیں ایک چیز نہیں کہا جا سکتا اور جس نے بھی کسی سکول میں طبیعات (PHYSICS) کی پہلی کتاب پڑھی ہو وہ یہ بات جانتا ہے۔

مثلث والی مثال بھی ایسی ہے، مثلث کے زاویے یقیناً متعدد ہوتے ہیں اور مثلث کے اندرونی طرف بڑھتے جانے سے زاویے جب ایک نقطے میں بدل جاتے ہیں تو اس کا مثلث سے کوئی تعلق نہیں۔

باعث تعجب ہے کہ بعض مشرقی عیسائی توحید در تثلیث کے نظریئے کو صوفیا[1] کی وحدتِ وجود کی منطق پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کہے بغیر واضح ہے کہ اگر کوئی شخص وحدتِ وجود کے غلط اور انحرافی عقیدے کو قبول بھی کرے تو بھی اسے چاہیے کہ اس عالم کے تمام موجودات کو ذاتِ خدا کا جزو سمجھے بلکہ اس کا عین تصور کرے اس لیے اس میں سے تثلیث کا تو کوئی مطلب نہیں نکلتا بلکہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک تمام موجودات اس کا جزو یا مظہر قرار پائیں گی۔ لہٰذا مسیحیت کی تثلیث کا وحدتِ وجود سے کوئی ربط نہیں اگرچہ اپنے مقام پر صوفیوں کے وحدت الوجود کا نظریہ بھی باطل ہو چکا ہے۔

---

[1] صوفیوں کے نظریہ وحدت الوجود سے مراد وحدت موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ ہستی بس ایک ہے جو مختلف چہروں میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ ہستی ایک خدا ہے۔

Marfat.com

۶۔ ایک اور اشتباہ:۔ بعض اوقات کچھ عیسائی کہتے ہیں کہ ہم جو عیسیٰؑ کو ابن اللہ کہتے ہیں تو یہ اسی طرح ہے، جیسے تم امام حسینؑ کو ثار اللہ و ابن ثارہ (خون خدا اور فرزند خون خدا) کہتے ہو یا بعض روایات میں حضرت علیؑ کو "ید اللہ" (اللہ کا ہاتھ کہا گیا ہے)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ ایک بہت بڑا اشتباہ ہے کہ بعض نے "ثار" کا معنی خون کیا ہے کیونکہ لفظ "ثار" عربی میں کبھی بھی "خون" کے معنی میں نہیں آیا بلکہ اس کا معنی ہے "خون بہا" عربی میں خون کے لیے "دَم" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اس لیے "ثار اللہ" کا مطلب ہے "اے وہ شخص جس کا خون بہا اللہ سے تعلق رکھتا ہے اور وہی تیرا خونبہا لے گا" یعنی تو کسی ایک خاندان سے تعلق نہیں رکھتا کہ تیرا خون بہا اس خاندان کا سربراہ لے اور نہ ہی تو کسی ایک قبیلے سے تعلق رکھتا ہے کہ سربراہ قبیلہ تیرا خون بہا لے، تو عالم انسانیت سے تعلق رکھتا ہے اور تیرا تعلق تو عالم ہستی اور خدا کی ذات پاک سے ہے۔ لہٰذا تیرا خون بہا اسے لینا چاہیے؛ اسی طرح تو علی ابن ابی طالبؑ کا بیٹا ہے جو شہید راہ خدا تھے اور ان کا خون بہا بھی خدا ہی کو لینا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ اگر کسی عبارت میں مردان خدا کے لیے "ید اللہ" یا اسی طرح کا کوئی لفظ آیا ہے تو یہ تشبیہ، کنایہ اور مجاز کے طور پر ہے۔ کیا کوئی حقیقی عیسائی اس بات پر تیار ہے کہ مسیح کے لیے ابن اللہ کہنے کو ایک طرح کا مجاز اور کنایہ قرار دے، مسلماً ایسا نہیں ہے کیونکہ مسیحیت کی اصلی کتب اور مصادر میں انہیں خدا کا حقیقی بیٹا قرار دیا گیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ صفت مسیح کے ساتھ مخصوص ہے کسی اور کے لیے ایسا نہیں ہے۔

یہ جو عیسائیوں کی بعض سطحی تبلیغاتی تحریروں میں نظر آتا ہے کہ وہ "ابن اللہ" کو کنایہ اور تشبیہ قرار دیتے ہیں یہ زیادہ تر عوام کو فریب دینے کے لیے ہے اس کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل عبارت کی طرف توجہ کریں۔ یہ عبارت قاموس کتاب مقدس کے مؤلف نے لفظ "خدا" کے ضمن میں تحریر کی ہے:

> اور "ابن اللہ" ہمارے نجات دہندہ اور فدیہ بننے والے کا ایک لقب ہے جو اس کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں بولا جا سکتا، مگر ایسے مقام پر کہ جہاں قرائن سے معلوم ہو کہ مقصد خدا کا حقیقی بیٹا ہے[1]

۱۷۲۔ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝

۱۷۳۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ

---

[1] قاموس کتاب مقدس ص ۳۴۵، طبع بیروت

Marfat.com

يَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ○

ترجمہ

۱۷۲۔ مسیح اس سے ہرگز پہلوتہی اور انکار نہیں کرتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ اس کے مقرب فرشتے (اس کا انکار کرتے ہیں) اور جو اس کی عبودیت اور بندگی سے پہلوتہی کرے اور تکبر کرے، بہت جلد وہ ان سب کو اپنی طرف محشور کرے گا (اور انھیں قیامت میں اٹھائے گا)۔

۱۷۳۔ باقی رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال انجام دیے ان کی پوری جزا انھیں دے گا اور اپنے فضل و بخشش سے انھیں مزید دے گا۔ لیکن جنھوں نے پہلوتہی کی اور تکبر کیا انھیں دردناک سزا دے گا اور وہ خدا کے علاوہ اپنے لیے کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہیں پائیں گے

شانِ نزول

بعض مفسرین نے ان آیات کے سلسلے میں ایک شانِ نزول روایت کی ہے اور وہ یہ ہے:
نجران کے کچھ عیسائی پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے عرض کیا:۔
آپ ہمارے پیشوا پر کیوں تنقید کرتے ہیں؟
پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: میں نے ان پر کون سا عیب لگایا ہے؟
وہ کہنے لگے:۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔
اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور انھیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

عیسٰیؑ خدا کے بندے ہیں

اگرچہ زیرِ نظر آیات کی مخصوص شانِ نزول ہے، اس کے باوجود وہ گذشتہ آیات سے مربوط ہیں جن میں الوہیت مسیحؑ کی نفی اور مسئلہ تثلیث کا ابطال کیا گیا ہے۔

پہلے تو ایک اور پہلو سے الوہیتِ مسیحؑ کی نفی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم عیسٰیؑ کی الوہیت کا کیسے عقیدہ رکھتے ہو، جبکہ

Marfat.com

نہ عیسیٰ پروردگار کی بندگی سے پہلو تہی کرتے ہیں نہ خدا کے مقرب فرشتے اس سے پہلو تہی کرتے ہیں (لن یستنکف المسیح ان یکون عبداً اللہ ولا الملئکۃ المقربون) مسلّم ہے کہ جو شخص خود عبادت کرنے والا ہو اس کے معبود ہونے کا کوئی معنی نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اپنی ہی عبادت کرے یا یہ کہ عابد و معبود اور بندہ و خدا ایک ہی ہوں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے ایک حدیث مروی ہے آپ نے کجرو عیسائیوں کو جو حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے مدعی تھے مغلوب کرنے کے لیے ان کے ایک بزرگ جاثلیق سے فرمایا: عیسیٰ کی باقی باتیں تو اچھی ہیں ان میں صرف ایک عیب تھا اور وہ یہ کہ وہ زیادہ عبادت نہیں کرتے تھے۔

وہ عیسائی جھنجھلا اٹھا اور امام سے کہنے لگا: آپ کتنی غلط بات کہہ رہے ہیں۔ اس بات پر تو اتفاق ہے کہ وہ سب سے زیادہ عبادت گذار تھے۔

امام نے فوراً فرمایا: وہ کس کی عبادت کرتے تھے ؟ کیا خدا کے علاوہ کسی کی عبادت کرتے تھے ؟ لہٰذا خود تیرے اعتراف کے مطابق وہ خدا کے بندے، مخلوق اور اس کی عبادت کرنے والے تھے۔ نہ کہ معبود اور خدا تھے۔

وہ عیسائی خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: جو لوگ پروردگار کی عبادت اور بندگی سے پہلو تہی کریں اور اس کی وجہ تکبر ہو تو خدا ان سب کو قیامت کے دن حاضر کرے گا اور ہر ایک کو مناسب سزا دے گا (ومن یستنکف عن عبادتہ و یستکبر فسیحشرھم الیہ جمیعًا)

اس دن اہلِ ایمان اور نیک عمل کرنے والوں کو ان کی مکمل جزا دے گا اور اپنے فضل و رحمت سے اس پر اضافہ کرے گا اور جنھوں نے بندگی سے انکار کیا اور راہِ تکبر اختیار کی وہ دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے اور خدا کے سوا انھیں کوئی سرپرست، حامی اور مددگار نہیں ملے گا (فاما الذین امنوا وعملوا الصٰلحٰت فیوفیھم اجورھم و یزیدھم من فضلہ واما الذین استنکفوا واستکبروا فیعذبھم عذابًا الیمًا ولا یجدون لھم من دون اللہ ولیا ولا نصیرًا)۔

دو اہم نکات

۱۔ استنکفوا اور استکبروا : استنکاف کا معنی ہے کسی چیز سے امتناع اور کسی سے پرے ہٹ جانا۔ اس لیے یہ لفظ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے لیکن اِستکبرُوا کہہ کر اسے محدود کر دیا گیا ہے کیونکہ خدا کی بندگی سے پہلو تہی اور امتناع کبھی جہل و نادانی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی تکبر، خود بینی اور سرکشی کی بنا پر۔ اگر چہ یہ دونوں بُرے ہیں لیکن دوسرا کئی گُنا بدتر ہے۔

۲۔ ملائکہ انکارِ عبادت نہیں کرتے : ملائکہ کے انکارِ عبادت نہ کرنے کا تذکرہ یا تو اس لیے ہے کہ عیسائی تین معبودوں کے قائل تھے (باپ، بیٹا اور روح القدس، یا دوسرے لفظوں میں باپ خدا، بیٹا خدا اور دونوں کے درمیان واسطہ) اس لیے اس آیت میں

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب ج ۴ ص ۳۵۲

Marfat.com

قرآن چاہتا ہے کہ دوسرے معبودوں یعنی مسیح اور روح القدس فرشتہ ہر دو کی نفی کی جائے تاکہ ذات پروردگار کی توحید ثابت ہو جائے یا پھر یہ اس بناء پر ہے کہ آیت میں عیسائیوں کے شرک کا جواب دیتے ہوئے عرب بت پرستوں کے شرک کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو فرشتوں کو خدا کی اولاد اور پروردگار کا جزو سمجھتے تھے یہ انھیں بھی ایک جواب ہے۔

ملائکہ کے بارے میں ان دونوں بیانات کی طرف توجہ کرنے سے اس بحث کی گنجائش نہیں رہتی کہ کیا زیر نظر آیت انبیاء پر ملائکہ کی افضلیت پر دلالت کرتی ہے یا نہیں، کیونکہ آیت تو تثلیث کے تیسرے اقنوم یا مشرکین عرب کے معبودوں کی نفی کے لیے ہے نہ کہ ملائکہ کی مسیح پر فضیلت بیان کرنے کے لیے ہے۔

۱۷۴۔ یَاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ○

۱۷۵۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ○ؕ

ترجمہ

۱۷۴۔ اے لوگو! تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے لیے واضح دلیل آئی اور ہم نے واضح نور تمھاری طرف بھیجا۔

۱۷۵۔ رہے وہ لوگ جو خدا پر ایمان لے آئے اور اس (آسمانی کتاب) سے وابستہ ہوئے بہت جلد ان سب کو اپنی رحمت اور فضل میں داخل کر دے گا اور اپنی طرف سیدھے راستے کی ہدایت کرے گا۔

تفسیر

نورِ مبین

سابقہ آیات میں توحید اور تعلیماتِ انبیاء سے اہلِ کتاب کے انحراف کی بحث تھی۔ اب ان دو آیتوں میں آخری بات کہی گئی ہے اور راہِ نجات کو مشخص و معین کر دیا گیا ہے پہلے تو اس عالم کے تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: اے لوگو! تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس ایک پیغمبر آیا ہے کہ جس کے پاس واضح دلائل و براہین موجود ہے اور اسی طرح اس کے ساتھ ایک نورِ آشکار بھیجا گیا ہے جس کا نام قرآن ہے جو تمھاری راہِ سعادت کو روشن کرتا ہے (یَاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا)۔

بعض علماء کے نظریئے کے مطابق "برہان" "برہ" (بروزن "فرح") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے سفید ہونا

Marfat.com

اور چونکہ واضح استدلال سننے والے کے لیے حق کے چہرے کو آشکار، نورانی اور سفید کر دیتا ہے لہذا اسے برہان کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ بعض مفسرین کہتے ہیں اور قرائن بھی گواہی دیتے ہیں کہ زیر نظر آیت میں برہان سے مراد پیغمبر اسلامؐ کی ذات بابرکات ہے اور نور سے مراد قرآن مجید ہے جبکہ دوسری آیات میں بھی اسے نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تفسیر نور الثقلین، علی بن ابراہیم اور مجمع البیان میں طرق اہل بیتؑ سے کئی ایک احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ لفظ برہان پیغمبر اکرمؐ کے لیے ہے اور نور سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔ یہ تفسیر اوپر بیان کی گئی تفسیر کے منافی نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ نور کا یہاں وسیع مفہوم ہو، جس میں قرآن بھی شامل ہو اور امیر المومنین علیؑ بھی جو کہ قرآن کے محافظ، مفسر اور مدافع ہیں۔

بعد والی آیت میں اس برہان اور نور کی پیروی کے نتیجے کا ذکر ہے: باقی رہے وہ جو خدا پر ایمان لائے اور انھوں نے اس آسمانی کتاب سے تمسک کیا، بہت جلد وہ انھیں اپنی وسیع رحمت میں داخل کرے گا اور اپنے فضل و رحمت سے ان کی جزا میں اضافہ کرے گا اور انھیں صراط مستقیم اور راہ راست کی طرف ہدایت کرے گا (فاما الذین امنوا بالله واعتصموا به فسیدخلهم فی رحمة منه وفضل ویهدیهم الیه صراطاً مستقیماً)۔

۱۷۶- يَسْتَفْتُونَكَ ط قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ط اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ج وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ط فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ط وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ط يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ع

ترجمہ

۱۷۶- تجھ سے (بہن بھائیوں کی میراث کے بارے میں) سوال کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ خدا تمھارے لیے کلالہ (بہن بھائی) کا حکم بیان کرتا ہے۔ اگر ایک مرد مر جائے جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے چھوڑے ہوئے مال سے آدھا (بطور میراث) لے گی اور (اگر بہن مر جائے اور اس کا وارث صرف ایک بھائی ہو تو) وہ اس بہن کا سارا مال میراث میں لے گا۔ اس صورت میں کہ (متوفی کی) کوئی اولاد نہ ہو اور اگر (متوفی کی) دو بہنیں باقی ہوں تو وہ مال کا دو تہائی لیں گی اور اگر بہن بھائی اکٹھے ہوں تو (تمام مال اس طرح سے تقسیم کریں گے کہ) ہر مذکر کے لیے مؤنث کے حصے سے دوگنا ہوگا۔ خدا تمھارے لیے (اپنے احکام) بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

Marfat.com

اور خدا تمام چیزوں کو جانتا ہے۔

شانِ نزول

بہت سے مفسّرین جابر بن عبداللہ انصاری سے اس آیت کی شانِ نزول اس طرح نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں؛
میں بہت سخت بیمار ہو گیا تھا تو پیغمبرؐ میری عیادت کے لیے تشریف لائے اور وہیں وضو کیا اور اپنے وضو کا پانی مجھ پر چھڑکا۔ میں چونکہ موت کی فکر میں تھا، پیغمبر سے عرض کیا؛ میری وارث فقط میری بہنیں ہیں، ان کی میراث کس طرح ہو گی؟
اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جسے آیتِ فرائض کہتے ہیں۔
بعض کے نظریئے کے مطابق احکامِ اسلام کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی یہ آخری آیت ہے[1]

تفسیر

زیرِ نظر آیت میں بھائی بہنوں کی میراث کی مقدار بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ اس سورہ کے اوائل میں آیت ۱۲ کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بہنوں اور بھائیوں کی میراث کے بارے میں قرآن حکیم میں دو آیتیں ہیں۔ ایک وہی آیت ۱۲۔ دوسری یہ آیت جو سورہ نساء کی آخری آیت ہے اگرچہ دونوں آیات میراث کی مقدار کے بارے میں مختلف ہیں لیکن جیسا کہ سورہ کی ابتداء میں بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ان میں ہر ایک بہنوں اور بھائیوں کی الگ الگ قسم کے بارے میں ہے۔ آیت ۱۲، مادری بہن بھائیوں کے بارے میں ہے۔ لیکن زیرِ بحث آیت پدری مادری یا صرف پدری بہن بھائیوں کے بارے میں ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ عام طور پر کبھی تو کچھ لوگ متوفی سے بالواسطہ ربط رکھتے ہیں۔ ان کی میراث کی مقدار اسی واسطے سے ہوتی ہے یعنی مادری بہن بھائی ماں کے حصّے کے حساب سے لیتے ہیں جو کہ ایک تہائی ہے اور پدری یا مادری پدری بہن بھائی باپ کی میراث والا حصہ لیتے ہیں جو کہ دو تہائی ہے۔ آیت ۱۲ چونکہ بہن بھائیوں کی میراث کے متعلق ایک تہائی حصّے کے بارے میں ہے اس لیے یہ ان کے بارے میں ہے جو صرف ماں کی طرف سے متوفی کے ساتھ مربوط ہیں جبکہ زیرِ بحث آیت دو تہائی حصّے کے بارے میں ہے لیکن یہ ان بہن بھائیوں سے متعلق ہے جو باپ سے یا ماں باپ دونوں سے مربوط ہیں۔ علاوہ ازیں آئمہ اہل بیتؑ سے مروی روایات جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں بہرحال اب اگر ایک تہائی یا دو تہائی میراث بھائی یا بہن سے متعلق ہے تو باقی ماندہ مال قانونِ اسلام کے مطابق دیگر ورثہ میں تقسیم ہو گا اب جبکہ یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ان دونوں آیات میں کوئی اختلاف نہیں ہم ان احکام کی تفسیر شروع کرتے ہیں جو اس آیت میں آئے ہیں۔

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) صراط مستقیم کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل میں سورۂ حمد کی تفسیر کے ضمن میں تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے (اردو ترجمہ ص ۳۰)

[1] تفسیر صافی، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

توجہ رہے کہ یہ آیت کلالہ (بہن بھائی) کے بارے میں سوال کے جواب کے طور پر نازل ہوئی ہے[1]۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے، تم سے اس بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ خدا کلالہ (بھائی بہن) کے بارے میں تمہارے لیے حکم بیان کرتا ہے (یستفتونك قل الله یفتیکم فی الکلالة) اس کے بعد چند احکام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بہن بھائی کی میراث کے چند احکام

۱۔ جب کوئی مرد دنیا سے چلا جائے اس کی کوئی اولاد نہ ہو فقط ایک بہن ہو تو اس کی آدھی میراث اس ایک بہن کو ملیگی (ان امرؤا ھلك لیس له ولد وله اخت فلها نصف ما ترك)۔

۲۔ اگر کوئی عورت مر جائے، اس کی اولاد نہ ہو اس کا بس ایک بھائی ہو (جو پدری ہو یا مادری پدری ہو) تو اس کی ساری میراث اس کے اس اکیلے بھائی کو ملے گی (وھو یرثها ان لم یکن لها ولد)

۳۔ اگر کوئی شخص دنیا سے چلا جائے اور دو بہنیں پیچھے چھوڑ جائے تو وہ اس کی دو تہائی میراث لیں گی (فان کانتا اثنتین فلهما الثلثان مما ترك)۔

۴۔ اگر مرنے والے شخص کی چند بہنیں اور چند بھائی ہوں (جو دو سے زیادہ ہوں) تو وہ اس کی تمام میراث آپس میں تقسیم کرینگے اس طرح سے کہ ہر بھائی کا حصہ ایک بہن سے دوگنا ہوگا (وان کانوا اخوة رجالا ونساء فللذکر مثل حظ الانثیین)۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: خدا یہ حقائق تم سے بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور سعادت کی راہ پالو اور (یقیناً) جس راستے کی خدا نشاندہی کرتا ہے وہی صحیح اور حقیقی راستہ ہے، (کیونکہ) وہ ہر چیز سے دانا ہے (یبین الله لکم ان تضلوا والله بکل شیءٍ علیم[2])۔

یہ بات بتا کہے نہ رہ جائے کہ زیر نظر آیت میں بہن بھائیوں کی میراث اس صورت میں بیان کی گئی ہے جبکہ اولاد نہ ہو اور ماں باپ کے ہونے یا نہ ہونے کے متعلق اس میں کوئی بات نہیں آئی۔ لیکن اس سورہ کی ابتدائی آیات کے مطابق ماں باپ ہمیشہ اولاد کے یعنی میراث کے پہلے طبقے کے ہم پلہ قرار پاتے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت اس مقام کے لیے ہے جب نہ اولاد ہو اور نہ ماں باپ۔

"سورۂ نساء" کی تفسیر اختتام کو پہنچی۔

---

[1] کلالہ کے لغوی معنی کیا ہیں اور یہ کہ بہن بھائیوں کو کلالہ کیوں کہتے ہیں...... اس کے بارے میں سورہ نساء آیت ۱۲ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے (ص ۲۱۶ اردو ترجمہ جلد ۳)

[2] "ان تضلوا" یہاں "ان لا تضلوا" کے معنی میں ہے یعنی لفظ "لا" مقدر ہے۔ ایسی تعبیرات قرآن میں اور عربی زبان میں بہت ملتی ہیں۔

Marfat.com

سُورۂ مآئدہ

★ — مدنی ہے
★ — اس کی ۱۲۰ آیات ہیں

Marfat.com

سُورۂ مائدہ کے مضامین

یہ سُورت مدنی سُورتوں میں سے ہے ۔ اس کی ۱۲۰ آیتیں ہیں ۔ کہتے ہیں کہ یہ سُورت سورۂ فتح کے بعد نازل ہوئی ۔ ایک روایت کے مطابق یہ ساری سُورت حجۃ الوداع میں اور مکہ و مدینہ کے درمیان نازل ہوئی[1]

یہ سورت معارف ، عقائد اسلامی اور احکام دینی پر مشتمل ہے ۔

پہلے حصّے میں پیغمبر اکرمؐ کے بعد کے لیے مسئلہ ولایت و رہبری ، عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث ، قیامت و معاد کے کچھ مسائل اور انبیاء سے ان کی امتوں کے بارے میں پرسش کے معاملات ہیں ۔

دوسرے حصّے میں ایفائے عہد کا مسئلہ ، عدالتِ اجتماعی کا معاملہ ، عادلانہ شہادت اور قتل نفس کی حُرمت کا حکم ہے ۔ (اسی مناسبت سے آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ ہے جبکہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تھا) اسی طرح کچھ حلال و حرام غذاؤں کی وضاحت ہے کچھ وضو اور تیمم کے احکام ہیں ۔

اس کا نام " مائدہ "[2] اس لیے ہے کیونکہ حضرت عیسٰیؑ کے انصار کے لیے مائدہ کے نزول کی داستان اسی سُورت کی آیت ۱۱۴ میں بیان کی گئی ہے ۔

---

[1] المنار ج ۶ ص ۱۱۶ ۔ توجہ رہے کہ کسی سُورت کے مدنی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ مکہ سے ہجرت پیغمبرؐ کے بعد نازل ہوئی ہو اگرچہ سُورت کا نزول شہر مدینہ میں نہ ہوا ہو ۔

[2] مائدہ دراصل اس برتن (تھالے) کو کہتے ہیں جس میں کھانا رکھا جائے ۔

Marfat.com

سورۂ مائدہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ۬ؕ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَہِیۡمَۃُ الۡاَنۡعَامِ
اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ
مَا یُرِیۡدُ ۝

ترجمہ

اللہ کے نام سے جو بخشنے والا مہربان ہے۔

۱۔ اپنے عہد و پیمان اور قول و قرار پورے کرو، چوپائے (اور چوپایوں کے جنین) تمھارے لیے حلال کر دیئے گئے ہیں مگر وہ جو تم سے بیان کیے جائیں گے (ان کے سوا جن کی استثناء کی جائے گی) اور احرام کے وقت شکار کو حلال نہ سمجھو اور خدا جو چاہتا ہے (اور مصلحت دیکھتا ہے) حکم کرتا ہے۔

تفسیر

ایفائے عہد ضروری ہے

جیسا کہ اسلامی روایات اور بڑے بڑے مفسرین کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے، سورۃ پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی آخری سورت ہے (یا آخری سورتوں میں سے ہے)۔ تفسیر عیاشی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے فرمایا:

"سورۂ مائدہ رحلتِ پیغمبرؐ سے دو یا تین ماہ پہلے نازل ہوئی"[1]

---

[1] تفسیر برہان جلد اوّل صفحہ ۴۳۰

توجہ رہے کہ اس سورہ میں وضو، تیمم وغیرہ کے احکام اس کے آخری ہونے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ ایسے بہت سے احکام تکرار و تاکید کا پہلو رکھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے بعض احکام سورۂ نساء میں بھی ہیں۔

Marfat.com

یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ سورہ ناسخ ہے منسوخ نہیں، یہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔
یہ بات اس بات کے منافی نہیں جو اس تفسیر کی دوسری جلد میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۱ کے ذیل میں کی گئی ہے۔ وہاں اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ روایات کے مطابق مذکورہ آیت پیغمبرؐ پر نازل ہونے والی آخری آیت ہے۔ یہاں گفتگو سورہ کے بارے میں ہے اور وہاں بات ایک آیت کے متعلق تھی۔
اس سورہ میں اس کے خاص موقع کے وجہ سے مفاہیم اسلامی بیان کیے گئے ہیں دین سے متعلق آخری پروگراموں کا تذکرہ ہے۔ اس میں اُمت کی رہبری اور پیغمبر اسلامؐ کی جانشینی کا ذکر ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس سورہ کا آغاز عہد و پیمان کے لازمی ایفا کے حکم سے ہوتا ہے۔
پہلے جملے میں فرمایا گیا ہے، اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان کے ساتھ وفا کرو (یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ) یہ اس لیے ہے تاکہ اہلِ ایمان کے لیے ان پیمانوں اور وعدوں کا ایفا ضروری قرار دیا جائے جو وہ خدا سے پہلے باندھ چکے ہیں یا جن کے متعلق اس سورہ میں اشارہ ہوا ہے یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی مسافر اپنے رشتہ داروں اور پیروکاروں سے وداع ہوتے ہوئے آخری لمحوں میں تاکید کرتا ہے کہ میری وصیتوں اور نصیحتوں کو بھول نہ جانا اور جو قول و قرار تم نے میرے ساتھ باندھے ہیں ان کے وفادار رہنا۔
توجہ رہے کہ "عقود" "عقد" کی جمع ہے۔ "عقد" دراصل ایک محکم چیز کے اطراف کو جمع کرنے کے معنی میں ہے اسی مناسبت سے رسی کے دو سروں کو یا دو رسیوں کو ایک دوسرے سے گرہ لگانے کو "عقد" کہتے ہیں بعد ازاں اس حسی معنی سے معنوی مفہوم پیدا ہو گیا اور ہر قسم کے عہد و پیمان کو "عقد" کہا جانے لگا۔ البتہ بعض فقہا نے تصریح کی ہے کہ عہد کی نسبت عقد کا مفہوم محدود ہے کیونکہ عقد ایسے پیمان کو کہتے ہیں جو بہت مستحکم ہو نہ کہ ہر عہد و پیمان کو۔ لہٰذا اگر بعض روایات میں اور مفسرین کی بعض تحریروں میں عقد اور عہد ایک ہی مفہوم میں آئے ہیں تو یہ ہماری بیان کردہ بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ مقصد ان دو الفاظ کی اجمالی تفسیر کا بیان کرنا تھا نہ کہ اس کی جزئیات کا تذکرہ منظور تھا۔
اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اصطلاح کے مطابق "العقود" "جمع محلی بہ الف لام" ہے جو عمومیت کے لیے ہوتی ہے اور جملہ بھی بالکل مطلق ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت ہر طرح کے عہد و پیمان کے وفا کرنے کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔ چاہے یہ محکم عہد و پیمان انسان کا انسان کے ساتھ ہو یا انسان کا خدا کے ساتھ ہو۔ اس طرح یہ تمام خدائی اور انسانی اور سیاسی، اقتصادی، اجتماعی، تجارتی، ازدواجی وغیرہ عہد و پیمان پر محیط ہے اور اس کا ایک مکمل وسیع مفہوم ہے اس کی نظر تمام انسانی پہلوؤں پر ہے، چاہے ان کا تعلق عقیدے سے ہو یا عمل سے، وہ فطری عہد و پیمان ہوں یا توحیدی، اور چاہے ان کا تعلق ان معاہدوں سے ہو جو لوگ زندگی کے مختلف مسائل میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔
تفسیر روح المعانی میں راغب کے حوالے سے منقول ہے کہ وضع و کیفیت کے لحاظ سے طرفین میں ہونے والے عقد کی تین قسمیں ہیں۔ کبھی عقد خدا اور بندے کے درمیان ہوتا ہے کبھی انسان اور اس کے نفس کے مابین ہوتا ہے اور کبھی عقد انسان دوسرے انسانوں سے باندھتا ہے[۱] (البتہ عقد کی یہ تینوں قسمیں طرفین کے مابین ہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں

---

[۱] تفسیر روح المعانی، زیر بحث آیت کے ذیل میں

Marfat.com

انسان خود اپنے ساتھ عہد و پیمان باندھتا ہے وہاں وہ اپنے آپ کو دو اشخاص کی طرح فرض کرتا ہے)۔
بہرحال آیت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس میں وہ عہد و پیمان بھی آجاتے ہیں جو مسلمان غیر مسلموں سے باندھتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ ایک فقہی قاعدہ: یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو حقوقِ اسلامی سے بحث کرتی ہیں۔ فقہی مباحث میں اوّل سے آخر تک اس سے استدلال کیا جاتا ہے اس سے ایک اہم فقہی قاعدہ معلوم ہوتا ہے جسے "اصالۃ اللزوم فی العقود" کہتے ہیں۔ یعنی ہر قسم کا عہد و پیمان جو کچھ چیزوں کے بارے میں ہو یا دو افراد کے درمیان کچھ کاموں کے متعلق ہو، اس کا اجراء اور اس پر عمل کرنا ضروری اور لازمی ہے۔

یہاں تک کہ جیسے بعض محققین کہتے ہیں کہ مختلف قسم کے معاملات، شراکتیں، کاروبار اور قراردادیں جو ہمارے زمانے میں موجود ہیں اور سابقہ دور میں نہیں تھیں یا آنے والے دور میں عقلاء میں معرضِ وجود میں آئیں گی اور صحیح اصولوں کی بنیاد پر ہوں گی، یہ قاعدہ سب پر محیط ہے اور یہ آیت سب کے بارے میں ہے (البتہ ان کلی ضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے جن کا اسلام معاہدوں کے بارے میں حکم دیتا ہے)۔

اس آیت میں ایک فقہی قاعدہ کے طور پر استدلال کرنا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ پیمانِ الٰہی جو خدا اور بندوں کے درمیان باندھے گئے ہیں یا وہ مسائل جو رہبری اور امّت کی قیادت سے مربوط ہیں کہ جن کا پیمان پیغمبرؐ کے ذریعے لوگوں سے لیا گیا ہے اس میں شامل نہیں بلکہ آیت ایک وسیع مفہوم کی حامل ہے جس میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ دو طرفہ عہد و پیمان کی وفا اور تکمیل اس وقت تک ضروری ہے جب تک کوئی ایک طرف اسے توڑ نہ دے لیکن اگر ایک طرف سے اسے توڑ دیا جائے تو پھر دوسری طرف پر یہ لازم نہیں ہوگا کہ وہ اسے وفا کرے، اور ایسا معاملہ عقد و پیمان کے مفہوم سے ساقط ہو جاتا ہے۔

۲۔ ایفائے عہد کی اہمیّت: عہد و پیمان کی وفا کا مسئلہ جو زیر بحث آیت میں بیان ہوا ہے، اجتماعی زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے اور اس کے بغیر کوئی اجتماعی ہم کاری اور تعلق ممکن نہیں ہے اور اگر انسان اسے ہاتھ سے دے بیٹھے تو اجتماعی زندگی اور اس کے ثمرات کو عملی طور پر کھو بیٹھتا ہے۔ اسی بنا پر اسلامی مصادر اور کتب میں اس کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ شاید بہت کم کوئی اور چیز ہو جسے اس قدر وسعت سے بیان کیا گیا ہو کیونکہ اس کے بغیر تو معاشرہ ہرج مرج اور عدم اطمینان کا شکار ہو جائے گا، جو نوعِ انسانی کے لیے سب سے بڑی اجتماعی مصیبت ہے۔

نہج البلاغہ میں مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

فانہ لیس من فرائض اللہ شیء الناس اشد علیہ اجتماعا مع تفرق اھوائھم وتشتت آرائھم من تعظیم الوفاء بالعھود، وقد لزم ذلک المشرکون فیما بینھم دون المسلمین لما استوبلوا

Marfat.com

من عواقب الغدر۔

دنیا بھر کے لوگوں میں تمام تر اختلافات کے باوجود ایفائے عہد کی طرح کسی اور امر پر اتفاق نہیں ہے۔ اسی لیے تو زمانہ جاہلیت کے بُت پرست بھی اپنے عہد و پیمان کا احترام کرتے تھے۔ کیونکہ وہ عہد شکنی کے دردناک انجام کو جان چکے تھے۔[1]

امیرالمومنینؑ ہی سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

ان اللہ لا یقبل الا العمل الصالح ولا یقبل اللہ الا الوفاء بالشروط والعھود۔

خدا اپنے بندوں سے عملِ صالح کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں کرتا اور (اسی طرح) خدا شرائط اور عہد و پیمان کے (بارے میں بھی) ایفاء کے علاوہ کچھ قبول نہیں کرتا۔[2]

پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

لا دین لمن لا عھد لہ[3]

جو شخص اپنے عہد و پیمان کا وفادار نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔

لہٰذا ایفائے عہد ایک ایسی بات ہے جس میں افرادِ انسانی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے چاہے طرف مقابل مسلمان ہو یا کوئی غیر مسلم۔ اصطلاح کے مطابق یہ انسانی حقوق میں سے ہے نہ کہ برادرانِ دینی کے حقوق میں سے۔

ایک حدیث میں حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

ثلاث لم یجعل اللہ عزوجل لاحد فیھن رخصۃ، اداء الامانۃ الی البر والفاجر، والوفاء بالعھد للبر والفاجر، و بر الوالدین برین کانا او فاجرین۔

تین چیزیں ایسی ہیں جن کی مخالفت کی خدا نے کسی شخص کو اجازت نہیں دی ۱۔ امانت کی ادائیگی ہر شخص کو چاہے وہ نیک ہو یا بد ۲۔ ایفائے عہد ہر کسی سے چاہے وہ اچھا ہو یا برا ۳۔ اور ماں باپ سے حسن سلوک، چاہے وہ اچھے ہوں یا بُرے۔[4]

یہاں تک کہ ایک روایت میں حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے:

اگر کوئی شخص اشارے سے بھی کوئی عہد اپنے ذمے لے لے تو اسے وفا کرنا چاہیے۔

---

[1] نہج البلاغہ، حضرت علیؑ کے خطوط میں سے خط نمبر ۵۳

[2] سفینۃ البحار، ج ۲ صفحہ ۲۹۴

[3] بحار جلد ۱۶ صفحہ ۱۴۴

[4] اصولِ کافی جلد ۲ صفحہ ۱۶۲

Marfat.com

اس روایت کا متن یہ ہے :

اذا اومی احد من المسلمین او اشار الی احد من المشرکین فنزل علی ذلک فھو فی امان[1] ۔

عہد و پیمان کے بارے میں حکم پر گفتگو ہو چکی جو کہ تمام احکام اور خدائی پیمانوں پر محیط ہے اس کے بعد احکام اسلام کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے ان میں سے پہلا حکم کچھ جانوروں کے گوشت کے حلال ہونے کے بارے میں ہے، فرمایا گیا ہے :

چوپائے (اور ان کے جنین) تمہارے لیے حلال کیے گئے ہیں (احلت لکم بھیمۃ الانعام) ۔ "انعام" جمع ہے "نعم" کی، جس کا معنی ہے اونٹ، گائے اور گوسفند[2]

"بھیمۃ" کا مادہ "بھمۃ" (بروزن "تھمۃ") ہے۔ اس کا معنی ہے "محکم اور سخت پتھر" اور ہر چیز جس کا ادراک مشکل ہو اسے "مبہم" کہتے ہیں اور وہ تمام جانور جو بول چال نہیں سکتے انہیں بھیمۃ کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی آواز میں ابہام ہوتا ہے ۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ چوپایوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے اور اس میں درندے اور پرندے شامل نہیں ہوتے چونکہ حیوانات کے جنین (جو مادہ جانور کے پیٹ میں ہوتے ہیں) بھی ایک قسم کا ابہام رکھتے ہیں ۔ اس لیے انہیں بھی "بھیمۃ" کہا جاتا ہے ۔

اس بنا پر "بھیمۃ الانعام" کا حلال ہونا یا تو تمام چوپایوں کے لیے ہے (البتہ وہ جانور مستثنیٰ ہیں جن کا ذکر بعد کی آیت میں آئے گا) یا ان بچوں کے حلال ہونے کے معنی میں ہے جو حلال گوشت جانوروں کے شکم میں ہوں (وہ بچے کہ جن کی خلقت پوری ہو گئی ہے اور کھال اور بال ان پر اگ آئے ہیں)[3]

کچھ جانوروں کے حلال ہونے کے بارے میں پہلے سے مشخص تھا مثلاً اونٹ، گائے اور گوسفند، لہٰذا ممکن ہے کہ اس آیت میں ان کی جنین کی حیثیت کی طرف اشارہ ہو لیکن جو بات آیت کے معنی سے زیادہ قریب نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے یعنی ایسے جانوروں کے حلال ہونے کے بارے میں بھی ہے اور ان کی جنین کے حلال ہونے سے متعلق بھی ہے اور اگر ایسے جانوروں کا حکم پہلے سے بھی معلوم تھا تب بھی یہاں مستثنیٰ قرار دیے جانے والے جانوروں کے حکم سے پہلے مقدمے کے طور پر اس حکم کا تکرار کیا گیا ہے ۔ اس جملے کی تفسیر کے بارے میں جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس حکم کا ربط ایفائے عہد کے لازمی ہونے سے اس بنا پر تھا کہ ایفائے عہد ایک کلی بنیاد ہے ۔ یہ کلی بنیاد

---

[1] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۲۵۰

[2] "نعم" اگر مفرد کی صورت میں استعمال ہو تو "اونٹ" کا معنی دیتا ہے لیکن جمع کی شکل میں ہو تو اونٹ، گائے اور گوسفند بھی اس کے مفہوم میں آجاتے ہیں (مفردات راغب، مادہ "نعم") ۔

[3] اگر "بھیمۃ" کا معنی آیت میں "حیوانات" ہو تو "انعام" کے ساتھ اس کی اضافت، اضافت بیانیہ کہلائے گی اور اگر "جنین" کے معنی میں ہو تو اس کی اضافت، اضافت لامیہ ہو گی ۔

Marfat.com

احکام الٰہی پر اس لحاظ سے ایک تاکید ہے کہ احکام الٰہی بھی خدا کے بندوں سے عہد و پیمان کی ایک قسم ہے اس کے بعد پھر کچھ احکام بیان کیے گئے ہیں جن میں بعض جانوروں کے گوشت کے حلال ہونے کا ذکر ہے اور بعض جانوروں کے گوشت کے حرام ہونیکا ذکر ہے۔

پھر آیت میں چوپایوں کے گوشت کی حرمت کے بارے میں دو استثنائی حکم ہیں: ان جانوروں کے گوشت کا استثناء ہے جن کی تحریم عنقریب تمہارے لیے بیان کی جائے گی (الا ما یتلی علیکم) اور حالت احرام میں بھی شکار کرنا حرام ہے (یعنی .... حج کے مناسک یا عمرہ کے مناسک انجام دینے کے لیے باندھے گئے احرام کی حالت میں شکار کرنا حرام ہے) (غیر محلی الصید و انتم حرم)[ل]۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: خدا جو حکم چاہتا ہے، صادر کرتا ہے —— یعنی۔ خدا چونکہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور ہر چیز کا مالک ہے لہذا جو حکم بندوں کی مصلحت میں ہو اور حکمت اس کی متقاضی ہو اسے جاری کر دیتا ہے (ان اللہ یحکم ما یرید)

۲۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْیَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ○

ترجمہ

۲۔ اے ایمان والو! شعائر خداوندی (اور مراسم حج کو محترم سمجھو اور ان کی مخالفت) کو حلال قرار نہ دو اور نہ ہی حرام مہینہ کو اور نہ بغیر نشانی والی قربانیوں کو اور نہ نشانیوں والی کو اور نہ وہ کہ جنھیں خانہ خدا کے قصد سے پروردگار کے فضل اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لاتے ہو اور جب تم حالتِ احرام سے نکل جاؤ تو پھر شکار کرنا تمھارے لیے کوئی منع نہیں ہے اور وہ گروہ جو مسجد الحرام کی طرف (حدیبیہ کے سال) تمھارے آنے میں حائل ہوا تھا۔

ل البتہ "الا ما یتلی علیکم" جملہ استثنائیہ ہے اور "غیر محلی الصید" کم کی ضمیر سے حال ہے جو معنی کے لحاظ سے استثناء کا نتیجہ دیتا ہے۔

Marfat.com

اس کی دشمنی تمھیں تجاوز پر نہ اُبھارے اور (ہمیشہ) نیکی اور پرہیزگاری کی راہ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور (ہرگز) گناہ اور تجاوز کی راہ میں ساتھ نہ دو اور خدا سے ڈرو، جس کی سزا سخت ہے۔

تفسیر

ایک آیت میں آٹھ احکام

اس آیت میں چند اہم اسلامی احکام بیان ہوئے ہیں یہ پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والے آخری احکامات میں سے ہیں یہ سب کے سب یا ان میں سے زیادہ تر حج اور خانہ خدا کی زیارت سے مربوط ہیں احکام یہ ہیں:

۱۔ سب سے پہلے اہلِ ایمان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ شعائرِ خداوندی کو نہ توڑو اور ان کی حُرمت کا خیال رکھو (یٰایھا الذین اٰمنوا لا تحلوا شعائر اللّٰہ)۔

اس سلسلے میں مفسّرین میں بہت اختلاف ہے کہ شعائر اللہ سے کیا مراد ہے لیکن اس آیت کے دوسرے حصوں سے اس کی مناسبت سے اور اس کے سالِ نزول (دس ہجری) جو پیغمبر اکرمؐ کے حجۃ الوداع کا سال تھا، کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعائر سے مراد مناسک حج اور حج کا پروگرام ہے، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان سب کا احترام کریں اس تفسیر کا شاہد یہ ہے کہ قرآن میں لفظ شعائر عام طور پر مراسم حج کے بارے میں استعمال ہوا ہے[۱]

۲۔ حرام مہینوں کا احترام کرو اور ان مہینوں میں جنگ وجدال سے احتراز کرو (ولا الشھر الحرام)۔

۳۔ وہ قربانیاں جو حج کے لیے لاتے ہو چاہے وہ نشانی کے بغیر (ھدی[۲]) ہوں یا نشانی والی (قلائد[۳]) ہوں، انھیں حلال نہ سمجھو اور انھیں رہنے دو کہ وہ قربان گاہ تک پہنچ جائیں اور وہاں قربان ہوں (ولا الھدی ولا القلائد)۔

۴۔ خانہ خدا کے تمام زائرین کو ان عظیم اسلامی مراسم کے لیے پوری آزادی ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں افراد، قبائل، خاندانوں اور زبانوں کا کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے اس لیے جو لوگ خدا کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں، حتیٰ کہ جو تجارتی فائدے کے لیے زیارتِ بیت اللہ کے قصد سے آتے ہیں ان سے بھی کوئی مزاحمت نہ کی جائے چاہے وہ تمھارے دوست ہوں یا دشمن، بس اتنا کافی ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور خانہ خدا کے زائر ہیں، یہی ان کے مامون ومحفوظ

---

[۱] بقرہ ۱۵۸ اور حج ۳۲، ۳۶

[۲] "ھدیٰ" جو "ھدیۃ" کی جمع ہے، اس کا مطلب ہے وہ چوپائے جو قربانی کے طور پر خانہ خدا کے لیے "اھداء" کیے جاتے ہیں۔

[۳] "قلائد" جو "قلادۃ" کی جمع ہے، اس کا معنی ہے وہ چیز جو انسان یا کسی جانور کے گلے میں ڈالی جائے یہاں اس سے مراد وہ چوپائے ہیں جو مراسم حج میں قربانی کے لیے لائے جاتے ہیں اور ان پر کوئی علامت اور نشانی لگا دی جاتی ہے۔

Marfat.com

ہونے کے لیے کافی ہے (ولا آمین البیت الحرام یبتغون فضلا من ربھم و رضوانا)۔

بعض مفسرین اور فقہا کا نظریہ ہے کہ یہ جملہ عام ہے یہاں تک کہ غیر مسلموں پر بھی محیط ہے یعنی اگر مشرکین بھی خانہ خدا کی زیارت کے قصد سے آئیں تو ان کی بھی مزاحمت نہ کی جائے۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ سورۂ توبہ جس کے متعلق مشہور ہے کہ نو ہجری میں نازل ہوئی اس کی آیۃ ۲۸ میں مشرکین کے مسجد الحرام کی طرف آنے سے منع کیا گیا ہے اور سورۂ مائدہ پیغمبر اکرمؐ کی آخری عمر دس ہجری میں نازل ہوئی اور شیعہ سنی روایات کے مطابق اس کا کوئی حکم بھی منسوخ نہیں ہوا لہٰذا یہ تفسیر صحیح نہیں ہے اور حق یہی ہے کہ یہ حکم مسلمانوں سے مخصوص ہے۔

۵۔ شکار کی حرمت زمانہ احرام کے لیے ہے اس لیے فرمایا گیا ہے: جب حج یا عمرہ کے احرام سے نکل جاؤ تو پھر شکار کرنا تمھارے لیے جائز ہے (و اذا حللتم فاصطادوا)۔

۶۔ زمانہ جاہلیت کے بت پرست (حدیبیہ کے موقع پر) خانہ خدا کی زیارت میں تم سے مزاحم ہوئے اور انھوں نے تمھیں خانہ خدا کی زیارت کے مناسک انجام نہیں دینے دیئے۔ اس واقعہ کو اس بات کا سبب نہیں بننا چاہیے کہ ان کے اسلام لے آنے کے بعد پرانی دشمنی کو زندہ کرو اور خانہ خدا کی زیارت میں ان کے لیے رکاوٹ بنو (ولا یجرمنکم شنئان قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا)[۱]

یہ حکم اگرچہ خانہ خدا کی زیارت کے بارے میں نازل ہوا ہے لیکن حقیقت میں اس سے ایک عمومی قانون معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو کینہ پرور نہیں ہونا چاہیے اور جو حوادث گذشتہ دور میں گزر چکے ہوں انھیں اپنے ذہن پر سوار نہیں کر لینا چاہیے اور ان کے انتقام کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔

دیکھا جائے تو ہر معاشرے کے نفاق اور تفرقہ بازی کے علل و اسباب میں سے ایک یہی وجہ ہے یہ اسلامی حکم جو کہ اس وقت نازل ہوا جبکہ پیغمبر اسلامؐ کی حیات کا آفتاب آستانہ غروب پر تھا، مسلمانوں کے درمیان نفاق کی آگ کو بھڑکنے سے روکنے کے لیے نازل ہوا۔ اس سے اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

۷۔ اس کے بعد بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے: بجائے اس کے کہ تم اپنے پرانے دشمن اور موجودہ دوستوں سے انتقام کے لیے ایک ہو جاؤ، تمھیں چاہیے کہ نیکی اور تقویٰ کی راہ میں ایک دوسرے سے دستِ تعاون بڑھاؤ۔ نہ یہ کہ گناہ اور تجاوز میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے لگو (وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان)۔

۸۔ آیت کے آخر میں گذشتہ احکام کو محکم کرنے کے لیے اور ان کی تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: پرہیزگاری اختیار کرو اور حکم خدا کی نافرمانی سے بچو، کیونکہ خدا کا عذاب اور اس کی سزائیں بڑی سخت ہیں (واتقوا اللہ ان اللہ

---

[۱] اہل لغت اور مفسرین کے کلمات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ "جَرَم" (بروزن "گرم") اصل میں درخت سے غیر مناسب پھل توڑنے کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ ہر اس کام کے لیے استعمال ہونے لگا جو ناخوش آیند ہو نیز ناپسندیدہ کام کے لیے کسی کو اکسانے کے مفہوم میں بھی بولا جانے لگا۔ اس لیے یہاں "لا یجرمنکم" "لا یحملنکم" کے معنی میں ہے یعنی "تمھیں غلط کام پر نہ اکسائے"۔

Marfat.com

شدید العقاب)۔

نیکی میں ساتھ دینا ضروری ہے

زیرِ نظر آیت میں تعاون کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ اسلامی احکام کی ایک عمومی بنیاد ہے جو تمام اجتماعی اور سیاسی مسائل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس کے مطابق تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ نیک اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ایک دوسرے کا ساتھ دیں لیکن باطل مقاصد، غلط اعمال اور ظلم و ستم میں تعاون اور ہم کاری بالکل ممنوع ہے، چاہے ان کا مرتکب قریبی دوست یا سگا بھائی کیوں نہ ہو۔

یہ اسلامی قانون بالکل اس قانون کے برعکس ہے جو زمانہ جاہلیت کے عرب میں بلکہ آج کے دورِ جاہلیت میں بھی رائج و حاکم ہے ——— جاہلیت کا قانون یہ ہے کہ ——— انصر اخاك ظالما او مظلوما ——— یعنی اپنے بھائی (یا دوست اور ہم پیمان) کی حمایت اور مدد کرو، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

اس زمانے میں اگر ایک قبیلے کے کچھ لوگ کسی دوسرے قبیلے کے بعض افراد پر حملہ کرتے تھے تو قبیلہ کے باقی افراد ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے اور اس تحقیق کی زحمت نہ کرتے کہ حملہ عادلانہ تھا یا ظالمانہ۔ یہ قانون بین الاقوامی سطح پر آج بھی حکم فرما ہے اور اکثر ایک معاہدے میں منسلک ممالک یا جن کے مفادات مشترک ہیں اہم عالمی معاملات میں ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں اور قانون عدالت کا بالکل پاس نہیں کرتے اور ظالم و مظلوم کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ اسلام نے اس قانونِ جاہلیت پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے اسلام کا حکم ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے تعاون اور ہمکاری صرف نیک، اچھے اور اسلامی کاموں میں کرنا چاہیے نہ کہ گناہ، تعدّی اور ظلم میں۔

یہ بات جالبِ نظر ہے کہ "برّ" اور "تقویٰ" دونوں الفاظ مندرجہ بالا آیت میں ایک ساتھ آئے ہیں ان میں سے ایک لفظ اثباتی پہلو رکھتا ہے جو کہ مفید افعال و اعمال کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا لفظ نفی کا پہلو رکھتا ہے جو کہ غلط کاموں سے رک جانے کی طرف اشارہ ہے۔ گویا تعاون و ہم کاری نیکیوں کی طرف دعوت دینے میں بھی ہونا چاہیے اور برائیوں کا مقابلہ کرنے میں بھی۔

فقہ اسلامی میں اس قانون سے حقوق سے متعلق مسائل معلوم کیے جاتے ہیں۔ اسی کی مدد سے چند ایک ایسے معاملات اور تجارتی معاہدوں کو حرام قرار دیا گیا ہے کہ جو گناہ کی کمک اور مدد کا پہلو رکھتے ہیں۔ مثلاً شراب سازی کے کارخانے کے لیے انگور بیچنا یا حق و عدالت کے دشمنوں کے ہاتھ ہتھیار بیچنا یا کام کی کسی جگہ کو غیر شرعی اور خلافِ شریعت معاملات اور کاروبار کے لیے کرایہ پر دینا (البتہ ان احکام کے بارے میں کچھ شرائط ہیں جو فقہی کتب میں بیان کی گئی ہیں)۔

اگر یہ اسلامی بنیاد تمام معاشروں میں فراہم ہو جائے اور لوگ شخصی، نسلی اور قرابتی تعلق کو پیشِ نظر رکھے بغیر ان لوگوں کا ساتھ دیں جو مثبت اور اصلاحی کاموں کے لیے قدم بڑھاتے ہیں اور ظالم اور تجاوز کرنے والے لوگ چاہے کسی طبقے سے ہوں ان کا ساتھ نہ دیں تو بہت سی اجتماعی خرابیاں اور مشکلیں دور ہو جائیں۔ اسی طرح اگر دنیا کی حکومتیں بین الاقوامی سطح پر ظالم اور تجاوز کرنے والے

Marfat.com

شخص یا حکومت سے تعاون نہ کریں تو تعدی، تجاوز، زیادتی، استعمار اور استثمار دنیا سے ختم ہو جائیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض حکومتیں تجاوز کرنے والوں اور ستم گروں کی حمایت کرنے لگتی ہیں اور ان سے مفادات رکھنے والے کھلے بندوں انھیں حمایت کا یقین دلاتے ہیں لہٰذا موجودہ حالات میں بہتری کی توقع نہیں کی جانا چاہیے۔

اسلامی روایات میں اس سلسلے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ہم چند ایک روایات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

اذا کان یوم القیٰمة نادی مناد این الظلمة ؟ واعوان الظلمة ؟ واشباه الظلمة ؟ حتی من برء لهم قلما او لاق لهم دواتًا، قال: فیجتمعون فی تابوت من حدید ثم یرمی بهم فی جهنم۔

جب قیامت بپا ہو گی تو منادی ندا کرے گا:

کہاں ہیں ظالم؟

کہاں ہیں ظالموں کے مددگار؟

کہاں ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنے آپ کو ظالموں سے مشابہ بنایا تھا؟

حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی پکارا جائے گا جنھوں نے ان ظالموں کے لیے قلم تراشا یا ان کی دوات میں صوف ڈالا ـــــ ان سب کو لوہے کے ایک صندوق میں ڈال کر اکٹھا جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔[۲]

۲۔ صفوان جمال، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ وہ کہتے ہیں: میں آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؑ نے فرمایا: تمھارے تمام کام اچھے ہیں سوائے ایک کام کے۔

میں نے عرض کیا: آپ پر قربان جاؤں وہ کون سا کام ہے؟

امامؑ نے فرمایا: تو اپنے اونٹ اس شخص (یعنی .... ہارون) کو کرایہ پر دیتا ہے۔

میں نے عرض کیا: بخدا عیاشی، ہوس بازی اور حرام شکار کے لیے تو کرایہ پر نہیں دیتا، صرف اس (مکہ کے) سفر کیلیے دیتا ہوں۔ پھر میں خود بھی اونٹوں کے ساتھ نہیں جاتا اپنے کسی بیٹے یا کسی اور شخص کو ان کے ساتھ بھیجتا ہوں۔

امام نے فرمایا: صفوان! کیا ان سے کرایہ لیتے ہو؟

میں نے عرض کیا: جی ہاں۔

آپؑ نے فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ وہ اس وقت تک زندہ رہیں اور اپنے منصب پر باقی رہیں جب تک تمھارا کرایہ ادا نہ کریں۔

---

[۱] "لیقہ" عربی زبان میں کپڑے کے اس ٹکڑے یا ریشم کی روئی کو کہتے ہیں، جو دوات میں ڈالی جاتی ہے، تاکہ وہ اپنے اندر سیاہی کو جذب کرلے اور اسے بہہ جانے سے روکے۔

[۲] وسائل الشیعہ، جلد ۱۲ صفحہ ۱۳۱

Marfat.com

میں نے کہا: جی ہاں۔
آپ نے فرمایا: جوان کی بقاء کی خواہش رکھے وہ انھی میں سے ہے اور جوان میں سے ہو وہ جہنم کی آگ میں جائے گا۔
صفوان کہتے ہیں: میں فوراً گیا اور اپنے تمام اونٹ بیچ ڈالے۔ یہ خبر ہارون کو ہوئی تو اس نے مجھے بلوا بھیجا اور مجھ سے کہنے لگا: صفوان! میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے اونٹ بیچ ڈالے ہیں۔
میں نے کہا: میں بوڑھا ہو گیا ہوں، میرے بیٹے اور دوسرے لوگ ان کی صحیح دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔
ہارون بولا: یہ بات نہیں، میں جانتا ہوں تمھیں کس شخص نے اس کا حکم دیا ہے، ہاں موسیٰؑ بن جعفرؑ نے تمھیں یہ حکم دیا ہے۔
میں نے کہا: میرا موسیٰؑ بن جعفرؑ سے کیا واسطہ؟
ہارون بولا: چھوڑو اس بات کو، واللہ تمھاری گذشتہ نیکیاں نہ ہوتیں تو میں تمھاری گردن اڑانے کا حکم دیتا۔[1]
۲۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

یا علی کفر باللہ العلی العظیم من ھذہ الامۃ عشرۃ ------- و بایع السلاح من اھل الحرب۔

اے علی! اس اُمت کے دس گروہ خدا کے منکر ہو گئے ہیں .... اور ایک وہ ہے جو اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ ہتھیار بیچتا ہے جبکہ وہ مسلمانوں سے حالت جنگ میں ہوں۔[2]

۳۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ۚ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۱۳۱، صفحہ ۱۳۲
[2] وسائل الشیعہ ج ۱۲ صفحہ ۱

Marfat.com

فِیْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

ترجمہ

۳۔ مُردار کا گوشت، خون، سؤر کا گوشت، وہ جانور جو غیر خدا کے نام پر ذبح ہوں، وہ جانور جن کا گلا گھونٹ دیا جائے اور تشدّد کر کے انھیں مار دیا جائے، وہ جانور جو بلندی سے گر کر مر جائیں، وہ جانور جو دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے مر جائیں اور درندہ جانور کے شکار کا باقی ماندہ مگر یہ کہ (بر موقع اس جانور کے پاس جا پہنچیں اور اسے ذبح کر لیں اور وہ جانور جو کسی بُت کے اوپر (یا اس کے سامنے) ذبح کیے جائیں (سب کے سب) تم پر حرام ہیں اور (اسی طرح) قسمت آزمائی کے لیے مخصوص تیر کی لکڑیوں سے جانور کا گوشت تقسیم کرنا۔ یہ تمام اعمال فسق اور گناہ ہیں۔ آج کے دن کفار تمھارے دین (کے زوال) سے مایوس ہو گئے ہیں لہٰذا ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے (میری مخالفت سے) ڈرو۔ آج کے روز میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمھارے لیے (ہمیشہ رہنے والے) دین کے طور پر قبول کر لیا لیکن وہ لوگ کہ بھوک کی حالت میں جن کا ہاتھ کسی اور کھانے تک نہ پہنچے اور وہ گناہ کی طرف مائل بھی نہ ہوں (تو ان کے لیے کوئی حرج نہیں کہ وہ ممنوع گوشت میں سے کھالیں) خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

اس سُورہ کی ابتداء میں چوپایوں کا گوشت حلال ہونے کا تذکرہ ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا تھا کہ اس سلسلے میں جن کے بارے میں استثناء ہے ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔ زیر بحث آیت میں دراصل وہی استثنائی حکم ہے جس کے بارے میں وعدہ کیا گیا تھا۔ اس میں گیارہ چیزوں کے حرام ہونے کا ذکر ہے ان میں سے بعض کے حرام ہونے کا حکم قرآن کی بعض دیگر آیات میں بھی آیا ہے یہاں ان کا تکرار تاکید کے طور پر ہے۔

۱۔ پہلے فرماتا ہے: مردار تم پر حرام کیا گیا ہے (حرمت علیکم المیتة)۔

۲۔ اسی طرح خون بھی حرام ہے (والدم)۔

۳۔ سؤر کا گوشت بھی حرام ہے (ولحم الخنزیر)۔

۴۔ اور وہ جانور جو زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق بتوں کے نام پر اور اصولی طور پر غیر خدا کے نام پر ذبح کیے جائیں،

Marfat.com

ان کا گوشت بھی حرام ہے (وما اھل لغیر اللہ بہ)۔

ان چار چیزوں کی تحریم اور اس کے فلسفہ کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اول میں ہم کافی بحث کر چکے ہیں (اردو ترجمہ ص ۴۱۴)۔

۵۔ نیز وہ جانور بھی کہ جن کا گلا گھونٹ دیا جائے، حرام ہیں، چاہے خود بخود ایسا ہو یا پھندے کے سبب ہو یا کوئی انسان ایسا کام انجام دے (جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ بعض اوقات کسی جانور کو دو لکڑیوں یا درخت کی دو شاخوں میں سختی سے دباتے تھے یہاں تک کہ وہ مرجاتا تھا اور پھر اس کا گوشت استعمال کرتے تھے) (والمنخنقۃ)۔

بعض روایات میں ہے کہ خاص طور پر مجوسی ایسا کرتے تھے کہ جانور کا گلا گھونٹ کر مارتے اس کے بعد اس کا گوشت کھاتے لہٰذا ممکن ہے کہ آیت کا ان کے اس طریقے کی طرف بھی اشارہ ہو۔[1]

۶۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو تشدد اور مار پیٹ سے مرجائیں یا بیماری کی وجہ سے مرجائیں (والموقوذۃ)۔[2]

تفسیر قرطبی میں ہے کہ عربوں میں رواج تھا کہ وہ بعض جانوروں کو بتوں کی خاطر اس قدر مارتے کہ وہ مرجاتے، اور وہ اسے ایک طرح کی عبادت سمجھتے تھے۔[3]

۷۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو بلندی سے گر کر مرجائیں (والمتردیۃ)۔

۸۔ نیز وہ جانور جو سینگ مارنے سے مرجائیں ان کا گوشت بھی حرام ہے (والنطیحۃ)۔

۹۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو درندوں کے حملے کی وجہ سے مرجائیں (وما اکل السبع)۔

ان آخر والے پانچ قسم کے جانوروں کے گوشت کی حرمت کا ایک فلسفہ ممکن ہے یہ ہو کہ ان سے کافی مقدار میں خون نہیں نکلتا۔ کیونکہ جب تک گردن کی اصلی رگیں نہ کاٹی جائیں اس وقت تک خون کی کافی مقدار نہیں نکلتی اور ہم جانتے ہیں کہ خون طرح طرح کے جراثیم کا مرکز ہوتا ہے اور جانور کے مرتے ہی سب سے پہلے خون میں بدبو پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے گوشت میں ایک طرح کا زہریلا پن زیادہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ذبح کرنے میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور قبلہ رُو ہو کر ذبح کیا جاتا ہے اس طرح سے جو معنوی پہلو پیدا ہوتا ہے وہ مذکورہ بالا صورتوں میں نہیں ہے۔

لیکن اگر جانور کے مرنے سے پہلے ان تک پہنچ جائیں اور آداب اسلامی کے مطابق اسے ذبح کریں اور اس کا خون کافی مقدار میں نکل آئے تو وہ حلال ہو جائے گا۔ اسی لیے مندرجہ بالا مواقع کی حرمت کے بعد فرمایا گیا ہے: (الا ما ذکیتم)۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ استثناء صرف آخری قسم یعنی " وما اکل السبع " کے بارے میں ہے۔ لیکن اکثر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ تمام قسموں کے بارے میں ہے اور یہی بات زیادہ قرین حقیقت ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ ۔ ج ۱۶ صفحہ ۲۷۲

[2] " موقوذۃ " کا مادہ ہے " وقذ " (بروزن " نقص ") یہ ایسی سخت مار پیٹ کے معنی میں ہے جو موت تک پہنچا دے یا سخت بیماری جو جانور کو موت کے کنارے لے جائے بعض اوقات ایسا تشدد اور ایسی بیماری کو بھی " وقذ " کہتے ہیں جو موت تک نہ پہنچائے بہر حال اس آیت میں پہلا معنی ہی مراد ہے۔

[3] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

ممکن ہے سوال کیا جائے کہ جب آیت کی ابتداء میں "میتۃ" کہہ دیا گیا ہے تو پھر ان مواقع کا ذکر کیوں کیا گیا ہے اور کیا یہ سب "میتۃ" کے مفہوم میں داخل نہیں ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فقہی اور شرعی لحاظ سے "میتۃ" کا ایک وسیع مفہوم ہے اس لحاظ سے جو بھی حیوان شرعی طریقے سے ذبح نہ ہو وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لیکن لغت میں عموماً "میتۃ" اس جانور کو کہتے ہیں جو خود بخود مر جائے اس لیے مندرجہ بالا مواقع "میتۃ" کے لغوی معنی میں داخل نہیں ہیں اور نہیں تو کم از کم اس کا احتمال ہے کہ داخل نہ ہوں۔ لہٰذا ان کی صراحت کی ضرورت تھی۔

۱۰۔ زمانہ جاہلیت میں بت پرستوں نے کچھ پتھر خانہ کعبہ کے گرد نصب کر رکھے تھے ان کی کوئی خاص شکل و صورت نہ تھی۔ انھیں "نصب" کہتے تھے۔ ان کے سامنے قربانی کرتے تھے اور قربانی کا خون ان پر مَل دیتے تھے ان کے اور دیگر بتوں کے درمیان فرق یہ تھا کہ دیگر بتوں کی کوئی مخصوص شکل ہوتی تھی لیکن "نصب" کی کوئی خاص صورت نہ ہوتی تھی۔ اسلام نے زیر نظر آیت میں ایسی قربانی کے گوشت کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے (وما ذبح علی النصب) واضح ہے کہ ایسے گوشت کی حرمت اخلاقی اور معنوی پہلو رکھتی ہے نہ کہ مادی اور جسمانی۔ درحقیقت یہ "وما اھل لغیر اللہ بہ" کی اقسام میں سے ہے۔

۱۱۔ جانوروں کی ایک اور طرح کی حرمت بھی زیر نظر آیت میں آئی ہے اور وہ ہے قسمت آزمائی کے طور پر ذبح ہونے والے جانور۔ ہوتا یہ تھا کہ دس آدمی آپس میں شرط لگاتے تھے اور ایک جانور خرید کر اسے ذبح کر دیتے تھے پھر تیر کی دس لکڑیاں جن میں سے سات پر "کامیاب" اور تین پر "ناکام" لکھا ہوتا تھا ایک مخصوص تھیلے میں رکھ دیتے تھے پھر قرعہ اندازی کی صورت میں ان دس آدمیوں میں سے ایک ایک کے نام پر ایک تیر باہر نکالتے جن سات لکڑیوں پر "کامیاب" لکھا ہوتا وہ جس جس کے نام نکلتیں اسے دے دیتے اور وہ گوشت کا ایک حصہ اٹھا لیتا اور اسے اس کے بدلے کچھ نہ دینا پڑتا۔ دوسری طرف وہ تین افراد جن کے نام "ناکام" والی لکڑیاں نکلتیں ان میں سے ہر ایک کے لیے لازمی ہوتا کہ وہ اس جانور کی ایک تہائی قیمت ادا کرے، جبکہ گوشت کا بھی اسے کوئی حصہ نہ ملتا۔ ان لکڑیوں کو "ازلام" کہتے ہیں۔ "ازلام" "زلم" (بروزن "قلم") کی جمع ہے۔ اسلام نے ایسے گوشت کا کھانا حرام قرار دے دیا۔ یہ حرمت اس بنا پر نہیں کہ اصل گوشت حرام ہے بلکہ اس لیے کہ یہ کام قماربازی اور قسمت آزمائی (لاٹری وغیرہ) کا پہلو لیے ہوئے ہے قرآن فرماتا ہے: وان تستقسموا بالازلام۔

واضح ہے کہ قماربازی وغیرہ کی حرمت جانوروں کے گوشت سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر جگہ اور ہر صورت میں قماربازی ممنوع ہے اور اس کے مفہوم میں تمام نقصان دہ امور، بے مقصد کام اور بیہودہ پروگرام شامل ہیں آخر میں ان احکام حرمت کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: یہ تمام احکام فسق ہیں اور اطاعت پروردگار کی حدود سے خارج ہیں (ذلکم فسق)[۱]

---

[۱] ذلکم اگرچہ اسم اشارہ مفرد ہے کہ جس میں خطاب جمع کے صیغے سے کیا گیا ہے اور قاعدۃً اسے مفرد کی طرف لوٹنا چاہیے لیکن ہم جانتے ہیں کہ مفرد اشارہ اس مجموعے کے لیے جو مفرد فرض کیا گیا ہو، کوئی اشکال نہیں رکھتا۔

Marfat.com

گوشت کے استعمال میں اعتدال

مندرجہ بالا تمام بحث سے اور دیگر اسلامی مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ گوشت سے استفادہ کے بارے میں اسلام کی روش اس کے دیگر احکام کی طرح اعتدال پر مبنی ہے۔ نہ زمانہ جاہلیت کی طرح ہے کہ وہ تو گوہ، مردار، خون وغیرہ سب کھا جاتے تھے، نہ آج کے بہت سے مغربی ممالک کی طرح ہے جہاں کے لوگ کیکڑا اور کیڑے مکوڑے تک کھانے سے نہیں کتراتے اور نہ ہی اسلام کا طریقہ ہندوؤں کا سا ہے جنھوں نے گوشت کھانا مطلقاً ممنوع قرار دے رکھا ہے بلکہ ان جانوروں کا گوشت کھانا حلال قرار دیا ہے جن کی غذا پاک ہے اور جو باعث تنفر نہیں ہیں اور افراط و تفریط کے راستے پر خط بطلان کھینچ دیا ہے اور مختلف قسم کا گوشت کھانے کے لیے شرائط معین کر دی ہیں جو اس طرح ہیں؛

۱۔ جن جانوروں کا گوشت استعمال کیا جاسکتا ہے انھیں گھاس خور ہونا چاہیے کیونکہ گوشت خور جانوروں کا گوشت مردار اور گندگی سے آلودہ گوشت کھانے کے نتیجے میں عموماً صحیح سالم نہیں رہتا اور طرح طرح کی بیماریوں کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس گھاس کھانے والے چوپائے عام طور پر صحیح اور پاک چیزوں سے استفادہ کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں جیسا کہ سورۂ بقرہ آیہ ۲، کی تفسیر میں کہا جا چکا ہے کہ ہر جانور کی صفات اس کے گوشت کے ذریعے اسے کھانے والے تک منتقل ہو جاتی ہیں۔

اس لیے درندوں کا گوشت کھانے سے انسان میں قساوت اور درندگی کی صفت کو تقویت پہنچے گی اسی لیے اسلام نے نجاست خور جانوروں کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

۲۔ وہ جانور جن کے گوشت سے استفادہ کیا جائے وہ قابل نفرت نہ ہوں۔

۳۔ ایسے جانور بھی نہ ہوں جو انسانی روح یا جسم کے لیے نقصان اور ضرر کا باعث ہوں۔

۴۔ ایسے جانور جو شرک اور بت پرستی وغیرہ کی راہ میں قربان کیے جائیں چونکہ وہ روحانی اور معنوی لحاظ سے ناپاک ہیں اس لیے انھیں حرام قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ اسلام میں کچھ احکام جانوروں کو ذبح کرنے کے طریقے کے بارے میں بھی ہیں۔ ان میں سے ہر حکم کے اپنے فوائد یا اخلاقی اثرات ہیں۔

-مندرجہ بالا احکام کے بعد زیر بحث آیت میں دو معنی خیز جملے نظر آتے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے: آج کے دن کافر تمھارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں لہٰذا اب ان سے نہ ڈرو اور صرف میری مخالفت سے ڈرو (الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون)۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: آج کے دن میں نے تمھارے دین اور آئین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمھارے دین کے طور پر قبول کر لیا (الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینًا)۔

Marfat.com

دین کس روز اپنے کمال کو پہنچا

یہاں ایک اہم بحث سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ " الیوم " (یعنی... آج کا دن) جس کا مندرجہ بالا آیت کے دو جملوں میں ذکر ہے، کون سا دن ہے؟ یعنی وہ کون سا دن ہے جس میں یہ چار پہلو جمع ہو گئے۔

۱۔ کفار اس روز مایوس ہو گئے
۲۔ دین اس دن مکمل ہو گیا۔
۳۔ نعمتِ الٰہی تمام ہو گئی اور
۴۔ خداوندِ عالم نے دینِ اسلام کو پورے عالم کے لوگوں کے لیے آخری دین کے طور پر قبول کر لیا۔

مفسرین میں اس سلسلے میں بہت اختلاف ہے لیکن جس بات میں کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے کہ ایسا دن پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں بہت اہم ہونا چاہیے اور یہ کہ یہ کوئی عام سا اور معمولی دن نہیں ہو سکتا کیونکہ اتنی اہمیت کسی عام دن کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کئی ایک روایات میں آیا ہے کہ بعض یہودیوں اور عیسائیوں نے یہ آیت سن کر کہا کہ ایسی آیت اگر ہماری آسمانی کتب میں ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن قرار دیتے [1]

ہمیں چاہیے کہ ہم قرائن، نشانیوں، آیت اور سورۃ کے نزول کی تاریخ، پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی کی تاریخ اور مختلف اسلامی منابع کی روایات سے اس اہم دن کو تلاش کریں۔ کیا اس سے مراد وہ دن ہے جس دن حلال و حرام گوشت کے بارے میں مندرجہ بالا احکام نازل ہوئے تھے، قطعاً ایسا نہیں ہے۔ ان احکام کا نزول اتنی اہمیت کا حامل نہیں ہے اور نہ ہی یہ تکمیل دین کا باعث ہے۔ یہ پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہونے والے آخری احکام بھی نہ تھے کیونکہ اس سورت کے آخر میں کچھ اور احکام بھی دکھائی دیتے ہیں اور پھر ان احکام کا نزول کفار کی ناامیدی کا سبب بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ بات جو کفار کی مایوسی کا سبب بن سکتی ہے، وہ اسلام کے مستقبل کے لیے کوئی محکم بنیاد اور سہارا ہونا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے احکام کا نزول کفار کے جذبات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا کہ ایک طرح کا گوشت حرام ہو اور دوسری طرح کا حلال۔ اس سے ان میں کوئی خاص حساسیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

کیا اس سے مراد پیغمبر اکرمؐ کے حجۃ الوداع کے عرفہ کا دن ہے (جیسا کہ مفسرین کے ایک گروہ نے احتمال بھی ظاہر کیا ہے)؟

اس سوال کا جواب بھی نفی میں ہے کیونکہ مذکورہ بالا نشانیاں اس دن پر بھی منطبق نہیں ہو سکتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دن کوئی واقعہ نمودار نہیں ہوا کہ جو کفار کی مایوسی کا باعث ہو سکے۔ اگر اس سے مراد مسلمانوں کا عظیم اجتماع ہے تو وہ روزِ عرفہ سے پہلے بھی مکہ میں خدمتِ پیغمبرؐ میں تھا اور اگر اس دن مذکورہ بالا احکام کا نزول مراد ہے تو بھی جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، کفار کے لیے کوئی گھبرانے والی بات نہ تھی۔

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۱۵۵

Marfat.com

تو کیا اس سے فتح مکہ کا دن مراد ہے (جیسا کہ بعض کا خیال ہے)، جب کہ اس سورہ کے نزول کا زمانہ فتح مکہ سے بہت ہی بعد کا ہے۔

یا کیا سورۂ برأت کی آیات کے نزول کا دن ہے؟ تو وہ بھی اس سورہ کے نزول سے کافی مدت پہلے تھا۔

سب سے زیادہ عجیب احتمال یہ ہے جو بعض نے ظاہر کیا ہے کہ اس دن سے مراد ظہور اسلام یا بعثتِ پیغمبرؐ کا دن ہے، جبکہ ان دونوں کا اس آیہ کے نزول کے دن سے کوئی ربط نہیں ہے اور ان کے درمیان ایک طویل مدت حائل ہے۔

لہٰذا مذکورہ بالا چھ احتمالات میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو آیت سے آہنگ اور مفہوم سے مناسبت رکھتا ہو۔

اس آیت کے سلسلے میں ایک اور احتمال بھی ہے جو تمام شیعہ مفسرین نے اپنی کتب میں پیش کیا ہے، متعدد روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ نیز آیت کے مضامین اور آہنگ بھی اس سے مناسبت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے مراد غدیر خم کا دن ہے، جس روز پیغمبر اسلامؐ نے امیر المومنین حضرت علیؑ کو باقاعدہ اپنی جانشینی کے لیے مقرر کیا تھا۔ یہی وہ روز تھا جب کفار مایوسیوں کے سمندر میں ڈوب گئے، کیونکہ انھیں توقع تھی کہ دین اسلام کا قیام بس ایک شخص سے مربوط ہے اور پیغمبر اسلامؐ کے بعد صورتِ حال پھر پرانی ڈگر پر لوٹ آئے گی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ایک ایسا شخص پیغمبرؐ کی جانشینی کے لیے منتخب ہوا ہے جو علم و تقویٰ اور قدرت و عدالت کے لحاظ سے پیغمبر اسلامؐ کے بعد بے نظیر ہے اور آنحضرتؐ نے لوگوں سے اس کی بیعت لے لی ہے تو وہ اسلام کے بارے میں یاس و ناامیدی کا شکار ہو گئے، وہ سمجھ گئے کہ اس دین کی جڑیں مضبوط اور پائیدار ہیں۔ یہ وہ دن تھا جب دین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا، کیونکہ جانشینِ پیغمبرؐ کے تعین اور مسلمانوں کا مستقبل واضح ہوئے بغیر یہ آخری تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

یہ وہ دن تھا جب نعمتِ الٰہی علیؑ جیسے لائق رہبر کے تعین کے ذریعے لوگوں کے مستقبل کے لیے تمام ہو گئی۔ اسی دن اسلام اپنے پروگرام کی تکمیل کے ذریعے آخری دین کے طور پر خدا کی طرف سے پسندیدہ قرار پایا۔

لہٰذا اس میں چاروں مذکورہ پہلو موجود تھے۔

علاوہ ازیں ذیل کے قرائن بھی اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

۱۔ تفسیر فخر الدین رازی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر المنار میں اس آیت کے ذیل میں منقول ہے، کہ اس آیت کے نزول کے بعد پیغمبر اکرمؐ اکیاسی دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ روایات اہلسنت کے مطابق اور حتیٰ کہ بعض شیعہ روایات کی بناء پر (جیسا کہ کلینی نے اپنی مشہور کتاب کافی میں نقل کیا ہے) رسولِ اکرمؐ کی وفات بارہ ربیع الاوّل کو ہوئی تھی ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زیر نظر آیت کے نزول کا دن ٹھیک اٹھارہ ذی الحجہ ہے[1]

---

[1] البتہ یہ اس صورت میں ہے جب خود روزِ وفاتِ پیغمبرؐ اور روزِ غدیر کو شمار نہ کیا جائے۔ نیز تین مہینوں میں یکے بعد دیگرے ہر مہینہ ۲۹ دن کا ہو اور ایسا ہونا بالکل ممکن ہے نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ روزِ غدیر سے پہلے اور بعد تاریخ اسلام میں کوئی ایسا اہم واقعہ رونما نہیں ہوا جس پر مندرجہ بالا تاریخ منطبق ہو سکے۔ اس لیے حتماً غدیر کے علاوہ اس سے کوئی اور دن مراد نہیں۔

Marfat.com

ب۔ بہت سی روایات جو مشہور شیعہ سنی طرق سے منقول ہیں صریحاً یہ مطلب برآمد ہوتا ہے کہ زیر بحث آیہ شریفہ غدیر خم کے روز اور ولایت حضرت علیؑ کے اعلان کے بعد نازل ہوئی ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ مشہور سنی عالم ابن جریر طبری کتاب ولایت میں معروف صحابی زید بن ارقم کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت غدیر خم کے دن حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی۔

۲۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی اپنی کتاب "ما نزل من القرآن فی علیؑ" میں مشہور صحابی ابو سعید خدری سے نقل کرتے ہیں:۔

پیغمبر خداؐ نے غدیر خم کے دن لوگوں سے حضرت علیؑ کا تعارف، ان کی ولایت کے حوالے سے کروایا اور لوگ ابھی منتشر نہیں ہوئے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی:

الیوم اکملت لکم دینکم ۔۔۔۔۔

اس موقع پر رسول اللہؐ نے فرمایا:

اللہ اکبر علی اکمال الدین و اتمام النعمۃ و رضی الرب برسالتی و بالولایۃ لعلی (ع) من بعدی، ثم قال: من کنت مولاہ فعلی مولاہ، اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ۔

یعنی ــــــ اللہ اکبر ــــــ دین کی تکمیل پر اور نعمت تمام ہونے پر اور پروردگار کے میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت پر راضی اور خوش ہونے پر۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

جس شخص کا میں مولا ہوں، اس کا علیؑ مولا ہے، خدایا! اسے دوست رکھ۔ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی کرے۔ جو اس کی مدد کرے اس کی مدد کر اور جو اسے چھوڑ دے تو بھی اسے چھوڑ دے۔

۳۔ خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں ابوہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں وہ پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں:

واقعہ غدیر خم، ولایت علیؑ کے عہد و پیمان اور عمر کے "بخ بخ یا بن ابی طالب اصبحت مولای و مولا کل مسلم"[1] کہنے کے بعد آیہ الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہوئی[2]

---

[1] حضرت عمر کی اس بات کا مطلب ہے: کیا کہنے اے فرزند ابو طالب! آپ میرے اور ہر مسلمان کے مولا ہو گئے۔

[2] ان تین روایات کو علامہ امینی مرحوم نے تمام خصوصیات کے ساتھ "الغدیر" کی جلد اول میں ص ۲۳۰ تا ۲۳۲ میں نقل کیا ہے اور کتاب الحق ج ۶ ص ۳۵۲ میں اس آیت کا واقعہ غدیر میں نازل ہونا ابوھریرہ سے دو طرق کے ساتھ اور ابو سعید خدری سے کئی طرق سے نقل کیا گیا ہے۔

Marfat.com

کتاب نفیس الغدیر میں مذکورہ تین روایات کے علاوہ اس سلسلے میں مزید تیرہ روایات نقل کی گئی ہیں۔
کتاب احقاق الحق میں تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۱۴ اور مقتل خوارزمی صفحہ ۴۷ کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ یہ آیت واقعہ غدیر کے بارے میں نازل ہوئی۔
تفسیر برہان اور تفسیر نورالثقلین میں بھی مختلف طرق سے اس سلسلے میں دس روایات نقل ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں یا غدیر خم کے دن کے بارے میں نازل ہوئی۔
ان سب روایات کو نقل کرنے کے لیے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔[1]
علامہ سید شرف الدین مرحوم کتاب المراجعات میں لکھتے ہیں:

امام صادقؑ اور امام باقرؑ سے منقول صحیح روایات میں مذکور ہے کہ یہ آیت غدیر کے دن نازل ہوئی اہل سنت نے بھی رسول اللہؐ سے اس سلسلے میں مختلف اسناد سے چھ روایات نقل کی ہیں جو اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ یہ آیت اس واقعہ کے ضمن میں نازل ہوئی۔[2]

جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زیر نظر آیت کے واقعہ غدیر کے سلسلے میں نازل ہونے کے بارے میں موجود روایات ایسی نہیں ہیں کہ انھیں خبر واحد کہا جا سکے اور ان کی بعض اسناد کو ضعیف قرار دے کر ان سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ اگر یہ روایات متواترہ نہ ہوں تو کم از کم مستفیض ہیں اور مشہور اسلامی منابع اور کتب میں منقول ہیں۔ اگرچہ بعض متعصب سنی حضرات چونکہ ان روایات کو اپنے ذوق کے خلاف پاتے ہیں لہٰذا انھیں مجہول اور غلط قرار دیتے ہیں۔ مثلاً آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں صرف ایک سند کو ضعیف قرار دے کر کوشش کی ہے کہ باقی روایات کو بھی نظر انداز کر دے یا مثلاً تفسیر المنار کے مؤلف آیت کی ایک عام تفسیر کر کے آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے ان روایات کی طرف ذرا سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ شاید وہ اس مخمصے میں تھے کہ اگر روایات کا ذکر کر کے انھیں ضعیف قرار دیں تو خلاف انصاف ہوگا اور اگر قبول کر لیں تو خلاف ذوق ہوگا۔
ایک جالب نظر نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ قرآن حکیم سورۂ نور آیہ ۵۵ میں کہتا ہے۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا۔

تم میں سے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے اعمال صالح انجام دیئے ہیں خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں روئے زمین پر خلیفہ بنا دے گا۔ جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اس نے خلیفہ بنایا ہے (نیز یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ) جس دین کو ان کے لیے پسند کیا ہے اسے محکم و مستقر کریگا

---

[1] تفسیر برہان جلد اول اور تفسیر نورالثقلین جلد اول میں زیر بحث آیت کے ذیل میں رجوع کریں۔
[2] المراجعات جلد چہارم صفحہ ۳۰

Marfat.com

اور خوف کے بعد انھیں امن دے گا۔

اس آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو دین ان کے لیے "پسند" کیا ہے اسے روئے زمین پر مستقر اور محکم کرے گا۔ یہ بات پیش نظر رکھتے ہوئے کہ سورہ نور، سورۂ مائدہ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور " رضیت " " لکم الاسلام دینا " کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیر بحث آیت میں ولایتِ علی کے بارے میں نازل ہوا ہے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام اس صورت میں روئے زمین پر مستحکم ہو سکتا ہے جب " ولایت " کے ساتھ منسلک اور توام ہو۔ کیونکہ یہ وہی اسلام ہے جسے خدا نے " پسند " کیا ہے اور اس کے استقرار و استحکام کا وعدہ کیا ہے۔ واضح تر الفاظ میں اسلام اسی صورت میں عالمگیر ہو سکتا ہے جب وہ ولایت اہل بیت ؑ کے مسئلے سے جدا نہ ہو۔

سورۂ نور کی مذکورہ آیت اور زیر بحث آیت کو منضم کرنے سے جو دوسرا مطلب سامنے آتا ہے یہ ہے کہ سورۂ نور کی آیت میں باایمان افراد سے تین وعدے کیے گئے ہیں۔

پہلا۔ روئے زمین پر خلافت

دوسرا۔ عبادت پروردگار کے لیے امن وامان اور

تیسرا۔ اس دین کا استحکام کہ جو خدا کا پسندیدہ ہے۔

یہ تین وعدے غدیر خم کے روز آیہ ــــ الیوم اکملت لکم دینکم ــــ کے نزول کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچے، کیونکہ ایمان و عمل صالح کا کامل نمونہ یعنی ــــ علی ؑ، رسول اللہ کی جانشینی کے لیے منصوب اور مقرر ہوئے اور " الیوم یئس الذین کفروا من دینکم " کے ذریعے مسلمانوں کو نسبتاً امن نصیب ہوا نیز " و رضیت لکم الاسلام دینا " کے ذریعے پروردگار کا پسندیدہ دین مسلمانوں میں مستحکم ہوا۔

البتہ یہ تفسیر ان روایات کے منافی نہیں جن میں کہا گیا ہے کہ سورۂ نور کی یہ آیت حضرت مہدی ؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے کیونکہ " اٰمنوا منکم " کا ایک وسیع مفہوم ہے جس کا ایک نمونہ غدیر خم کے دن انجام پایا اور پھر ایک وسیع تر سطح پر حضرت مہدی ؑ کے قیام کے وقت انجام پائے گا۔ اس بنا پر " الارض " آیت میں تمام کرۂ زمین کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا بھی ایک عمومی مفہوم ہے۔ یعنی تمام زمین کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ایک حصے کے لیے بھی، جیسا کہ قرآن میں مختلف مواقع پر اس لفظ کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات یہ زمین کے ایک حصے کے لیے ہے اور بعض اوقات پورے کرۂ ارض کے لیے (غور کیجیے گا)۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

آیت کے سلسلے میں صرف ایک سوال اب باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اوّل تو مذکورہ بالا اسناد اور آیہ " یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک " کے ذیل میں پیش کی جانے والی اسناد کے مطابق دونوں آیات واقعہ غدیر سے مربوط ہیں تو پھر ان دونوں کے درمیان فاصلہ کیوں رکھا گیا ہے۔ ایک سورہ مائدہ کی تیسری آیت ہے اور دوسری آیت کا نمبر ۶۷ ہے۔

Marfat.com

دوسری بات یہ ہے کہ آیت کا یہ حصّہ جو واقعہ غدیر سے مربوط ہے، ایسے مطالب سے منسلک کیا گیا ہے جو حلال و حرام گوشت کے بارے میں ہیں اور ان دونوں کے درمیان کوئی مناسبت نظر نہیں آتی [1]

اس کا جواب یہ ہے:

اوّلاً۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآنی آیتیں اور اسی طرح سورتیں تاریخِ نزول کے مطابق جمع نہیں کی گئیں بلکہ مدینہ میں نازل ہونے والی بہت سی سورتوں میں مکی آیات ہیں اور اس کے برعکس مکی سورتوں میں مدنی آیتیں موجود ہیں۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان دو آیات کا ایک دوسرے سے الگ ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے (البتہ ہر سورت کی آیات کو فرمانِ پیغمبرؐ کے تحت رکھا گیا ہے) ہاں البتہ آیات اگر تاریخ نزول کے مطابق جمع کی گئی ہوتیں پھر یہ فاصلہ ہوتا تو اعتراض کیا جا سکتا تھا۔

ثانیاً۔ ممکن ہے کہ غدیر سے مربوط آیت کو حلال و حرام غذاؤں سے متعلق آیت میں تحریف، حذف اور تغیر سے محفوظ رکھنے کے لیے ہو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نفیس چیز کو محفوظ رکھنے کیلیے عام سی چیزوں میں ملا دیا جاتا ہے تاکہ اس کی طرف کم توجہ ہو (غور کیجیے گا)۔

وہ حوادث جو رسول اللہؐ کی زندگی کے آخری لمحات میں رونما ہوئے اور بعض افراد نے آپ کی طرف سے وصیت نامہ لکھے جانے کی صریح مخالفت کی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ (نعوذ باللہ) حتیٰ کہ رسولِ خداؐ کے بارے میں کہا گیا کہ انھیں ہذیان ہو گیا ہے۔ اور وہ یہ سب باتیں بیماری کے عالم میں کر رہے ہیں۔ رسول اللہؐ کو ایسی ایسی ناموزوں تہمتیں لگائی گئیں۔ اس واقعے کی تفصیل اسلامی دنیا کی مشہور کتب میں موجود ہے اور سنی شیعہ دونوں کی اہم کتب میں یہ واقعہ مذکور ہے [2]۔ یہ واقعہ اس سلسلے میں شاہد ناطق ہے کہ بعض لوگ مسئلہ خلافت اور رسول اللہؐ کی جانشینی کے معاملے میں بہت حسّاس تھے اور وہ اس کے انکار کے لیے ہر انتہائی قدم اٹھانے کو تیار تھے۔

تو کیا ایسے حالات میں ضروری نہیں تھا کہ خلافت سے مربوط اسناد کی حفاظت کی جاتی اور انھیں آنے والے لوگوں تک بحفاظت پہنچانے کا احتمال کیا جاتا اور اسے عام مطالب کے ساتھ ملا کر بیان کیا جاتا تاکہ زیادہ سخت مخالفین کی ان پر کم توجہ ہو۔

علاوہ ازیں جیسا کہ ہم جان چکے ہیں کہ اس بات سے متعلق کہ "الیوم اکملت لکم دینکم" کے غدیر اور پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی کے متعلق نزول سے مربوط اسناد صرف شیعہ کتب میں موجود نہیں ہیں کہ ان پر کوئی اعتراض ہو بلکہ اہلِ سنت کی بہت سی کتب میں بھی یہ روایات موجود ہیں۔ ان میں یہ حدیث مختلف طرق سے تین مشہور صحابہ سے بھی منقول ہے۔

---

[1] یہ سوال تفسیر المنار میں اس آیت سے مربوط مباحث میں اشارتاً مذکور ہے (جلد ۶ صفحہ ۴۶۶)

[2] یہ حدیث اہلِ سنت کی مشہور ترین کتاب صحیح بخاری میں کئی مقامات پر نقل ہوئی ہے ان میں سے کتاب المرضیٰ جزو ۴ میں، کتاب العلم جزو اوّل صفحہ ۲۲ پر، کتاب الجہاد، باب جوائز وفدس صفحہ ۱۱۸ جزء ۲ میں بھی موجود ہے۔

اسی طرح یہ روایت کتاب صحیح مسلم جزء ۲ میں آخری وصیتوں کے زیر عنوان صفحہ ۱۴ پر موجود ہے۔

علاوہ ازیں دیگر کتب میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ سید شرف الدین مرحوم نے المراجعات میں "رزیہ یوم الخمیس" کے زیر عنوان یہ روایات نقل کی ہیں۔

Marfat.com

اضطراری کیفیّت میں حرام گوشت کا حکم

آیت کے آخر میں پھر حرام گوشت سے مربوط مسائل کا ذکر ہے یہاں اضطراری صورت کے لیے حکم بیان کیا گیا ہے: اور جو لوگ بھوک کی حالت میں حرام گوشت کھانے پر مجبور ہوجائیں جبکہ وہ گناہ کی طرف رغبت نہ رکھتے ہوں تو پھر یہ ان کے لیے حلال ہے کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے اور ضرورت کے وقت وہ اپنے بندوں کو مشقت میں نہیں ڈالتا اور نہ انھیں اس پر سزا دیتا ہے (فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لاثم فان الله غفور رحیم)۔

"مخمصة" کا مادہ "خمص" (بروزن "لمس") ہے جس کا معنی ہے دھنس جانا۔ یہ لفظ سخت بھوک کیلیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ بھوک شکم کے دھنس جانے کا باعث ہوجاتا ہے قحط کے زمانے میں ہو یا کوئی انفرادی طور پر اس مشکل صورتِ حال سے دوچار ہوجائے۔

"غیر متجانف لاثم" ___ کا معنی ہے "گناہ کی طرف میلان یا رغبت نہ رکھتا ہو" یہ اضطرار کے مفہوم کی تاکید کے طور پر آیا ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ ضرورت کے وقت حرام گوشت کھانے میں تیزی نہ دکھائے اور اسے حلال نہ سمجھنے لگے یا یہ کہ اضطرار کی بنیاد اس نے خود فراہم نہ کی ہو اور یا یہ کہ کسی ایسے سفر میں اس مشکل سے دوچار نہ ہوا ہو، جو اس نے فعل حرام انجام دینے کے لیے اختیار کیا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ اس عبارت سے یہ تمام معانی مراد ہوں۔

اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول صفحہ ۴۱۲ و صفحہ ۴۱۴ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۴۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

ترجمہ

۴۔ تم سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کون سی چیزیں حلال کی گئی ہیں، کہہ دو کہ پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں، نیز ان شکاری جانوروں کا شکار (بھی تمھارے لیے حلال ہے) جنھیں تم نے وہ کچھ سکھایا جس کی خدا نے تمھیں تعلیم دی تھی۔ بس جو کچھ یہ جانور تمھارے لیے (شکار کرتے ہیں اور) روک رکھتے ہیں وہ کھالو اور (جب جانور کو شکار کے لیے چھوڑو تو) اس پر خدا کا نام لیا کرو اور خدا سے ڈرو کیونکہ خدا جلد حساب لینے والا ہے۔

Marfat.com

شانِ نزول

اس آیت کے بارے میں کئی ایک شانِ نزول ذکر کی گئی ہیں ان میں سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ زید الخیر اور عدی بن حاتم جو صحابیٔ رسولؐ تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہم کچھ لوگ ہیں جو شکاری کتوں اور بازوں کی مدد سے شکار کرتے ہیں، اور ہمارے شکاری کتے حلال جنگلی جانوروں کو پکڑ لیتے ہیں ان میں سے بعض تو زندہ ہمارے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور ہم انھیں ذبح کر لیتے ہیں لیکن ان میں سے بعض کتوں کی وجہ سے مارے جاتے ہیں اور ہمیں انھیں ذبح کرنے کا موقع نہیں ملتا ہم جانتے ہیں کہ خدا نے مردار کا گوشت حرام قرار دیا ہے اب ہماری کیا ذمہ داری ہے؟

اسی سلسلے میں زیرِ نظر آیت نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا گیا[1]

تفسیر

حلال شکار

گذشتہ دو آیات میں حرام و حلال گوشت کے بارے میں احکام بیان ہو چکے ہیں یہاں ان میں سے کچھ مزید احکام کا تذکرہ ہے اس سلسلے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے، تم سے کھانے والی چیزوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں (یسئلونک ماذا احل لھم) پھر پیغمبر اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے: پہلے تو ان سے کہو کہ ہر پاکیزہ چیز تمھارے لیے حلال ہے (قل احل لکم الطیبات) یعنی اسلام نے جو کچھ حرام قرار دیا ہے وہ ناپاک ہے اور خبائث کے زمرے میں آتا ہے اور قوانینِ الٰہی کسی ایسی چیز کو کبھی حرام قرار نہیں دیتے جو پاکیزہ ہو اور فطری طور پر نوعِ بشر کے فائدے اور نفع کے لیے پیدا کی گئی ہو لہٰذا حقیقی شریعت قوانینِ تکوین سے ہمیشہ ہم آہنگ ہوتی ہے۔

پھر شکار کے بارے میں فرمایا گیا ہے: تمھارے سدھائے ہوئے یعنی جنھیں تم نے وہ کچھ سکھایا ہے جس کی خدا نے تعلیم دی ہے ان شکاری جانوروں کا شکار تمھارے لیے حلال ہے (و ما علمتم من الجوارح مکلبین تعلمونھن مما علمکم اللہ)[2]

"جوارح" اصل میں "جرح" سے لیا گیا ہے جو کبھی "کسب" اور "کام" کے معنی میں آتا ہے اور کبھی "زخم" کے معنی میں۔ اسی لیے شکاری جانوروں کو چاہے وہ پرندے ہوں یا کوئی اور جانور "جارحہ" کہتے ہیں "جارحہ" کی جمع "جوارح" ہے۔ یعنی وہ جانور جو اپنے شکار کو زخم لگاتے ہیں یا وہ جانور جو اپنے مالک کے لیے کسب کرتے ہیں۔

بدن کے اعضاء کو بھی جوارح اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان ان کے ذریعے کسی کام کو انجام دیتا ہے اور اکتساب کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۳، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] اس جملے کی ابتداء میں حذف و تقدیر موجود ہے "فکلوا مما امسکن علیکم" سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں "وصید ما علمتم" ہے (غور کیجیے گا)۔

Marfat.com

اس لیے " وما علمتم من الجوارح " ان تمام جانوروں کے لیے ہے جنھیں شکار کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ لیکن ساتھ "مکلبین" بھی ہے جو "کلب" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "کتا"۔ "مکلبین" شکاری کتوں کی تربیت کرنے والوں کو کہتے ہیں۔ اس طرح یہ تعبیر جملے کو شکاری کتوں سے مخصوص کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ آیت شکاری کتوں کے علاوہ باز وغیرہ سے کیے گئے شکار کے بارے میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ فقہ میں صرف شکاری کتوں سے کیا جانیوالا شکار جائز ہے، اگرچہ اہل سنت کے بعض مفسرین سب کو جائز سمجھتے ہیں اور "مکلبین" کا مفہوم وسیع قرار دیتے ہیں کہ جو کتوں سے شکار کرنے والوں کے لیے مخصوص نہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اس لفظ کا اصلی مادہ اسے شکاری کتوں کی تربیت سے مخصوص کر دیتا ہے۔ البتہ اگر دوسرے شکاری جانور کسی شکار کو بے بس کر دیں لیکن اسے مرنے سے پہلے آدابِ شرعی کے مطابق ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہے۔

تعلّمونھن مما علّمکم اللہ میں چند نکات

۱۔ ایسے جانوروں کی تعلیم و تربیت مستقل اور مسلسل ہو، اگر وہ اپنی تعلیم بھول جائیں اور آوارہ کتوں کی طرح کسی جانور کو چیر پھاڑ دیں تو اس شکار کا گوشت حلال نہیں ہوگا کیونکہ "تعلمونھن" فعل مضارع ہے اور مضارع استمرار پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ کتے کی تعلیم و تربیت صحیح اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے یہ بات " مما علمکم اللہ " کے مفہوم سے مطابقت رکھتی ہے۔

۳۔ تمام علوم کا سرچشمہ خدا ہے چاہے وہ عام اور چھوٹے چھوٹے امور کا علم ہو یا اہم اسکی تعلیم کے بغیر ہم کوئی علم نہیں رکھتے۔
ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ شکاری کتوں کی تعلیم سے مراد یہ ہے کہ ان کی تربیت اس طرح سے ہونی چاہیے کہ وہ مالکوں کے حکم سے چل پڑیں اور ان کے روکنے سے رک جائیں۔
اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جس جانور کو کتے شکار کرتے ہیں اگر وہ زندہ ہاتھ آجائے تو اسے آدابِ اسلامی کے مطابق ذبح کیا جانا چاہیے، لیکن شکاری کے پہنچنے سے پہلے اس کی جان نکل جائے تو وہ حلال ہے اگرچہ اسے ذبح نہیں بھی کیا گیا۔
اس کے بعد ایسے شکار کی حلیت کی شرائط میں سے دو کا ذکر کیا گیا ہے: اس شکار کو جسے شکاری کتے تمھارے لیے روکے رکھیں، کھالو (فکلوا مما امسکن علیکم) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر شکاری کتے اس بات کے عادی ہوں کہ اپنے شکار کا کچھ حصہ کھا لیتے ہیں اور کچھ چھوڑ دیتے ہوں تو ایسا شکار حلال نہیں ہے اور وہ " وما اکل السبع " کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے جس کا گذشتہ آیت میں ذکر ہے۔ حقیقت میں ایسا کتا نہ تو تعلیم یافتہ ہے اور نہ اس سے جو کچھ بچا رکھا ہے وہ "علیکم" (تمھارے لیے) کا مصداق ہے۔
بعض فقہا اس شرط کے قائل نہیں ہیں وہ اس سلسلے میں چند روایات سے استناد کرتے ہیں جو کتب احادیث میں موجود ہیں بہرحال اس پر تفصیلی بحث فقہی کتب میں موجود ہے۔
خلاصہ یہ کہ ان کی ایسے تربیت ہونا چاہیے کہ وہ اپنا شکار کھائیں نہیں۔

Marfat.com

دوسری شرط یہ ہے کہ جب شکاری کتے کو چھوڑا جائے تو خدا کا نام لیا جائے (واذکروا اسم اللّٰہ علیہ)
آخر میں ان تمام احکام کا احترام کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے، خدا سے ڈرو کیونکہ وہ سریع الحساب ہے (واتقوا اللّٰہ ان اللّٰہ سریع الحساب)[1]

۵۔ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۵۔ آج کے دن پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال ہوگئی ہیں اور (اسی طرح) اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے نیز مسلمانوں میں پاک دامن عورتیں اور اہلِ کتاب میں سے پاک دامن عورتیں حلال ہیں جبکہ ان کا حق مہر ادا کردو اور پاک دامن رہو نیز پوشیدہ طور پر اور غیر شرعی طریقے سے یاری نہ لگاؤ، اور جو شخص اس چیز سے کفر اختیار کرے کہ جس پر ایمان لانا چاہیئے اس کے اعمال باطل اور بے اثر ہو جاتے ہیں اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا۔

تفسیر

اہلِ کتاب کا کھانا کھانا اور ان میں شادی بیاہ کرنا

یہ آیت گذشتہ آیات کے مباحث کی تکمیل کرتی ہے، پہلے فرمایا: آج کے دن سے پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال ہوگئی

---

[1] سریع الحساب (جلدی حساب لینے والا) کی تشریح تفسیر نمونہ جلد دوم صفحہ ۴۳ (اردو ترجمہ) پر گذر چکی ہے۔

Marfat.com

ہیں اور اہل کتاب کے کھانے تمہارے لیے اور تمہارے کھانے ان کے لیے حلال ہیں (الیوم احل لکم الطیبت وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم و طعامکم حل لھم)۔

یہاں چند مطالب توجہ طلب ہیں۔

۱۔ "الیوم" (آج کا دن) سے مراد بعض مفسرین کے مطابق عرفہ کا دن ہے اور بعض اسے فتح خیبر کا دن کہتے ہیں لیکن بعید نہیں کہ یہ یوم غدیر ہو کہ جب اسلام کو کفار پر مکمل کامیابی حاصل ہوئی تھی (اس بات کی وضاحت ہم عنقریب کریں گے)۔

۲۔ طیبات تو اس دن سے پہلے بھی حلال تھے یہاں ان کی حلّت کا ذکر اہلِ کتاب کے کھانے کے بارے میں آنیوالے حکم کی تمہید کے طور پر ہے۔

۳۔ اہلِ کتاب کا طعام جسے آیت میں حلال قرار دیا گیا ہے اس سے کیا مراد ہے ؟ اس سلسلے میں زیادہ تر مفسرین اور علماءِ اہلِ سنت کا نظریہ یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کا کھانا شامل ہے، چاہے ان جانوروں کا گوشت ہو جو ان کے ہاتھ سے ذبح ہوئے ہوں۔ یا اس کے علاوہ کچھ ہو۔ لیکن شیعہ فقہاء اور مفسرین کی قطعی اکثریت کا یہ نظریہ ہے کہ اس سے مراد ان کے ہاتھوں ذبح شدہ جانوروں کے گوشت کے علاوہ ہے چند شیعہ علماء پہلے نظریہ کے پیرو ہیں۔

ائمہ اہلِ بیتؑ سے منقول متعدد روایات بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہیں کہ آیت میں طعام سے مراد اہلِ کتاب کے ذبیحہ کے علاوہ ہے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں امام صادق علیہ السلام سے زیرِ نظر آیت کے بارے میں منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

"عنی بطعامھم ھٰھنا الحبوب والفاکھة غیر الذبائح التی یذبحون فانھم لا یذکرون اسم اللّٰہ علیھا"

اہلِ کتاب کے طعام سے مراد دانے اور میوے ہیں نہ کہ ان کے ذبح کیے ہوئے جانور۔ کیونکہ وہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتے۔[۱]

دوسری متعدد روایات جو وسائل الشیعہ جلد ۱۶ ابواب اطعمہ و اشربہ کے باب ۵۱ صفحہ ۲۷۱ پر مذکور ہیں نیز گذشتہ آیات میں دقت نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب کے ذبح شدہ جانوروں کے علاوہ ان سے کھانا پینا حقیقت کے زیادہ نزدیک ہے، کیونکہ جیسا کہ امام صادق علیہ السلام نے مذکورہ روایت میں نشاندہی فرمائی ہے کہ اہلِ کتاب ذبح کرنے میں زیادہ تر اسلامی شرائط کو ملحوظ نہیں رکھتے نہ وہ خدا کا نام لیتے ہیں اور نہ جانور کو رو بقبلہ ذبح کرتے ہیں، اسی لیے باقی شرائط بھی پوری نہیں کرتے تو کیسے ممکن ہے کہ گذشتہ آیات میں تو ایسا جانور صریحاً حرام قرار دیا گیا ہو اور اس آیت میں اسے حلال شمار کر لیا گیا ہو۔

یہاں چند سوالات سامنے آتے ہیں :

پہلا سوال : اگر طعام سے مراد گوشت کے علاوہ دوسرے کھانے ہیں تو وہ تو پہلے بھی حلال تھے کیا اس آیت کے نزول سے

---

[۱] وسائل الشیعہ، جلد ۱۶ صفحہ ۲۹۱

Marfat.com

قبل گندم اور ایسی دیگر اجناس اہلِ کتاب سے خریدنا ممنوع تھا، حالانکہ مسلمانوں اور ان کے درمیان ہمیشہ کاروبار رہتا تھا۔

آیت کی تفسیر میں ایک بنیادی نقطے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب اسلام پورے جزیرۂ عرب پر غالب آچکا تھا۔ اور پورے جزیرۂ عرب میں اس کا وجود مسلّم ہوچکا تھا اب دشمنانِ اسلام مسلمانوں کو شکست دینے سے مایوس ہوچکے تھے اس موقع پر ان حد بندیوں کو برطرف کیا جانا چاہیے تھا جو پہلے کفار سے مسلمانوں کی معاشرت کے بارے میں تھیں، پہلے ان کے ہاں آنا جانا، انھیں مہمان بلانا، ان کے ہاں بطور مہمان جانا ممنوع تھا۔ لہٰذا اس آیت نے بتایا کہ اب کے بعد جبکہ تم اپنی حیثیت اور مقام منوا چکے ہو اور ان سے تھیں کوئی خطرہ نہیں رہا ان سے معاشرتی حد بندیوں میں کمی کر دی گئی ہے لہٰذا اب تم ان کے مہمان بن سکتے ہو اور انھیں بھی اپنے ہاں دعوت دے سکتے ہو اسی طرح ان میں شادی بھی کر سکتے ہو (لیکن ان سب امور کی اپنی اپنی شرائط ہیں جن کی طرف اشارہ کیا جائے گا)۔

یہ بات بغیر کہے نہ رہ جائے کہ جو لوگ اہل کتاب کو پاک نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ کھانا اس صورت میں کھایا جا سکتا ہے جب غذا وغیرہ مرطوب نہ ہو یا مرطوب ہو تو ان کا ہاتھ اسے نہ لگا ہو، لیکن ایسے محققین جو اہلِ کتاب کی طہارت کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ اگر ان کا کھانا ان کے ذبیحہ سے تیار نہ کیا گیا ہو اور نجاست عرضی کا یقین بھی نہ ہو (مثلاً شراب یا آب جو وغیرہ سے نجس نہ ہوا ہو) تو پھر ان کے ساتھ کھانا کھایا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ زیر بحث آیت کا مقصد دراصل اہلِ کتاب سے معاشرت کے سلسلے میں گذشتہ حد بندیوں کو برطرف کرنا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ تمھارا کھانا بھی ان کے لیے حلال ہے یعنی انھیں اپنے ہاں مہمان بلانے میں بھی کوئی حرج نہیں نیز اس کے فوراً بعد اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کے بارے میں بھی حکم بیان کیا گیا ہے۔

یہ امر واضح ہے کہ ایک حکومت اپنے پیروکاروں کو ایسا حکم دے سکتی ہے جب وہ اپنے ماحول پر پوری طرح سے کنٹرول حاصل کرلے اور اسے دشمن کا کوئی خوف نہ رہے ایسی صورتِ حال دراصل یوم غدیر یہ پیدا ہوچکی تھی۔ بعض کے نزدیک یہ حجۃ الوداع کا روزِ عرفہ تھا یا فتح خیبر کے بعد کا موقع تھا اگرچہ غدیر خم کا دن اس بات کیلیے ہر لحاظ سے زیادہ سازگار معلوم ہوتا ہے۔

<u>دوسرا سوال</u>: جو تفسیر المنار میں زیر بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں آیا ہے یہ ہے کہ صاحب تفسیر کے مطابق لفظ "طعام" بہت سی قرآنی آیات میں ہر قسم کی غذا کے لیے آیا ہے یہاں تک کہ گوشت بھی اس میں شامل ہے اب کیسے ممکن ہے کہ زیر بحث آیت میں اسے غلات اور میوہ جات وغیرہ میں محدود کر دیا جائے۔ موصوف اس کے بعد لکھتے ہیں کہ میں نے یہ اعتراض ایک ایسی مجلس میں پیش کیا جس میں کچھ شیعہ علماء بھی موجود تھے (اور کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا)۔

ہمارے نقطہ نظر کے مطابق اس اعتراض کا جواب بھی واضح ہے ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ لفظ "طعام" کا ایک وسیع مفہوم ہے لیکن گذشتہ آیات جن میں مختلف طرح کے گوشت کے بارے میں بحث ہے اور خصوصاً ان جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے جنھیں ذبح کرتے وقت خدا کا نام نہیں لیا گیا، وہ اس وسیع مفہوم کی تخصیص کرتی ہیں اور اسے ایسے گوشت کے علاوہ میں محدود کر دیتی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر عام اور مطلق قابلِ تخصیص ہے اور اسے بعض شرائط کا پابند کیا جا سکتا ہے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل کتاب

Marfat.com

ذبیحہ پر نام خدا لینے کے پابند نہیں ہیں اور اس کے علاوہ وہ دیگر شرائط کا بھی لحاظ نہیں رکھتے جو سنت سے ثابت ہیں۔

تیسرا سوال: کتاب کنز العرفان میں اس آیت کی تفسیر میں ایک اور اشکال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "طیبات" کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اصطلاح کے مطابق عام ہے لیکن "طعام الذین اوتوا الکتٰب" خاص ہے اور عموماً عام کے بعد خاص کے ذکر میں کوئی نکتہ ہونا چاہیے مگر یہاں کوئی واضح نکتہ نہیں ہے اسکے بعد مصنف اس اُمید کا اظہار کرتا ہے کہ خدا اس کی اس علمی مشکل کو حل کر دے۔ [۱]

مندرجہ بالا سطور میں اس سلسلے میں جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب بھی معلوم ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ طیبات کے حلال ہونے کا ذکر اہلِ کتاب سے میل جول پر عائد پابندی ختم کرنے کے لیے مقدمہ و تمہید کے طور پر آیا ہے، حقیقت میں آیت کہتی ہے کہ ہر پاکیزہ چیز تمہارے لیے حلال ہے اسی وجہ سے اہلِ کتاب کا (پاکیزہ) کھانا بھی تمہارے لیے حلال ہے اور ان سے معاشرت کے بارے میں جو پابندیاں پہلے عائد تھیں آج تمہیں میسر کامیابیوں کے باعث کم کر دی گئی ہیں (غور کیجیے گا)۔

غیر مُسلم عورتوں سے شادی

اہلِ کتاب کے کھانے کی حلیت کا حکم دینے کے بعد آیت میں پاکدامن مسلمان اور پاکدامن اہلِ کتاب عورتوں سے شادی بیاہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے: تمہارے لیے مسلمان اور اہلِ کتاب پاکدامن عورتیں حلال ہیں اور تم ان سے شادی کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کا حق مہر انھیں ادا کر دو (والمحصنات من المؤمنات والمحصنات من الذین اوتوا الکتٰب من قبلکم اذا اٰتیتموھن اجورھن) اور یہ بھی شرط ہے کہ شادی مشروع اور جائز طریقے سے ہو نہ کہ کھلے بندوں زنا ہو یا مخفی طور پر یاری لگاتے پھرو (محصنین غیر مسافحین ولامتخذی اخدان)۔ [۲]

درحقیقت آیت کا یہ حصہ بھی غیر مسلم عورتوں سے مسلمانوں کی شادی بیاہ کے سلسلے میں پابندیوں میں کمی کے لیے ہے۔ اس میں اہلِ کتاب عورتوں سے مسلمان مردوں کی شادی کو مشروط طور پر جائز قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اہلِ کتاب عورتوں سے ہر طرح کی دائمی و موقت شادی جائز ہے یا صرف ازدواج موقت یعنی متعہ جائز ہے فقہائے اسلام میں اس سلسلے میں اختلاف ہے علمائے اہل سنت ان دو طرح کی تزویج میں فرق کے قائل نہیں ان کا نظریہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت عمومیت کی حامل ہے لیکن بعض شیعہ فقہاء کے نزدیک یہ آیت صرف موقت ازدواج کی اجازت دیتی ہے۔ آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے منقول بعض روایات بھی اس نظریے کی تائید کرتی ہیں اور آیت میں بھی بعض ایسے قرائن موجود ہیں

---

[۱] کنز العرفان، جلد ۲ صفحہ ۳۱۲

[۲] جیسا کہ اس تفسیر کی جلد ۳ میں سورہ نساء کی آیت ۲۵ کے ذیل میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ "اخدان" "خدن" (بروزن "اذن") سے دوست اور رفیق کے معنی میں ہے لیکن عام طور پر جنس مخالف سے غیر شرعی طور پر پوشیدہ دوستی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

Marfat.com

جنھیں اس نظریئے پر شاہد قرار دیا جاسکتا ہے۔

پہلا قرینہ یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے: اذا اٰتیتموھن اجورھن ــــ بشرطیکہ ان کی اُجرت انھیں ادا کرو..... یہ درست ہے کہ "اجر" عقد دائمی اور عقد موقت دونوں کے حق مہر کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن زیادہ تر ازدواج موقت کیلیے استعمال ہوتا ہے یعنی زیادہ تر اسی سے مناسبت رکھتا ہے۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے: غیر مسافحین ولا متخذی اخدان۔ زنا اور پوشیدہ طور پر غیر شرعی یاری دوستی کے طور پر نہ ہو..... یہ تعبیر بھی موقت ازدواج سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کیونکہ دائمی شادی زنا اور پوشیدہ دوستی سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی کہ اس سے منع کیا جاتا لیکن بعض اوقات نادان اور بے خبر لوگ ازدواجِ موقت کو زنا یا پوشیدہ دوستی سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ تعبیرات سورۂ نساء کی آیت ۲۵ میں دکھائی دیتی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ وہ آیت ازدواجِ موقت کے بارے میں ہے۔

ان تمام امور کے باوجود بعض فقہا اہلِ کتاب سے مطلق ازدواج کو جائز سمجھتے ہیں اور مذکورہ قرآن کو آیت کی تخصیص کے لیے کافی نہیں سمجھتے اور اس سلسلے میں بعض روایات سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں زیادہ تفصیل فقہی کتب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

یہ بات بنا کہے نہ رہ جائے کہ آج جبکہ زمانہ جاہلیت کی بہت سی رسمیں زندہ ہوچکی ہیں یہ نظریہ بھی وجود میں آچکا ہے کہ غیر شدہ افراد کیلیے عورت یا مرد سے دوستانہ تعلقات میں نہ صرف مخفی صورت میں بلکہ کھلے بندوں بھی کوئی حرج نہیں۔

درحقیقت آج کی دنیا نے گناہ اور جنسی بے راہ روی میں زمانہ جاہلیت سے بھی قدم آگے بڑھا لیا ہے کیونکہ اس دور میں تو مخفی تعلقات کو جائز سمجھا جاتا تھا لیکن آج علی الاعلان ایسی دوستی کو جائز قرار دیا جاتا ہے یہانتک کہ انتہائی بے شرمی سے اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے یہ رسوا کن رسم جو واضح اور شرمناک بدکاری ہے مغرب کی طرف سے مشرق کے لیے منحوس سوغات ہے یہ بہت سی بدبختیوں اور جرائم کا سرچشمہ ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اہل کتاب کے طعام کے بارے میں (مذکورہ شرائط کے ساتھ) اجازت دی گئی ہے کہ ان سے کھانا کھایا بھی جاسکتا ہے اور انھیں کھلایا بھی جاسکتا ہے، لیکن شادی بیاہ کے سلسلے میں صرف ان سے رشتہ لینا جائز ہے، مسلمان عورتوں کے لیے کسی طرح کوئی اجازت نہیں کہ وہ اہلِ کتاب کے مردوں سے شادی کریں، اس کا فلسفہ کچھ غیر واضح ہے کہ عورتیں نسبتاً نرم دل ہوتی ہیں اور ممکن ہے کہ برخلاف مرد کے عورت بہت جلد اپنے شوہر کا عقیدہ قبول کرلے۔

مندرجہ بالا سہولتیں جو کہ اہلِ کتاب سے معاشرت اور ان کی عورتوں سے ازدواج کرنے کے بارے میں ہیں جن سے ممکن ہے کہ بعض لوگ غلط فائدہ اٹھائیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی طرف کھنچے چلے جائیں، لہٰذا آیت کے آخر میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جو شخص ان چیزوں سے کفر اختیار کرے کہ جن پر ایمان لانا چاہیے اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کفار کی راہ اختیار کرے اس کے اعمال برباد ہوجائیں گے اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا (ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ وھو فی الاٰخرۃ من الخاسرین)۔

Marfat.com

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ سہولتیں تمام تمھاری زندگی کی کشائش و آرام کے علاوہ اس چیز کا باعث بننا چاہییں کہ تم ان بے گانوں میں اثر و نفوذ پیدا کرو نہ یہ کہ تم ان کے زیر اثر ہو جاؤ اور اپنے دین سے دستبردار ہو جاؤ، کیونکہ اس صورت میں تمھاری سزا بہت سخت ہوگی[1]

آیت کے اس حصے کی تفسیر کے سلسلے میں چند روایات اور مذکورہ شانِ نزول کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت کے نزول اور اہل کتاب کے ساتھ کھانے اور ان کی عورتوں کی حلیت کے بعد بھی بعض مسلمان اسے ناپسند کرتے تھے لہٰذا قرآن نے انھیں تنبیہ کی کہ اگر انھیں خدا کے نازل کردہ احکام پر اعتراض ہے اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں تو ان کے اعمال برباد ہو جائیں گے اور وہ خسارے میں رہیں گے۔

۶۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۔ اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہو تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لو اور سر اور پاؤں کا مفصل (یا ابھری ہوئی جگہ تک) مسح کرو اور اگر حالتِ جنب میں ہو تو غسل کرو اور اگر بیمار ہو یا مسافر ہو یا تم میں سے کوئی (قضائے حاجت کی) پست جگہ سے آیا ہے یا عورتوں سے (مباشرت کیلیے) لمس کیا ہو اور (غسل یا وضو کیلیے) پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو اور اس (مٹی) سے چہرے کے اوپر (پیشانی پر) اور ہاتھوں پر مسح کرو۔ خدا انہیں

[1] حبط اور احباط کے لیے تفسیر نمونہ جلد دوم سورۂ بقرہ آیۃ ۲۱۷ کے ذیل میں صفحہ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

چاہتا کہ تمھارے لیے مشکل پیدا کرے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کرے شاید تم اس کا شکر ادا کرو۔

تفسیر

جسم اور رُوح کی پاکیزگی

گذشتہ آیات میں جسمانی پاکیزگی اور مادی نعمات کے بارے میں بحثیں تھیں۔ زیر نظر آیت میں روحانی پاکیزگی سے متعلق گفتگو ہے اس میں ان امور کا تذکرہ ہے جو روحانی طہارت کا باعث ہیں۔ اس میں وضو، غسل اور تیمم کے احکام ہیں اور روح کی صفائی کا باعث ہیں پہلے تو اہل ایمان سے خطاب کرتے ہوئے احکام وضو بیان کیے گئے ہیں، اے ایمان والو! جب نماز کے لیے کھڑے ہوجاؤ[1]، تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور سر کے ایک حصّے کا اور اسی طرح پاؤں کا مفصل (یا ابھری ہوئی جگہ تک) مسح کرو (یاایھا الذین اٰمنوا اذا قمتم الی الصلوٰة فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برءوسکم وارجلکم الی الکعبین)۔

آیت میں وضو میں دھونے کے لیے چہرے کی حدود کا ذکر نہیں، لیکن روایاتِ اہلبیتؑ میں رسول اللہؐ کے وضو کرنے کا طریقہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ لمبائی میں چہرے کی حد بالوں کے اگنے کی جگہ سے لے کر ٹھوڑی تک ہے اور چوڑائی میں وہ حصّہ جو درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان آجائے۔

دراصل یہ "وجہ" (چہرے) کے اس معنی کی وضاحت ہے جو عرف عام میں اس سے سمجھا جاتا ہے کیونکہ وجہ (چہرہ) وہی حصّہ ہے جس کا انسان سے ملتے ہی "مواجہ" (سامنا) ہوتا ہے۔

۲۔ ہاتھ کی حد جو وضو میں دھوئی جانی چاہیئے کہنی تک بیان ہوئی ہے کیونکہ "مرافق" "مرفق" کی جمع ہے جس کا معنی ہے "کہنی"۔ جب کہا جائے کہ ہاتھ دھولو تو ممکن ہے ذہن میں یہ آئے کہ انھیں کلائی تک دھونا ہے کیونکہ عام طور پر یہی مقدار دھوئی جاتی ہے اس وہم کو دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے، کہنیوں تک دھوؤ (الی المرافق) اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ

---

[1] آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول متعدد روایات میں ہے کہ قمتم (تم کھڑے ہو) سے مراد ہے نیند سے اٹھنا۔ آیت کے مشتملات اور تمام حصوں پر غور کرنے سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ بعد میں تیمم کا حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، او جاء احد منکم من الغائط (یا کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے لوٹے)۔ اگر آیت کا خطاب اصطلاحاً بے وضو افراد سے ہوتا تو اس جملے کا عطف اور وہ بھی "او" کے ذریعے آیت کے ظاہری مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ بھی بے وضو کے عنوان میں داخل ہے لیکن اگر آیت کے آغاز میں خطاب نیند سے اٹھنے والے لوگوں سے ہے اور اصطلاح کے مطابق صرف نیند کا حدث بیان کیا گیا ہے تو پھر اس جملے کا مفہوم بھی مکمل ہوگا (غور کیجیے گا)۔

Marfat.com

"الیٰ" اس آیت میں فقط دھونے کی حد بیان کرنے کے لیے ہے نہ کہ کیفیت بیان کرنے کے لیے جیسا کہ بعض کو اس سے یہی گمان ہوا ہے ان کا خیال ہے کہ آیت کہتی ہے کہ ہاتھ کو انگلیوں کے سروں سے لے کر کہنی تک دھونا چاہیے (جیسا کہ اہل سنت کے ایک طبقے میں رائج ہے)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ بالکل اس طرح ہے کہ انسان کسی کاریگر سے کہے کہ کمرے کی دیوار کو نیچے سے لے کر ایک میٹر اوپر تک رنگ کردو تو واضح ہے کہ مقصد یہ نہیں کہ دیوار کو نیچے سے اوپر کی طرف رنگ کرو بلکہ مراد یہ ہے کہ اتنی مقدار کو رنگ کرو اس سے زیادہ یا کم نہ ہو، اس لیے یہاں آیت میں بھی صرف ہاتھ کی وہ مقدار مقصود ہے جسے دھونا چاہیے۔ رہی ایسی کیفیت تو وہ سنت پیغمبرؐ میں ہے جو ان کے اہل بیتؑ کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہے اس کے مطابق کہنیوں سے لے کر انگلیوں کے سروں تک دھونا چاہیے۔

توجہ رہے کہ کہنی کو بھی وضو میں ساتھ دھونا چاہیے کیونکہ ایسے مواقع پر اصطلاح کے مطابق "غایت مغیا میں داخل ہے" یعنی حد بھی حکم محدود میں شامل ہے۔[1]

۳۔ کلمۂ "ب" جو "برءوسکم" میں ہے بعض روایات کے مطابق اور بعض اہل لغت کی تصریح کے مطابق تبعیض کے لیے ہے یعنی کچھ حصے کے مفہوم میں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سر کے کچھ حصے کا مسح کرو جسے ہماری اصطلاح میں سر کے اگلے حصے سے محدود کیا گیا ہے اور اس کے لیے سر کے چوتھائی یا کچھ کم حصے پر ہاتھ سے مسح کیا جاتا ہے اس لیے جو اہل سنت کے بعض گروہوں میں مروج ہے کہ وہ پورے سر کا یہاں تک کانوں کا بھی مسح کرتے ہیں وہ آیت کے مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتا۔

۴۔ "ارجلکم" "برءوسکم" کے ہم پہلو آیا ہے یہ اس بات پر شاہد ہے کہ پاؤں کا بھی مسح کیا جائے نہ کہ اسے دھویا جائے۔ "ارجلکم" کی لام پر زبر اس وجہ سے ہے کہ اس کا عطف "برءوسکم" کے ساتھ ہے نہ کہ "وجوھکم" پر عطف ہے۔[2]

۵۔ "کعب" لغت میں پاؤں کے اوپر کی ابھری ہوئی جگہ اور مفصل کے معنی میں آیا ہے یعنی وہ مقام جہاں پاؤں کی ہڈی سے پنڈلی کی ہڈی مل جاتی ہے۔[3]

---

[1] سیبویہ عربی لغت کا مشہور ماہر اور علم نحو کا عالم تھا وہ کہتا ہے کہ جہاں کہیں لفظ "الی" کا مابعد اور ماقبل ایک جنس سے ہوں تو مابعد قبل کے حکم میں ہوتا ہے اور اگر دو جنسوں سے ہوں تو پھر خارج ہوتا ہے (مثلاً اگر کہا جائے کہ دن کی آخری گھڑی تک روزہ رکھو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری گھڑی میں بھی روزہ رکھو اور اگر کہا جائے کہ ابتدائے رات تک روزہ رکھو تو اس کا معنی یہ ہے کہ ابتدائے رات حکم میں داخل نہیں ہے)۔ (المنارج ۶ ص ۲۲۳)

[2] اس میں شک نہیں کہ "وجوھکم" اور "ارجلکم" میں بہت فاصلہ ہے لہٰذا اس پر عطف کرنا بہت بعید نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے قاریوں نے "ارجلکم" کو لام کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔

[3] قاموس میں "کعب" کے تین معنی مذکور ہیں۔ ۱۔ پشت پا کی ابھری ہوئی جگہ، ۲۔ مفصل اور ۳۔ ٹخنے جو پاؤں کے دو طرف ہیں لیکن سنت میں جو وضاحت کی گئی ہے اس میں یہ بات مسلّم ہے کہ اس سے ٹخنے مراد نہیں، لیکن اس بات میں فقہا میں اتفاق نہیں کہ آیا یہ پاؤں پر کی ابھری ہوئی جگہ ہے یا پاؤں اور پنڈلی کا جوڑ (مفصل) بہرحال احتیاط یہی ہے کہ جوڑ تک ہی مسح کیا جائے۔

Marfat.com

اس کے بعد غسل کے بارے میں حکم ہے، فرمایا گیا ہے: اگر مجنب ہو تو غسل کرو (و ان کنتم جنبًا فاطھروا)۔
واضح ہے کہ "فاطھروا" سے مراد پورے جسم کا دھونا ہے کیونکہ اگر کسی مخصوص حصّے کا دھونا مطلوب ہوتا تو اس کا نام لیا جانا ضروری تھا اس لیے جب یہ فرماتا ہے کہ اپنے آپ کو دھولو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ سارے بدن کو دھولو۔ اس کی نظیر سُورۂ نساء آیۃ ۴۳ میں بھی موجود ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

حتی تغتسلوا

جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد ۲ میں سُورۂ نساء آیۃ ۴۳ کے ضمن میں نشاندہی کی جا چکی ہے کہ لفظ "جنب" مصدر ہے جو اسم فاعل کے معنی میں آیا ہے دراصل اس کا مطلب ہے "دور ہونے والا" اس کی وجہ یہ ہے کہ مجنب کو اس حالت میں نماز کی ادائیگی، مسجد میں توقف اور اس طرح کے دیگر کاموں سے دوری اختیار کرنا چاہیے۔ اور لفظ "جنب" مفرد، جمع، مذکر اور مونث سب کے لیے بولا جاتا ہے "جار جنب" کا اطلاق دُور کے ہمسایوں پر بھی اسی مناسبت سے ہے۔

قرآن مندرجہ بالا آیت میں کہتا ہے: نماز کے وقت مجنب ہو جاؤ تو غسل کرو، ممکن ہے اس سے یہ بھی اخذ کیا جا سکے کہ غسلِ جنابت، وضو کا بھی جانشین ہے۔

اس کے بعد تیمم کا حکم بیان کیا گیا ہے، اگر نیند سے اُٹھے ہو اور نماز کا ارادہ رکھتے ہو اور بیمار یا مسافر ہو یا قضائے حاجت سے لوٹے ہو یا عورتوں سے جنبی ملاپ کر چکے ہو اور پانی تک تمھاری رسائی نہیں ہے تو پاک مٹی سے تیمم کرلو (و ان کنتم مرضی او علی سفر او جاء احد منکم من الغائط او لمستم النساء فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدًا طیبًا)۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ "او جاء احد منکم من الغائط" اور "او لمستم النساء" کا عطف جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے آیت کی ابتداء یعنی "اذا قمتم الی الصلوٰۃ" پر ہے، حقیقت میں آیت کی ابتداء میں نیند کے مسئلے کی طرف اشارہ ہے اور آیت کے ذیل میں دو مزید چیزوں کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو وضو یا غسل کا سبب بنتی ہیں اگر ان دونوں جملوں کا عطف "علی سفر" پر کریں تو آیت میں کئی ایک اشکالات پیدا ہوں گے مثلاً قضائے حاجت سے لوٹنا، بیماری اور مسافرت کے مقابل پر نہیں ہو سکتا لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ "او" کو "واؤ" کے معنی میں لیں (جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے) اور یہ ظاہر کے بالکل خلاف ہے علاوہ ازیں یہ اشکال بھی ہے کہ وضو واجب کرنے والے امور میں سے صرف قضائے حاجت کا ذکر کرنا اس صورت میں بلا وجہ ہو گا، اگر اس طرح سے ہو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں تو ان دونوں میں سے کوئی اعتراض لاحق نہ ہوگا (غور کیجیے گا)۔

(بہت سے مفسرین کی طرح اگرچہ ہم بھی جلد ۲ میں نساء ۴۳ میں "او" کو واؤ کے معنی میں ذکر کر چکے ہیں لیکن جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ زیادہ قرینِ نظر ہے)۔

دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں مسئلہ جنابت کا دو مرتبہ ذکر آیا ہے ممکن ہے یہ تاکید کے لیے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ "جنب" جنابت اور نیند میں احتلام کے معنی میں ہو اور "او لمستم النساء" سے جنبی ملاپ والی جنابت سے کنایہ ہو نیز اگر "قیام" سے مراد "نیند سے اٹھنا" لیا جائے جیسا کہ روایاتِ اہلِ بیتؑ میں ہے اور خود آیت میں اس کا قرینہ موجود ہے تو یہ خود مسئلہ جنابت کے بارے میں کی گئی تفسیر پر شاہد ہوگا (غور کیجیے گا)۔

Marfat.com

اس کے بعد تیمم کا طریقہ بیان کیا گیا ہے: اس کے ذریعے اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو (فامسحوا بوجوھکم وایدیکم منہ)۔

واضح ہے کہ یہاں یہ مراد نہیں کہ کچھ مٹی اٹھالیں اور اسے اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیں بلکہ مراد یہ ہے کہ پاک مٹی پر ہاتھ مارنے کے بعد چہرے اور ہاتھوں کا مسح کریں، لیکن بعض فقہاء نے لفظ منہ کی وجہ سے کہا ہے کہ چاہے تھوڑا سا ہی کیوں نہ ہو غبار ہاتھ پر لگا ہونا چاہیے۔[1]

اب "صعیدًا طیبًا" کی تفسیر باقی رہ گئی ہے بہت سے علماء لغت نے "صعید" کے دو معانی ذکر کیے ہیں ایک مٹی اور دوسرا وہ چیزیں جنھوں نے کرۂ ارض کی سطح کو ڈھانپ رکھا ہے چاہے وہ مٹی ہو، ریت ہو یا پتھر وغیرہ۔ یہی بات فقہاء میں اس اختلاف نظر کا باعث بن گئی ہے کہ تیمم کس چیز پر جائز ہے، کیا صرف مٹی پر تیمم جائز ہے یا پتھر اور سنگریزوں پر بھی ہو جاتا ہے لیکن "صعید" کے اصل لغوی معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے یعنی "صعود اور اوپر ہونا" دوسرا مفہوم ہی زیادہ قرین ذہن ہے۔

"طیب" ایسی چیزوں کو کہا جاتا ہے جو انسان کی طبیعت اور مزاج کے موافق ہوں، قرآن میں یہ لفظ بہت سی چیزوں کے ساتھ استعمال ہوا ہے، مثلاً: البلد الطیب، مساکن طیبة، ریح طیب، حیاة طیبة، وغیرہ۔ ہر پاکیزہ چیز کو بھی طیب کہتے ہیں کیونکہ انسان کی طبیعت ذاتی طور پر ناپاک چیزوں سے نفرت کرتی ہے یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ تیمم کی مٹی پاک و پاکیزہ ہونا چاہیے۔

ہادیانِ اسلام سے منقول روایات میں خصوصاً اس بات کا تذکرہ ہے، ایک روایت میں ہے:

نھی امیر المؤمنین ان یتیمم الرجل بتراب من اثر الطریق۔

یعنی ——— حضرت امیر المومنینؑ نے گندی مٹی سے جو سڑکوں پر پڑی ہوتی ہے، تیمم کرنے سے منع فرمایا ہے۔[2]

توجہ رہے کہ قرآن و حدیث میں تو تیمم اسی مخصوص اسلامی ذمہ داری کے مفہوم میں آیا ہے جس کی وضاحت کی جا چکی ہے لیکن لغت میں اس کا معنی ہے "قصد کرنا" درحقیقت قرآن کہتا ہے کہ جب تیمم کرنا چاہو تو زمین کے کسی پاک حصے کا قصد کرو یعنی تیمم کے لیے زمین میں سے مختلف حصوں میں سے ایسا حصہ منتخب کرو جو "صعید" کے مفہوم سے ہم آہنگ ہو جو "صعود" کے مادہ سے ہے زمین کے اوپر والا حصہ جہاں بارش پڑتی ہو، سورج کی روشنی پڑتی ہو اور جس سے ہوائیں ٹکراتی ہوں۔ ایسی مٹی جو ہاتھوں اور پاؤں سے روندی نہیں جاتی، ایسی مٹی سے استفادہ نہ صرف صحت کے لیے مضر نہیں بلکہ جیسا کہ ہم تیسری جلد میں سورۂ نساء کی آیت ۴۳ کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں، سائنس دانوں کی گواہی کے مطابق جراثیم کش اثرات کا بھی حامل ہے۔

---

[1] احکام تیمم اور اس اسلامی حکم کا فلسفہ، اور یہ کہ ایسا کرنا نہ صرف صحت کے منافی نہیں بلکہ صحت مندی کا پہلو رکھتا ہے اسی طرح لفظ "غائط" کا مفہوم اور اس طرح کے دیگر مسائل کی تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ سورۂ نساء کی آیت ۴۳ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

[2] وسائل الشیعہ ج ۲ صفحہ ۹۶۹

Marfat.com

وضو اور تیمم کا فلسفہ

تیمم کے فلسفہ کے بارے میں تو تیسری جلد میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ باقی رہا وضو کا فلسفہ تو اس میں شک نہیں کہ وضو میں دو واضح فائدے ہیں:

ایک فائدہ صحت کے حوالے سے ہے اور دوسرا فائدہ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ہے۔

صحت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک دن میں پانچ مرتبہ یا کم از کم تین مرتبہ چہرے اور ہاتھوں کے دھونا ، بدن کی نظافت اور پاکیزگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سر اور پاؤں کے مسح کی شرط کہ جس میں ضروری ہے کہ پانی بالوں یا بدن کے چمڑے کو مس کرے بھی اس چیز کا سبب بنتا ہے کہ یہ اعضاء بھی پاک صاف رکھے جائیں اور جیسا کہ غسل کے فلسفہ میں ہم واضح کریں گے، پانی کا بدن کے چمڑے کو مس کرنا سمپاتھیٹک (SYMPATHETIC) اور پیرا سمپاتھیٹک (PARASYMPATHETIC) اعصاب معتدل رکھنے میں بہت مؤثر ہے۔

اخلاقی و روحانی حوالے سے دیکھا جائے تو چونکہ یہ کام قصد قربت سے اور خدا کے لیے کیا جاتا ہے لہٰذا تربیتی اثرات کا حامل ہے خصوصاً جب کہ کنایۃً اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں سر سے لے کر پاؤں تک تیری اطاعت کے لیے حاضر ہوں۔ اس اخلاقی اور معنوی پہلو کی مؤید وہ روایت ہے جو امام علی بن موسیٰ رضا علیہما السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

انما امر بالوضوء وبدء به لان یکون العبد طاهرًا اذاقام بین یدی الجبار، عند مناجاته ایاه، مطیعًا له فیما امره، نقیًا من الادناس والنجاسة، مع ما فیه من ذهاب الکسل، وطرد النعاس وتزکیة الفؤاد للقیام بین یدی الجبار۔

وضو کا حکم اس لیے دیا گیا ہے اور عبادت کی ابتداء اس سے اس لیے کی گئی ہے تاکہ بندے جب بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہوں اور مناجات کریں تو پاک و پاکیزہ ہوں، اس کے احکام پر کاربند رہیں اور آلودگیوں اور نجاستوں سے دور رہیں۔ اس کے علاوہ وضو کے سبب سے نیند اور سستی کے اثرات انسان سے دور ہو جاتے ہیں نیز یہ اس لیے ہے تاکہ دل درگاہ خداوندی میں کھڑے ہونے کے لیے روشنی اور پاکیزگی حاصل کرے[1]

غسل کا فلسفہ

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ حالت جنب کے لیے اسلام غسل کا حکم کیوں دیتا ہے جبکہ ایک خاص حصہ آلودہ ہوتا ہے۔ پیشاب

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۷

Marfat.com

کرنے اور منی خارج ہونے میں کیا فرق ہے ؟ جب کہ ایک میں تو فقط اسس جگہ کو دھونے کا حکم ہے اور دوسرے میں سارے بدن کو دھونے کا۔

اس سوال کا ایک جواب اجمالی ہے اور دوسرا تفصیلی۔

اجمالی جواب یہ ہے کہ اخراج منی پیشاب اور دیگر فضلات کی طرح کسی ایک حصّے کا عمل نہیں ہے کیونکہ اس کا اثر سارے بدن پر ہوتا ہے۔ بدن کے تمام خلیے اس کے اخراج کے بعد ایک خاص سستی میں ڈوب جاتے ہیں جو کہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ کام سارے بدن کے اعضاء پر اثر انداز ہوتا ہے اس کی وضاحت کچھ یوں ہے :

سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق انسانی جسم میں نباتی اعصاب کے دو سلسلے ہیں جو بدن کی تمام فعالیت کو کنٹرول کرتے ہیں ایک **سمپاتھیٹک** اور دوسرا **پیرا سمپاتھیٹک**

سارے انسانی بدن میں اور اس کی مشینریوں میں یہ سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ **سمپاتھیٹک** (SYMPATHETIC) اعصاب کی ذمہ داری ہے "تیز کرنا" اور بدن کی مختلف مشینریوں کو فعالیت پر ابھارنا اور **پیرا سمپاتھیٹک** (PARASYMPATHETIC) کا کام ہے ان کی فعالیت کو سست کرنا۔ درحقیقت ان میں ایک گاڑی کے لیے گیس یا پٹرول کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا بریک کا کام کرتا ہے ان دو طرح کے نباتی اعصاب کی فعالیت کے اعتدال سے جسم کا کارخانہ معتدل طور پر کام کرتا رہتا ہے۔

بعض اوقات انسانی بدن میں اس طرح کے حوادث نمودار ہوتے ہیں جو اس اعتدال کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ جنسی لذت کا عروج پر پہنچنا (CLIMAX) بھی ایسے حوادث میں سے ہے جو عام طور پر منی کے اخراج کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اس موقع پر پیرا سمپاتھیٹک (PARASYMPATHETIC) کا سلسلہ سمپاتھیٹک (SYMPATHETIC) اعصاب پر سبقت حاصل کر لیتا ہے اور اعتدال منفی شکل میں بدل جاتا ہے۔

یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ سمپاتھیٹک (SYMPATHETIC) اعصاب کو کام پر ابھارنے اور بدن کے اعتدال کو واپس لانے کے لیے بدن سے پانی کا مَس کرنا بھی مؤثر ہے اور چونکہ جنسی لذت کا عروج (CLIMAX) تمام اعضائے بدن پر حسی طور پر اثر انداز ہوتا ہے اور اعصاب کے ان دونوں سلسلوں کا اعتدال سارے بدن میں ٹوٹ جاتا ہے لہٰذا حکم دیا گیا ہے کہ جنسی ملاپ یا اخراج منی کے بعد سارے بدن کو پانی سے دھویا جائے تاکہ اسس کا حیات بخش اثر پورے جسم میں اعصاب کے اعتدال کی بحالی کی صورت میں ظاہر ہو۔[۱]

---

[۱] امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا :

ان الجنابة خارجة من کل جسده فلذٰلك وجب علیه تطهیر جسده کله

جنابت سارے بدن سے خارج ہوتی ہے لہٰذا پورے بدن کو دھویا جائے۔

(وسائل الشیعہ ج ۱ ص ۴۶۶)

یہ روایت بھی گویا اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

Marfat.com

البتہ غسل کا بس یہی فائدہ نہیں بلکہ یہ غسل ایک طرح کی عبادت بھی ہے جس کے اخلاقی اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا اسی لیے قصد قربت اور فرمانِ خدا کی اطاعت کی نیت بغیر ایسا غسل صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت جنسی ملاپ اور اخراج منی کے وقت روح بھی متاثر ہوتی ہے اور جسم بھی۔ روح مادی شہوات کی طرف کھینچتی ہے اور جسم سستی کا شکار ہوتا ہے۔ جسم کو چونکہ قصد قربت سے دھویا جاتا ہے لہٰذا یہ ایک طرح سے غسل روح بھی ہے۔ اس طرح سے روح خدا اور معنویت کی طرف مائل ہوتی ہے اور جسم پاکیزگی، نشاط اور فعالیت کی طرف۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر، زندگی بھر غسل جنابت کا وجوب بدن کی نگہداشت اور صحت کی حفاظت کے لیے ایک لازمی اور ضروری اسلامی حکم ہے۔ کیونکہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اپنی نظافت اور ستھرائی سے غافل رہتے ہیں لیکن یہ اسلامی حکم مختلف وقتی فاصلوں پر انھیں نہانے اور بدن کو پاک رکھنے پر ابھارتا ہے۔ یہ امر گذشتہ زمانے کے لوگوں سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ خود ہمارے زمانے میں بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو جسم کی نظافت اور صفائی سے مختلف وجوہ کی بنا پر غافل رہتے ہیں (البتہ یہ حکم کلی اور عمومی ہے یہاں تک کہ اس شخص کے لیے بھی ہے جس نے ابھی تازہ غسل کیا ہے)

مذکورہ بالا تینوں وجوہ مجموعی طور پر واضح کرتی ہیں کہ نیند یا بیداری کی حالت میں اخراج منی اور جنسی ملاپ کی صورت میں اگرچہ منی خارج نہ ہو سارے بدن کو کیوں لازمی طور پر دھونا چاہیے۔

آیت کے آخر میں یہ بات واضح کرنے کے لیے کہ مذکورہ احکام میں کوئی سختی نہیں ہے بلکہ وہ سارے احکام مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر نافذ کیے گئے ہیں، فرمایا گیا ہے، خدا نہیں چاہتا کہ تمھیں مشقت اور زحمت میں ڈال دے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک و پاکیزہ رکھے اور اپنی نعمت تم پر تمام کردے تاکہ تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو (ما یرید الله لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم و لیتم نعمته علیکم لعلکم تشکرون)۔

دراصل اس جملے میں اس حقیقت کی تاکید کی گئی ہے کہ تمام خدائی احکام اور اسلامی پروگرام لوگوں کی خاطر اور انہی کے فائدے میں ہیں اور ان سے کچھ اور مقصود نہیں، خدا چاہتا ہے کہ ان احکام کے ذریعے لوگوں کو روحانی اور جسمانی طور پر پاکیزہ رکھے۔

ضمناً اس طرف بھی توجہ رہے کہ خدا نہیں چاہتا کہ تمھارے دوش پر کوئی طاقت فرسا اور مشکل ذمہ داری ڈال دے یہ بات اگرچہ غسل، وضو اور تیمم سے مربوط احکام کے ضمن میں آئی ہے لیکن یہ ایک عمومی قانون بھی بیان کر رہی ہے کہ احکام الٰہی کسی موقع پر بھی طاقت فرسا اور قوت سے بڑھ کر نہیں ہیں۔

اس لیے جب کوئی حکم یا ذمہ داری کسی کے لیے سخت مشکل اور ناقابل برداشت ہو جائے تو اس کے پیش نظر وہ اس سے ساقط ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت کے لیے روزہ رکھنا باعثِ مشقت ہو جائے تو اسی آیت کی بنا پر ان پر واجب نہیں رہتا۔

یہ بات فراموش نہیں کی جانا چاہیے کہ بعض احکام ذاتی طور پر مشکل ہیں اور اہم مقاصد اور مصلحتوں کے پیش نظر ایسی مشکلات کو برداشت کرنا چاہیے۔ مثلاً دشمنانِ حق کے خلاف جہاد۔

اس آیت سے فقہ اسلامی میں ایک بنیادی اصول "قاعدہ لا حرج" حاصل کیا گیا ہے اور فقہاء بہت سے

Marfat.com

مواقع پر احکام کے استنباط میں اس سے استناد کرتے ہیں۔

۷۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○

ترجمہ

۷۔ اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو اور اس عہد و پیمان کو (بھی یاد کرو) جو اس نے تم سے لیا ہے۔ اس وقت جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور خدا (کی نافرمانی) سے ڈرو، کیونکہ خدا سینوں کے اندر کے حالات سے آگاہ ہے۔

تفسیر

خدا سے باندھے گئے پیمان

گذشتہ آیت میں چند احکام اسلامی اور نعمات الٰہی کی تکمیل کا ذکر تھا۔ اسی بحث کی مناسبت سے اس آیت میں مسلمانوں کو دوبارہ خدا کی لامتناہی نعمات کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان نعمات میں سب سے اہم ایمان، اسلام اور ہدایت کی نعمت ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے: خدا کی نعمتوں کو یاد رکھو (واذکروا نعمۃ اللہ علیکم) یہاں لفظ "نعمت" مفرد صورت میں ہے لیکن یہ جنس کے معنی میں ہے اور جنس یہاں عمومیت کا مفہوم رکھتی ہے لہٰذا اس سے مراد تمام تر نعمتیں ہیں۔

البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ خصوصیت سے یہاں نعمتِ اسلام مراد ہو جس کی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ کیا گیا ہے، جہاں فرمایا گیا ہے: ولیتم نعمتہ علیکم — اور اس سے بڑھ کر کون سی نعمت ہو سکتی ہے۔ اسلام ہی کے زیر سایہ مسلمانوں کو تمام تر نعمتیں، افتخارات اور وسائل نصیب ہوئے۔ وہ لوگ جو پہلے بالکل منتشر، جاہل، گمراہ، خوں خوار، فاسد اور مفسد تھے۔ اسلام نے انھیں اتحاد اور دانائی عطا کی اور وہ مادی و روحانی نعمتوں سے مالا مال ہو گئے۔

اس کے بعد وہ عہد و پیمان جو انھوں نے خدا سے باندھا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور میثاقِ الٰہی کو فراموش نہ کرو جبکہ اس وقت تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی (ومیثاقہ الذی واثقکم بہ اذ قلتم سمعنا واطعنا)۔

Marfat.com

اس بارے میں کہ اس پیمان سے کون سا پیمان مراد ہے دو احتمالات پیش کیے گئے ہیں۔

پہلا وہ پیمان کہ جو مسلمانوں نے آغاز اسلام میں حدیبیہ کے موقع پر باندھا تھا یا حجۃ الوداع یا عقبہ میں باندھا تھا یا پھر وہ پیمان جو ہر مسلمان نے اسلام قبول کرتے ہی بالواسطہ طور پر خدا سے باندھا تھا۔

دوسرا وہ پیمان جو فطری طور پر ہر شخص اپنے خدا سے باندھ چکا ہے اسی کو بعض اوقات "عالم ذر"[1] کہتے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اس کی خلقت کے وقت قابل نظر صلاحیتیں اور بے شمار نعمتیں عطا کیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کو اسرار آفرینش اور اس کے ذریعے پروردگار کی معرفت کی استعداد بخشی ہے۔ اسی طرح اس نے عقل و شعور سے نوازا جس کے ذریعے انسان پیغمبروں کو پہچانتا ہے اور ان کے احکام پر عمل کرتا ہے۔

یہ صلاحیتیں عطا فرما کر خدا نے عملاً انسان سے یہ عہد لیا کہ وہ انھیں معطل اور باطل نہیں کر چھوڑے گا، بلکہ ان سے صحیح طور پر استفادہ کرے گا اور انسان بھی یہ صلاحیتیں حاصل کر کے بزبانِ حال پکار اٹھا کہ سمعنا و اطعنا۔ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

یہ عہد و پیمان زیادہ وسیع، زیادہ پائیدار اور زیادہ عمومی ہے جو خدا نے اپنے بندوں سے لیا ہے یہ وہی پیمان ہے جس کی طرف حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لیستادوھم میثاق فطرتہ

انبیاء اس لیے بھیجے گئے کہ وہ لوگوں کو پیمانِ فطرت پورا کرنے کی دعوت دیں۔

واضح ہے کہ یہ وسیع پیمان تمام دینی مسائل پر بھی محیط ہے[2]۔ کوئی مانع نہیں کہ یہ آیت تمام تکوینی اور تشریعی عہد و پیمان (جو خدا نے بحکم فطرت لیے ہیں یا رسول اللہؐ نے مسلمانوں سے مختلف موقعوں پر لیے ہیں) کی طرف اشارہ ہو۔

یہاں سے واضح ہو گیا کہ وہ حدیث جس میں ہے کہ میثاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع میں ولایت علیؑ کے سلسلے میں لیا تھا وہ ہمارے مذکورہ بیان سے پوری مناسبت رکھتا ہے کیونکہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ مختلف آیات کے ذیل میں آنے والی احادیث کسی ایک روشن اور واضح مصداق کی طرف اشارہ کرتی ہیں نہ یہ کہ مفہوم آیات ان میں منحصر ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "میثاق" اصل میں "وثاقہ" یا "وثوق" کے مادہ سے ہے جو طناب وغیرہ سے کسی چیز کو باندھنے کے معنی میں ہے بعد از اں ہر اس کام کو کہا جانے لگا جو اطمینانِ خاطر کا سبب بنے۔ عہد و پیمان چونکہ ایک گرہ کی مانند ہے جو دو افراد یا دو گروہوں کے درمیان بندھ جاتا ہے اور ان کے اطمینان کا باعث بنتا ہے اس لیے اسے میثاق کہتے ہیں۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: پرہیزگاری اختیار کرو کہ خدا سینوں کے اندر کے اسرار سے آگاہ ہے (واتقوا اللہ ان اللہ علیم بذات الصدور)۔

---

[1] اس بارے میں مزید تشریح اور یہ کہ اسے "عالم ذر" کیوں کہتے ہیں انشاء اللہ اعراف ۱۷۲ کے ذیل میں ملاحظہ کیجیے گا۔

[2] تفسیر برہان ج ۱ صفحہ ۴۵۴

Marfat.com

"ذات الصدور" مرکب ہے۔ "ذات" عین اور حقیقت کے معنی میں ہے اور "صدور"، "صدر" کی جمع ہے جس کا معنی ہے سینہ۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا ان باریک ترین اسرار سے باخبر ہے جو انسان کی روح کی گہرائیوں میں چھپے ہوتے ہیں اور انھیں اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ عواطف، احساسات اور نیتوں کو دل اور اندرونِ سینہ سے کیوں نسبت دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جلد اوّل صفحہ ..۱ (اردو ترجمہ) میں تفصیل سے بحث کی جاچکی ہے۔

۸۔ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○

۹۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ○

۱۰۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ○

ترجمہ

۸۔ اے ایمان والو! ہمیشہ خدا کے لیے قیام کرو اور عادلانہ گواہی دو اور کسی گروہ کی دشمنی تمھیں ترکِ عدالت کی طرف نہ لے جائے۔ عدل کرو کہ وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

۹۔ خدا نے ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں سے بخشش اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

۱۰۔ اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں وہ اہلِ جہنم ہیں۔

تفسیر

قیامِ عدالت کا تاکیدی حکم

پہلی آیت قیامِ عدالت کی دعوت دیتی ہے۔ ایسی ہی دعوت کچھ فرق کے ساتھ سورۂ نسآء آیۃ ۱۲۵ میں گذر چکی ہے۔

Marfat.com

پہلے تو صاحب ایمان افراد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! ہمیشہ خدا کے لیے قیام کرو اور عادلانہ گواہی دو (یایها الذین اٰمنوا کونوا قوامین لله شهداء بالقسط)۔

اس کے بعد عدالت سے انحراف کے ایک عمومی سبب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ قومی عداوتیں اور شخصی معاملات کہیں تمہیں اجرائے عدالت سے روک نہ دیں اور کہیں دوسروں کے حقوق پر تجاوز کا سبب نہ بن جائیں کیونکہ عدالت ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے (ولا یجرمنکم شنأن قوم علیٰ الا تعدلوا)۔

مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر دوبارہ عدالت ہی کا حکم دیا گیا ہے: عدالت اختیار کرو کہ وہ پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے (اعدلوا هو اقرب للتقوی)۔

عدالت چونکہ تقویٰ و پرہیز گاری کا بہترین رکن ہے لہٰذا تیسری مرتبہ بطور تاکید فرمایا گیا ہے: خدا سے ڈرو کیونکہ خدا تمہارے تمام اعمال سے آگاہ ہے (واتقوا الله ان الله خبیر بما تعملون)۔

اس آیت میں اور سورۂ نساء کی آیت ۱۳۵ میں چند پہلوؤں میں فرق ہے، جو یہ ہیں:

۱۔ سورہ نساء میں عدالت کے قیام اور خدا کے لیے گواہی دینے کی دعوت دی گئی ہے لیکن یہاں خدا کے لیے قیام اور حق و عدالت کی گواہی دینے کی دعوت دی گئی ہے یہ فرق شاید اس لیے ہو کہ سورۂ نساء میں ہدف یہ تھا کہ گواہیاں خدا کے لیے دی جائیں نہ کہ اقرباء، اعزا اور وابستگان کے لیے، لیکن یہاں چونکہ گفتگو دشمن کے متعلق ہے۔ لہٰذا عدل و قسط پر مبنی گواہی کی بات کی گئی ہے یعنی ظلم و ستم پر مبنی گواہی نہ ہو۔

۲۔ سورۂ نساء میں عدالت سے انحراف کا ایک سبب بیان کیا گیا ہے اور یہاں دوسرا سبب مذکور ہے وہاں بلاوجہ محبت میں افراط اور یہاں بلاوجہ بغض میں افراط کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن سورۂ نساء کی اس بات میں دونوں جمع ہیں کہ فلا تتبعوا الهوی ان تعدلوا ——— یعنی ترک عدالت سے ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو ——— بلکہ ہوا و ہوس کی پیروی ظلم و ستم کا وسیع منبع ہے کیونکہ ظلم و ستم بعض اوقات ہوا پرستی کی وجہ سے اور شخصی مفادات کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے نہ کہ دوستی اور دشمنی کی بنا پر، لہٰذا عدالت سے انحراف کی اصل بنیاد ہوا و ہوس کی پیروی ہے جس کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ اور حضرت امیرالمومنینؑ نے فرمایا ہے:

امّا اتباع الهوی فیصد عن الحق
ہوا پرستی تمہیں حق سے باز رکھے گی[1]

عدالت ایک اہم اسلامی حکم ہے

اسلام میں بہت کم مسائل عدالت جیسی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ مسئلہ عدل، مسئلہ توحید کی طرح اسلام کے تمام

---

[1] یہ حدیث کتاب سفینۃ البحار میں مادہ "ہویٰ" کے ذیل میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے اور نہج البلاغہ کے خطبہ ۴۲ میں حضرت علیؑ سے نقل ہوئی ہے۔

Marfat.com

اصول و فروع کی بنیاد ہے، جیسے اعتقادی، عملی، انفرادی، اجتماعی، اخلاقی اور حقوق کے بارے میں کوئی بھی مسئلہ حقیقت توحید سے جدا نہیں اسی طرح ان میں کوئی بھی روح عدل سے خالی نہیں ملے گا۔

یہی وجہ ہے کہ تعجب کا مقام نہیں کہ عدل اصولِ دین میں سے ہو اور مسلمانوں کی فکری عمارت کی ایک بنیاد کے طور پر پہچانا جائے۔ اگرچہ عدالت جو کہ اصول دین کا حصہ ہے صفات الٰہیہ میں سے ہے اور خداشناسی جو کہ اصولِ دین میں سے ایک ہے میں عدالت بھی شامل ہے لیکن اسے ممتاز اور جدا رکھنا بہت معنی خیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے اجتماعی مباحث میں عدالت سے بڑھ کر کسی اصل سے کام نہیں لیا گیا۔ مندرجہ ذیل احادیث اس کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ایاکم والظلم فان الظلم عند الله هو الظلمات یوم القیٰمة

ظلم سے بچو کیونکہ ہر عمل روز قیامت اپنی مناسب شکل میں مجسم ہوگا اور ظلم ظلمت و تاریکی کی صورت میں مجسم ہوگا اور تاریکی کا پردہ ظالموں کو گھیرے ہوئے ہوگا۔[1]

اور ہم جانتے ہیں کہ ہر خیر و برکت نور میں ہے اور ظلمت ہر عدم اور فقدان کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے۔

بالعدل قامت السمٰوٰت و الارض

آسمان اور زمین عدل کی بنیاد پر قائم ہیں[2]

عدالت کے بارے یہ بات واضح ترین ممکن تعبیر ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ نوعِ بشر کی یہ محدود زندگی اس کرۂ خاکی میں عدالت کے بغیر برپا نہیں ہوسکتی بلکہ تمام جہانِ ہستی اور آسمان و زمین سب کا قیام عدالت کی وجہ سے، توانائیوں کے اعتدال کے باعث اور ہر چیز کے اپنے مقام و محل پر ہونے کے سبب سے ہے اور اگر یہ لحظہ بھر کے لیے اور سوئی کی نوک کے برابر اس اصول سے منحرف ہوجائیں تو تباہ و برباد ہوجائیں۔ اس سے ملتی جلتی ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے:

الملك يبقىٰ مع الكفر و لا يبقىٰ مع الظلم

حکومتیں کفر سے تو ممکن ہے باقی رہ جائیں، لیکن ظالم ہوں تو انھیں دوام حاصل نہیں ہوسکتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ظلم ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر اس دنیا میں جلدی ظاہر ہوجاتا ہے آج کی دنیا میں جنگیں، اضطراب، بے اطمینانی، سیاسی افراتفری، نیز اجتماعی، اخلاقی اور اقتصادی بحران اس حقیقت کو اچھے طریقے سے ثابت کر رہے ہیں۔

جس چیز کی طرف پوری توجہ رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اسلام عدالت کی فقط نصیحت نہیں کرتا بلکہ اس کی نظر میں زیادہ اہم عدالت کا رائج ہونا ہے ان آیات و روایات کا فقط برسرِ منبر پڑھنا، کتابوں میں لکھنا یا تقاریر میں سنانا معاشرے میں موجود

---

[1] سفینۃ البحار...... مادہ "ظلم"

[2] تفسیر صافی سورہ رحمٰن آیۃ ۸ کے ذیل میں۔

Marfat.com

ناانصافیوں، برائیوں اور خرابیوں کا علاج نہیں بلکہ ان احکام کی عظمت اس دن واضح ہوگی جب یہ مسلمانوں کی زندگی میں جاری ساری ہوجائیں گے۔

اگلی آیت میں خصوصی احکام کی تاکید اور تکمیل کے لیے سنت قرآن کے مطابق کلی قانون اور اصول کی نشاندہی کی گئی ہے ایمان لانے والوں سے خدا بخشش اور اجرعظیم کا وعدہ کرتا ہے (وعد الله الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لهم مغفرة واجر عظیم) اور جو اللہ اور اسکی نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ اہلِ دوزخ ہیں (والذین کفروا وکذبوا باٰیاتنا اولٰئك اصحاب الجحیم)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بخشش اور اجر عظیم کا ذکر اس آیت میں خدا تعالیٰ کے وعدہ کے طور پر آیا ہے اور فرمایا گیا ہے:

وعد الله یعنی اللہ کا وعدہ ہے لیکن دوزخ کی سزا کا ذکر عمل کے نتیجہ کی صورت میں ہے، فرمایا گیا ہے: جن لوگوں کے ایسے اعمال ہوں گے ان کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا یہ درحقیقت دارِ آخرت کی جزا میں خدا کے فضل و رحمت کی طرف اشارہ ہے جو کسی طرح بھی انسان کے ناچیز اعمال کے برابر نہیں ہے جیسا کہ وہاں کی سزا بھی انتقامی پہلو نہیں رکھتی۔ بلکہ خود آدمی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔

ضمناً یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ "اصحٰب الجحیم" میں "اصحاب" کا معنی ہے یار و انصار جو ہمیشہ ساتھ دینے والے ہوتے ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ کے ساتھی ہیں لیکن تنہا یہ آیت دوزخ میں ہمیشہ رہنے کی دلیل نہیں بن سکتی جیسا کہ تفسیر تبیان، مجمع البیان اور تفسیر فخر الدین رازی میں آیا ہے کیونکہ اس میں قیام ہوسکتا ہے دائمی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ طویل مدت کے لیے ہو اور اس کے بعد نہ ہو جیسا کہ حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار ہونے والوں کے لیے قرآن میں "اصحاب السفینہ" (کشتی کے ساتھی) کہا گیا ہے اور اس میں قیام بھی دائمی نہ تھا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ کفار دوزخ میں رہیں گے لیکن زیرِ نظر آیت میں اس کے بارے میں گفتگو نہیں ہے بلکہ یہ بات دیگر آیات سے معلوم ہوتی ہے۔[1]

۱۱۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ فَكَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ عَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۠ ۟

ترجمہ

۱۱۔ اے ایمان والو! وہ نعمت یاد کرو جو خدا نے تمھیں بخشی جبکہ (دشمنوں کی) ایک جماعت نے ارادہ کر رکھا تھا کہ تم پر

[1] "جحیم" مادہ "جحم" (بروزن "فہم") سے ہے اس کا معنی ہے "شدت سے آگ بھڑکنا" جہنم کو اسی وجہ سے "جحیم" کہا گیا ہے۔ دنیا کی جلانے والی وسیع آگ کو بھی کبھی "جحیم" کہتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں ہے کہ نمرود نے یوں کہا:

فالقوه فی الجحیم

پس اسے بھڑکتی آگ میں ڈال دو (الصّٰفّٰت۔ ۹۷)

Marfat.com

ہاتھ اٹھائے (اور تمھیں ختم کردے) لیکن خدا نے ان کا ہاتھ تم سے روک دیا، خدا سے ڈرو اور مومنین کو چاہیے کہ وہ صرف خدا پر ہی توکّل (اور بھروسہ) کریں۔

تفسیر

گذشتہ چند آیات میں نعماتِ الٰہی کے ذکر کے بعد اس آیت میں پھر روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کچھ اور نعمتیں مسلمانوں کو یاد دلائی ہیں تاکہ ان کے شکرانے کے طور پر فرمانِ خدا کی اطاعت کریں اور عدالت کے قیام کی کوشش کریں۔ فرمایا گیا ہے: اے ایمان لے آنے والو! خدا کی اس وقت کی نعمت کو یاد کرو جب ایک گروہ مصمم ارادہ کرچکا تھا کہ تمھاری طرف ہاتھ بڑھائے اور تمھیں ختم کردے لیکن خدا نے ان کا شر تم سے دُور کردیا (یا یھا الذین اٰمنوا اذکروا نعمت اللہ علیکم اذ ھم قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم فکف ایدیھم عنکم)۔

خداوند عالم آیاتِ قرآنی میں مسلمانوں کو بار بار اپنی گوناگوں نعمات اور الطاف یاد دلاتا ہے تاکہ ان میں روحِ ایمان کو محکم کرے، ان میں شکر گذاری کا احساس اجاگر کرے اور مشکلات کے مقابلے میں انھیں ثباتِ قدم پر ابھارے۔ ایسی آیات میں سے ایک زیرِ نظر آیت بھی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ آیت کون سے واقعہ کی طرف اشارہ کررہی ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض سمجھتے ہیں کہ یہ بنی نضیر کے یہودیوں کا خطرہ برطرف کرنے کی طرف اشارہ ہے، جنھوں نے مدینہ میں رسولِ خدا اور مسلمانوں کو ختم کرنے کی سازش کی تھی۔

بعض مفسرین اسے "بطن نخل" کے واقعہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو حدیبیہ کے موقع پر ہجرت کے چھٹے برس واقع ہوا۔ ہوا یہ کہ خالد بن ولید کی سرکردگی میں مشرکین مکہ کی ایک جماعت نے پروگرام بنایا کہ نمازِ عصر کے دوران میں مسلمانوں پر حملہ کردیں۔ پیغمبر اکرمؐ اس سازش سے آگاہ ہوگئے۔ آپؐ نے نماز کو مختصر کرکے نمازِ خوف میں تبدیل کردیا۔ اس طرح ان کی سازش نقش برآب ہوگئی۔

بعض اسے رسولؐ اللہ اور مسلمانوں کی حادثات سے معمور زندگی کے دیگر حوادث کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ آیت ان تمام حوادث کی طرف اشارہ کررہی ہے جو پوری تاریخ اسلام میں وقوع پذیر ہوتے رہے۔ آیت میں لفظ "قوم" نکرہ ہے اور وحدت پر دلالت ہے، اگر اس سے صرف نظر کرلیں تو یہ تفسیر دیگر تفاسیر سے بہتر ہے۔

بہرحال آیت مسلمانوں کی توجہ ان خطرات کی طرف دلا رہی ہے جن میں ممکن تھا کہ ان کا نام ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ آیت تنبیہ کررہی ہے کہ ان نعمتوں کی قدردانی کرتے ہوئے تقویٰ اختیار کرو، خدا پر بھروسہ رکھو اور جان لو کہ اگر تم پرہیزگار رہے تو زندگی میں اکیلے نہیں رہو گے اور وہ دستِ غیب جو ہمیشہ تمھارا محافظ رہا ہے آئندہ بھی حمایت کرتا رہے گا (و اتقوا اللہ وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون)۔

واضح ہے کہ توکّل کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنے کام خدا پر چھوڑنے کے بہانے ذمہ داریوں سے صرف نظر کرلے یا حوادث کے سامنے سر جھکا لے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی پوری صلاحیت اور توانائی کو بروئے کار لانے کے باوجود اس طرف متوجہ رہے کہ جو کچھ

Marfat.com

اس کے پاس ہے وہ خود اس کی اپنی طرف سے نہیں ہے بلکہ کسی دوسری ذات کی طرف سے ہے۔ اس طرح غرور اور خود پرستی کا احساس اپنے دل سے نکال دے نیز اس بات سے نہ ڈرے کہ مشکلات و حوادث بہت زیادہ اور شدید ہیں، مایوس نہ ہو اور جان لے کہ اس کے پاس ایک ایسا سہارا ہے جس کی قدرت تمام قدرتوں سے بالاتر ہے۔

ضمناً یہ امر بھی لائقِ توجہ ہے کہ آیت میں پہلے تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے پھر توکل کی طرف اشارہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی حمایت پرہیزگاروں کے شاملِ حال ہے۔

توجہ رہے کہ "تقویٰ"، "وقایہ" کے مادہ سے ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ اپنا بچاؤ اور فساد اور برائی سے اجتناب کرنا۔

۱۲۔ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ○

ترجمہ

۱۲۔ خدا نے بنی اسرائیل سے پیمان لیا اور ان میں سے بارہ رہبر اور سرپرست ہم نے مبعوث کیے اور خدا نے (انھیں) کہا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، میرے رسولوں پر ایمان لے آؤ اور ان کی مدد کرو اور خدا کو قرضِ حسنہ دو (اس کی راہ میں ضرورت مندوں کی مدد کرو) تو تمھارے گناہوں کو چھپا دوں گا (بخش دوں گا) اور تمھیں باغاتِ جنت میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں داخل کروں گا لیکن جو شخص اس کے بعد بھی کافر ہو جائے تو وہ راہِ راست سے منحرف ہو گیا ہے۔

تفسیر

اس سورہ کی ابتداء میں ایفائے عہد کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ مختلف طریقوں سے اس کی تکرار بھی کی گئی ہے۔ مندرجہ بالا آیت بھی اسی مناسبت سے ہے شاید یہ پے در پے سب تاکیدیں جو ایفائے عہد کے بارے میں اور پیمان شکنی کی

Marfat.com

مذمت کے لیے ہیں، پیمانِ غدیر کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ہوں جن کا ذکر آیہ ۶۷ میں آئے گا۔

زیرِ بحث آیت کی ابتداء میں ہے: ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ ہمارے احکام پر عمل کریں اور اس پیمان کے بعد ہم نے ان کے لیے بارہ رہبر اور سرپرست بھیجے تاکہ ان میں سے ہر ایک بنی اسرائیل کے بارہ گروہوں میں سے ایک ایک کی سرپرستی کرے (ولقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منھم اثنی عشر نقیبًا)۔

"نقیب" کا مادہ ہے "نقب" (بروزن "نقد") جو بڑے سوراخوں اور خصوصًا زیرِ زمین راستوں کا معنی دیتا ہے۔ کسی گروہ کے سربراہ اور رہبر کو اس لیے نقیب کہتے ہیں کہ وہ اس گروہ کے اسرار سے آگاہ ہوتا ہے گویا اس نے بیچ میں ایک نقب لگائی ہے جس کی وجہ سے وہ اس گروہ کی وضع اور حالات سے آگاہ ہوگیا ہے بعض اوقات "نقیب" ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی گروہ کا سردار نہیں ہوتا اور صرف ان کی پہچان کا ذریعہ ہوتا ہے۔ فضائل کو بھی مناقب اسی لیے کہتے ہیں کہ ان سے آگاہی بھی جستجو اور تحقیق کرکے ہی حاصل کی جاتی ہے۔

بعض مفسرین نے زیرِ بحث آیت میں "نقیب" کا معنی آگاہ اور اسرار سے مطلع ہی کیا ہے لیکن یہ بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ تاریخ و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نقبائے بنی اسرائیل میں سے ہر ایک اپنے گروہ اور قبیلے کا سرپرست تھا تفسیر روح المعانی میں ابن عباس سے منقول ہے:

انھم کانوا وزراء وصاروا انبیاء بعد ذٰلك

یعنی ——— نقبائے بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وزیر تھے جو بعد میں منصب نبوت پر فائز ہوئے۔[1]

پیغمبرِ اسلامؐ کے حالات میں مرقوم ہے کہ آپؐ نے شبِ عقبہ کو حکم دیا کہ نقبائے بنی اسرائیل کی تعداد کے مطابق اپنے میں سے بارہ نقیب منتخب کرو، مسلمان ان کی ذمہ داری بھی یہ تھی کہ اس گروہ کی رہبری کریں۔[2]

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ طرق اہل سنت سے بہت سی روایات ایسی وارد ہوئی ہیں جن میں پیغمبرِ اسلامؐ کے بارہ خلفاء اور جانشینوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ان کی تعداد کا تعارف نقبائے بنی اسرائیل کے تعداد کے حوالے سے کروایا گیا ہے۔ ان میں سے بعض روایات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ اہل سنت کے مشہور امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں مسروق سے نقل کرتے ہیں وہ کہتا ہے: میں نے عبداللہ بن مسعود سے سوال کیا کہ اس اُمت پر کتنے افراد حکومت کریں گے تو ابن مسعود نے جواب دیا:

لقد سئلنا رسول اللہ فقال اثنی عشر کعدۃ نقباء بنی اسرائیل

ہم نے پیغمبرِ خداؐ سے یہی مسئلہ پوچھا تھا، انھوں نے جواب میں فرمایا کہ بارہ افراد نقبائے بنی اسرائیل

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۶ صفحہ ۸۔

[2] سفینۃ البحار (نقب)

Marfat.com

کی تعداد کے مطابق ہے۔[1]

۲۔ تاریخ ابن عساکر میں ابن مسعود سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:

میں نے پیغمبر اسلامؐ سے سوال کیا کہ اس اُمت پر کتنے خلفاء حکومت کریں گے، تو آپؐ نے فرمایا:

ان عدة الخلفاء بعدی عدة نقباء موسٰی

میرے بعد کے خلفاء کی تعداد نقبائے موسیٰ کی تعداد کے برابر ہے۔[2]

۳۔ منتخب کنزالاعمال میں جابر بن سمرہ سے منقول ہے:

نقبائے بنی اسرائیل کی تعداد کے برابر بارہ خلفاء اس امت پر حکومت کریں گے۔[3]

ایسی حدیث ینابیع المودۃ صفحہ ۴۴۵ اور البدایہ والنہایہ جلد ۶ صفحہ ۲۴۷ پر بھی منقول ہے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل سے خدا کے وعدہ کی یوں وضاحت کرتا ہے: خدا نے ان سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور تمہاری حمایت کروں گا (وقال اللہ انی معکم) لیکن اس کے لیے چند شرائط ہیں:

۱۔ بشرطیکہ تم نماز قائم کرو (لئن اقمتم الصلٰوة)،

۲۔ اور اپنی زکوٰۃ ادا کرو (و اٰتیتم الزکٰوة)،

۳۔ میرے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور ان کی مدد کرو (و اٰمنتم برسلی وعزرتموھم)[4]

۴۔ اور اس کے علاوہ مستحب مصارف اور انفاق جو خدا کو قرضِ حسنہ دینے کے مترادف ہیں سے احتراز نہ کرو (و اقرضتم اللہ قرضًا حسنًا)

اگر اس عہد و پیمان پر عمل کرو تو میں تمہارے گزشتہ گناہ بخش دوں گا (لاکفرن عنکم سیاتکم) اور تمہیں ان باغاتِ بہشت میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں (ولادخلنکم جنّٰت تجری من تحتها الانهار) لیکن جو لوگ کفر، انکار اور عصیان کی راہ اپنائیں، مسلم ہے کہ وہ صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں (فمن کفر بعد ذلك منكم فقد ضل سواء السبیل)۔

---

[1] مسند احمد ج ۱ ص ۳۹۸ طبع مصر ۱۳۱۳

[2] فیض القدیر شرح جامع الصغیر ج ۲ ص ۴۵۹

[3] منتخب کنزالعمال درحاشیہ مسند احمد ج ۵ ص ۳۱۲

[4] "عزرتموھم" کا مادہ "تعزیر" ہے جو منع کرنے اور مدد دینے کے معنی میں ہے بعض اسلامی سزاؤں کو اسی لیے تعزیر کہتے ہیں کہ حقیقت میں وہ گنہگار کی مدد ہے اور اسے گناہ سے باز رکھنے کی تدبیر ہے یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلامی سزائیں انتقامی پہلو نہیں رکھتیں بلکہ تربیتی پہلو رکھتی ہیں اسی لیے ان کا نام تعزیر رکھا گیا ہے۔

Marfat.com

اس بارے میں کہ قرآن مجید میں انفاق کے لیے خدا کو قرض دینے کی تعبیر کیوں استعمال کی گئی ہے، ضروری وضاحت تفسیر نمونہ ج ۲ ص ۱۲۹ پر (اردو ترجمہ میں) کی جا چکی ہے۔

ایک سوال یہاں باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے کے ذکر سے کیوں مقدم کیا گیا ہے جبکہ ان پر ایمان لانا عمل سے پہلے ضروری تھا۔

بعض مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ "رسل" سے مراد یہاں پر وہ انبیاء ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے تھے نہ کہ خود حضرت موسیٰؑ۔ لہٰذا یہ حکم آئندہ سے متعلق تھا اس لیے نماز و زکوٰۃ کے بعد ہو سکتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "رسل" سے مراد نقبائے بنی اسرائیل ہی ہوں جن کے متعلق بنی اسرائیل سے عہد و وفا لیا جا چکا تھا (تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ بعض قدیم مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ نقبائے بنی اسرائیل خدا کے رسول تھے اور یہ احتمال ہماری مندرجہ بالا آیت کی تائید کرتا ہے)۔

۱۳۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○

ترجمہ

۱۳۔ پس ہم نے ان کی پیمان شکنی کے باعث انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا (یہاں تک کہ) وہ (خدا کے) کلام میں تحریف کرتے تھے اور اس کے کچھ حصے کی جو ہم نے انھیں تعلیم دی تھی، اسے انھوں نے فراموش کر دیا اور تمھیں ہر وقت ان کی کسی (نئی) خیانت کی خبر ملے گی مگر ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ (ایسا نہیں ہے) پھر بھی ان سے درگذر کرو اور صرف نظر کرو کیونکہ خدا نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں بنی اسرائیل سے خدا تعالیٰ کے پیمان لینے کا ذکر ہے۔ اب اس آیت میں ان کی پیمان شکنی اور اس کے انجام کا تذکرہ ہے، فرمایا گیا ہے: انھوں نے چونکہ اپنا عہد توڑ ڈالا لہٰذا ہم نے انھیں دھکیل کر اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا (فبما نقضھم میثاقھم لعناھم

لہ "لعن" لغت میں دھتکارنے اور دور کرنے کے معنی میں ہے اور جب یہ لفظ خدا کے حوالے سے ہو تو اس کا معنی ہے "رحمت سے محروم کرنا"

Marfat.com

وجعلنا قلوبھم قاسیۃ[1]۔

درحقیقت انھیں یہ دو سزائیں عہد شکنی کے جرم میں دی گئی ہیں وہ رحمتِ الٰہی سے بھی دور ہو گئے ہیں اور ان کے افکار و قلوب بھی پتھر ہو گئے ہیں اور میلان و انعطاف کے قابل نہیں رہے۔

اس کے بعد آثارِ قساوت کی اس طرح تشریح کی گئی ہے: وہ کلمات کی تحریف کرتے ہیں اور انھیں ان کے اصلی مقام سے بدل دیتے ہیں (یحرفون الکلم عن مواضعہ) اور جو کچھ ان سے کہا گیا تھا اس کا ایک حصہ فراموش کر دیتے ہیں (ونسوا حظا مما ذکروا بہ)۔

بعید نہیں کہ جو حصہ انھوں نے بھلا دیا وہ پیغمبرِ اسلامؐ کی نشانیاں اور آثار ہوں جن کی طرف قرآن کی دیگر آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ایک طویل عرصے تک تورات مفقود رہی پھر چند یہودی علماء نے اسے لکھا۔ فطری امر ہے کہ اس کا بہت سا حصہ تو نابود ہو گیا اور کچھ میں تحریف کر دی گئی یا فراموش ہو گیا۔ لہٰذا یہودیوں کے ہاتھ جو کچھ لگا وہ کتابِ موسیٰؑ کا کچھ حصہ تھا جس میں بہت سے خرافات ملا دیئے گئے تھے اور انھوں نے یہ حصہ بھی بھلا ڈالا۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: ہمیں ہر روز ان کی ایک نئی خیانت کا پتہ چلتا ہے ہاں البتہ ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو ان جرائم سے کنارہ کش ہے لیکن وہ اقلیت میں ہے (ولا تزال تطلع علی خائنۃ[2] منھم الا قلیلا منھم)۔

آخر میں پیغمبرِ اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان سے صرفِ نظر کریں اور چشم پوشی کریں کیونکہ خدا نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے (فاعف عنھم واصفح ان اللہ یحب المحسنین)۔ آیت کے اس حصے سے کیا یہ مراد ہے کہ اس صالح اور نیک اقلیت کے گذشتہ گناہوں سے صرفِ نظر کریں یا غیر صالح اکثریت کے گناہوں سے۔ آیت کا ظاہر دوسرے مفہوم کو تقویت دیتا ہے کیونکہ صالح اقلیت نے تو کوئی خیانت نہیں کی کہ جس سے عفو و بخشش کی جائے۔ مسلّم ہے کہ یہاں درگذر اور عفو ان تکالیف سے متعلق ہے جو انھوں نے ذاتِ پیغمبرؐ کو پہنچائی تھیں اور یہ معافی اسلام کے اہداف و اصول سے متعلق نہیں ہے کیونکہ ان میں تو معافی کا کوئی معنی نہیں۔

یہودیوں کی تحریفات

وہ تمام آیات جو قرآن مجید میں یہودیوں کی تحریفات کے بارے میں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی آسمانی کتاب میں

---

[1] لفظ "قاسیۃ" "قساوت" کے مادہ سے ہے، اور سخت پتھروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی مناسبت سے جو لوگ حقائق سے رغبت اور میلان کا کوئی اظہار نہ کریں، ان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

[2] "خائنۃ" اگرچہ اسم فاعل ہے لیکن یہاں مصدری معنی میں استعمال ہوا ہے اور "خیانت" کا معنی دیتا ہے۔ عربی ادب میں اسم فاعل مصدری معنی میں آتا رہتا ہے۔ مثلاً عافیۃ و خاطیۃ اور یہ احتمال بھی ہے کہ "خائنۃ" "گروہ" کی صفت ہو جو مقدر رہے۔

Marfat.com

کیسا کیسا تغیر و تبدل کرتے تھے۔

بعض اوقات وہ تحریفِ معنوی کا ارتکاب کرتے تھے یعنی اپنی آسمانی کتاب کی آیات کی حقیقی معانی کے خلاف تفسیر کرتے تھے الفاظ نہیں بدلتے تھے معانی بدل دیتے تھے۔

کبھی تحریف لفظی کا ارتکاب کرتے تھے۔ استہزاء و مسخرہ پن کرتے ہوئے "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" (ہم نے سنا اور اطاعت کی) کہنے کی بجائے "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" (ہم نے سنا اور مخالفت کی) کہتے تھے۔

بعض اوقات وہ آیات کا کچھ حصہ چھپا دیتے۔ جو کچھ ان کے مزاج کے مطابق ہوتا اسے ظاہر کرتے اور جو مخالف ہوتا اسے مخفی رکھتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات آسمانی کتاب سامنے ہوتے ہوئے بھی اس کے ایک حصے پر ہاتھ رکھ لیتے تھے تاکہ دوسری طرف والا غافل رہے اور اسے پڑھ نہ سکے۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۴۳ کے ذیل میں ابن صوریا کے ذکر میں آئیگا۔

کیا خدا کسی کو سنگدل بناتا ہے

زیر بحث آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ایک گروہ کی سنگدلی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے ہم جانتے ہیں کہ یہ سنگدلی اور عدم انعطاف حق سے انحراف اور گناہوں کا سرچشمہ بن جاتا ہے یہاں سوال ابھرتا ہے کہ جب اس کام کا فاعل خدا ہے تو ایسے اشخاص اپنے اعمال کے جواب دہ کیسے ہوسکتے ہیں اور کیا یہ ایک طرح سے جبر و اکراہ نہیں ؟

قرآن کی مختلف آیات، یہاں تک کہ زیر نظر آیت میں بھی غور و فکر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہت سے مواقع پر لوگ اپنے بُرے اعمال کے باعث خدا تعالیٰ کے لطف اور ہدایت سے محروم ہوجاتے ہیں درحقیقت ان کا عمل ہی ان کے فکری و اخلاقی انحراف کی بنیاد بنتا ہے اور وہ اپنے ان اعمال کے نتائج سے کسی طور بھی کنارہ کش نہیں ہوسکتے لیکن ہر سبب کا اثر چونکہ خدا کی طرف سے ہے لہٰذا قرآن میں ایسے آثار کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے۔ جیسے زیر نظر آیت میں ہے: انھوں نے چونکہ پیمان شکنی کی لہٰذا ہم نے ان کے دلوں کو سخت اور ناقابلِ انعطاف بنا دیا۔ سورۂ ابراہیم آیت ۲۷ میں ہے:

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ

اور خدا ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔

اسی طرح سورۂ توبہ آیت ۷۷ میں بعض عہد شکنی کرنے والوں کے بارے میں ہے:

فاعقبهم نفاقا فی قلوبهم الی یوم یلقونه بما اخلفوا الله ما وعدوه وبما کانوا یکذبون۔

ان کی پیمان شکنی اور جھوٹ کی وجہ سے خدا نے ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا۔

اس طرح کی تعبیرات قرآن میں بہت ہیں۔

واضح ہے کہ یہ بُرے آثار جن کا سرچشمہ خود انسان کا عمل ہے انسان کے اختیار اور ارادہ کی آزادی کے منافی ہرگز نہیں ہیں کیونکہ اس کی بنیاد خود اس نے فراہم کی ہے اور اس نے جان بوجھ کر اس وادی میں قدم رکھا ہے اور یہ اسکے اعمال کا قہری نتیجہ ہے۔

Marfat.com

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جان بوجھ کر شراب پیئے اور جب وہ مست ہو جائے اور جرائم کرنے لگے تو یہ ٹھیک ہے کہ نشے کی حالت میں وہ خود اختیاری نہیں رکھتا لیکن چونکہ اس نے اس کے اسباب خود پیدا کیے ہیں اور وہ جانتا ہے کہ نشے کی حالت میں اس سے ایسے افعال سرزد ہو سکتے ہیں لہٰذا وہ اپنے افعال کا جواب دہ ہے ...... اس طرح ایسے موقع پر اگر کہا جائے کہ چونکہ انھوں نے شراب پی ہے اور ہم نے ان کی عقل ختم کر دی ہے اور ان کے اعمال کی وجہ سے ہم نے جرائم میں مبتلا کر دیا ہے... کیا اس بات میں کوئی اشکال اور جبر کا پہلو ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ تمام ہدایتیں اور گمراہیاں جنھیں قرآن میں خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے یقیناً یہ خود انسان کے خود کردہ افعال کی وجہ سے ہے اور انھی کے باعث وہ ہدایت یا گمراہی کا استحقاق پیدا کرتا ہے ورنہ خدا کی عدالت و حکمت اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ کسی کو بلا وجہ راہِ راست کی ہدایت کرے اور دوسرے کو گمراہ کر دے[1]

۱۴۔ وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝

ترجمہ

۱۴۔ اور جو لوگ (مسیح کی دوستی اور) نصرانیت کا دعویٰ رکھتے ہیں، ان سے (بھی) ہم نے عہد و پیمان لیا، لیکن ان لوگوں نے بھی اس چیز کا ایک حصہ فراموش کر دیا جو انھیں دی گئی تھی لہٰذا ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے عداوت ڈال دی اور جو کچھ انھوں نے انجام دیا عنقریب خدا انھیں اس کے (نتائج کے) بارے میں آگاہ کرے گا۔

تفسیر

دائمی دشمن

گذشتہ آیت میں بنی اسرائیل کی عہد شکنی سے متعلق گفتگو تھی اب اس آیت میں نصاریٰ کی پیمان شکنی کا تذکرہ ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: دعوائے نصرانیت کرنے والوں کی ایک جماعت جس سے ہم نے عہد وفا لیا تھا پیمان شکنی کی مرتکب ہوئی

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اوّل صفہ ۱۴۱ (اردو ترجمہ) میں اس بارے میں مزید توضیح کی جا چکی ہے۔

Marfat.com

انھیں جو احکام دیئے گئے تھے ان کا ایک حصہ انھوں نے فراموش کردیا (ومن الذین قالوا انا نصٰری اخذنا میثاقھم فنسوا حظا مما ذکروا بہ)۔
ہاں انھوں نے بھی خدا سے پیمان باندھا تھا کہ وہ حقیقت توحید سے منحرف نہیں ہوں گے اور احکام الٰہی کو فراموش نہیں کریں گے اور آخری پیغمبر کی نشانیاں نہیں چھپائیں گے لیکن انھوں نے بھی یہودیوں کا سا طرز عمل اختیار کرلیا فرق یہاں یہ ہے کہ قرآن یہودیوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کی قلیل تعداد پاک اور حق شناس تھی لیکن نصاریٰ کے بارے میں کہتا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ منحرف ہوگیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ عیسائیوں کی نسبت یہودیوں میں سے منحرف ہونے والے زیادہ تھے۔
موجودہ اناجیل کی تاریخ کہتی ہے کہ یہ ساری انجیلیں حضرت مسیحؑ کے کئی سال بعد بعض عیسائیوں نے لکھی تھیں یہی وجہ ہے کہ ان میں واضح تناقضات موجود ہیں۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ انجیل کی آیات کا ایک اہم حصہ بھول چکے تھے موجودہ اناجیل میں واضح طور پر خرافات موجود ہیں مثلاً حضرت مسیحؑ کی شراب خوری[1] کا ذکر ہے جو کہ عقل کے بھی خلاف ہے اور خود موجودہ تورات وانجیل کی بعض آیات کے بھی خلاف ہے۔ اسی طرح مریم مجدلیہ کا قصہ بھی ہے[2]
ضمناً توجہ رہے کہ "نصاریٰ" "نصرانی" کی جمع ہے، عیسائیوں کو اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا ہے اس سلسلے میں مختلف احتمالات پیش کیے جاتے ہیں:
پہلا یہ کہ حضرت عیسیٰؑ نے بچپن ناصرہ شہر میں گزارا۔
دوسرا یہ کہ لفظ نصران سے لیا گیا ہو یہ ایک بستی کا نام ہے جس سے نصاریٰ خاص لگاؤ رکھتے تھے۔
تیسرا یہ کہ جب حضرت مسیحؑ نے لوگوں میں سے یار و انصار طلب کیے تو انھوں نے آپ کی دعوت قبول کرلی جیسا کہ قرآن میں ہے:

کما قال عیسی ابن مریم للحواریین من انصاری الی اللہ قال الحواریون نحن انصار اللہ

جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کے لیے میری نصرت کرنے والا ہوگا، تو حواریوں نے کہا کہ ہم انصارِ خدا ہیں۔ (صف ..... ۱۴)

چونکہ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو اپنے کہنے کے مطابق عمل نہ کرتے تھے اور صرف دعویٰ کی حد تک حضرت عیسیٰؑ کے یار و انصار تھے لہٰذا قرآن زیر بحث آیت میں کہتا ہے ومن الذین قالوا انا نصٰری (ان لوگوں میں سے جو کہتے تھے کہ ہم عیسیٰ کے مددگار ہیں لیکن وہ اس دعویٰ میں سچے نہ تھے)۔
اس کے بعد قرآن عیسائیوں کے اعمال کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کے اعمال کے نتیجے میں ہم نے قیامت تک کے لیے

---

[1] انجیل یوحنا، باب ۲، جملہ ۲ تا ۱۲
[2] انجیل لوقا، باب ۷، جملہ ۳۶ تا ۴۷

Marfat.com

ان میں دشمنی ڈال دی (فاغرینا بینھم العداوۃ والبغضاء الیٰ یوم القیٰمۃ)۔

ان کے لیے دوسری سزا کہ جس کی طرف آیت کے آخری حصے میں اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ: عنقریب خدا انھیں ان کے اعمال کے نتائج کی خبر دے گا اور وہ عملی طور پر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے (وسوف ینبئھم اللہ بما کانوا یصنعون)۔

چند اہم نکات

۱۔ "اَغرینا" کا مفہوم: یہ لفظ "اغراء" کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے کسی چیز سے چمٹا دینا اور جوڑ دینا۔ بعد ازاں کسی کام کا شوق دلانے اور اس پر اکسانے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا کیونکہ یہ بات لوگوں کے معین اسباب سے مربوط ہونے کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ نصاریٰ کی عہد شکنی اور غلط کاریاں اس بات کا سبب بنیں کہ ان میں عداوت و دشمنی اور نفاق و اختلاف پیدا کر دیا جائے (کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اسباب تکوینی کے آثار کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے) آج بھی عیسائی حکومتوں کے درمیان بے شمار کشمکشیں موجود ہیں جن کی بنا پر اب تک دو عالمی جنگیں ہو چکی ہیں ان میں گروہ بندیاں اور عداوت و دشمنی آج بھی جاری و ساری ہے۔ علاوہ ازیں عیسائیوں کے مختلف مذاہب میں اختلافات اور عداوتیں اس قدر ہیں کہ آج بھی وہ ایک دوسرے کا کشت و خون جاری رکھے ہوئے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہاں مراد یہود و نصاریٰ کے درمیان دشمنی ہے جو رہتی دنیا تک جاری رہے گی لیکن آیت کا ظاہری مفہوم عیسائیوں کے مابین عداوت ہی کی تائید کرتا ہے[۱]

شاید اس بات کی یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ یہ دردناک انجام عیسائیوں ہی میں منحصر نہیں اگر مسلمان ان کا طریقہ اپنائیں گے تو وہ بھی اس نتیجے سے دوچار ہوں گے۔

۲۔ "عداوت" اور "بغضاء" کا مفہوم: "عداوت" "عدو" کے مادہ سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے، اور "بغضاء" "بغض" کے مادہ سے کسی چیز سے نفرت کرنے کے معنی میں ہے۔ ممکن ہے ان دونوں الفاظ میں یہ فرق ہو کہ "بغض" زیادہ تر قلبی پہلو رکھتا ہے جب کہ "عداوت" عملی پہلو رکھتی ہے یا کم از کم عملی اور قلبی دونوں پہلو رکھتی ہے۔

۳۔ کیا یہودیت اور عیسائیت ہمیشہ موجود رہیں گی؟: زیر بحث آیت میں یوں لگتا ہے جیسے نصاریٰ ایک مذہب کے پیروکار ہونے کے حوالے سے (یا یہود و نصاریٰ دونوں) رہتی دنیا تک موجود رہیں گے۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی روایات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مہدیؑ کے ظہور کے بعد پورے عالم میں ایک سے زیادہ دین نہیں ہوگا اور وہ دین اسلام ہے تو ان دو باتوں کو کیسے جمع کیا جا سکتا ہے۔

---

[۱] اس بنا پر "بینھم" کی ضمیر نصاریٰ کی طرف ہی لوٹے گی کہ جن کا ذکر آیت کی ابتداء میں ہو چکا ہے۔

Marfat.com

اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ عیسائیت (یا عیسائیت اور یہودیت) ایک بہت ہی کمزور اقلیت کے طور پر حضرت مہدیؑ کے دور میں بھی باقی رہ جائے کیونکہ یہ بات تو واضح ہے کہ اس دور میں بھی انسانوں سے ارادہ کی آزادی نہیں چھینی جائے گی اگرچہ دنیا کی قطعی اکثریت دین حق کو پالے گی اور اسے قبول کرے گی۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ پوری دنیا پر ایک اسلامی حکومت ہی ہوگی۔

۱۵۔ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۭ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝

۱۶۔ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

ترجمہ

۱۵۔ اے اہل کتاب! تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو آسمانی کتاب کے ان بہت سے حقائق کو واضح کرے گا جنھیں تم چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں سے (جن کی عملاً ضرورت نہیں) صرف نظر کرلے گا۔ خدا کی طرف سے تمھارے پاس نور اور واضح کتاب آئی ہے۔

۱۶۔ جو لوگ اس کی خوشنودی کی پیروی کرتے ہیں خدا انھیں سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرے گا اور اپنے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر انھیں روشنی میں لیجائے گا اور انھیں راہ راست کی ہدایت کرے گا۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں یہود و نصاریٰ اور ان کی عہد شکنیوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب ان آیات میں ان سے بلا واسطہ خطاب کے ذریعے انھیں اس اسلام کی طرف دعوت دی گئی ہے جس نے اُن کے آسمانی دین کو خرافات سے پاک کیا اور انھیں اس راہ راست کی ہدایت کی جارہی ہے جو ہر قسم کے انحراف اور کجروی سے دُور ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اے اہل کتاب! ہمارا بھیجا ہوا تمھاری طرف آیا ہے تاکہ آسمانی کُتب کے وہ بہت سے حقائق آشکار

Marfat.com

کرے جنھیں تم نے چھپا رکھا تھا جبکہ بہت سی ایسی چیزیں جنھیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں اور جو گذشتہ ادوار سے مربوط ہیں ان سے صرف نظر کرے (یٰاهل الکتٰب قد جاءکم رسولنا یبین لکم کثیرًا مما کنتم تخفون من الکتاب ویعفوا عن کثیر)۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے بہت سے حقائق چھپا رکھے تھے لیکن پیغمبر اسلام نے صرف وہ باتیں بیان کیں جن کی اس وقت لوگوں کو احتیاج تھی۔ مثلاً حقیقت توحید، انبیاء کی طرف ناروا نسبتیں جو کتب عہدین میں ان کی طرف دی گئی تھیں، سود اور شراب کی حرمت اور اس طرح کے دیگر امور لیکن ان امور سے صرف نظر کر لیا جن کا تعلق گذشتہ امتوں اور زمانوں سے تھا اور موجودہ اقوام کے لیے انکے بیان کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

اس کے بعد قرآن مجید کی نصیحت وعظمت اور نوع بشر کی ہدایت و تربیت کے لیے اس کے گہرے اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ خدا کی جانب سے تمہارے پاس نور اور واضح کتاب آئی ہے (قد جاءکم من الله نور و کتاب مبین) وہ نور آیا ہے کہ جس کے ذریعے خدا ان لوگوں کو سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے جو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے درپے ہیں (یهدی به الله من اتبع رضوانه سبل السلام) علاوہ ازیں انھیں طرح طرح کی ظلمتوں یعنی شرک، جہالت، پراگندگی اور نفاق جیسی تاریکیوں سے توحید، علم اور اتحاد کے نور کی طرف رہبری کرتا ہے (ویخرجهم من الظلمات الی النور باذنه)۔ نیز انھیں اس جادۂ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے جس میں اعتقاد اور عملی پروگرام کے حوالے سے کوئی کجی اور خامی نہیں ہے (ویهدیهم الی صراط مستقیم)۔

پہلی آیت میں نور سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد پیغمبر اسلام کی ذات ہے اور بعض کے نزدیک قرآن مجید۔ قرآن مجید کی مختلف آیات میں قرآن کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے یہ بات اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ زیر نظر آیت میں نور سے مراد قرآن حکیم ہی ہے۔ اس بناء پر "کتاب مبین" اس پر عطف توضیحی ہے۔ سورہ اعراف آیت ۱۵۷ میں ہے:

فالذین اٰمنوا به وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذی انزل معه اولئك هم المفلحون۔

وہ لوگ جو پیغمبر پر ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے ان کی عظمت کو تسلیم کر لیا ہے اور ان کی مدد کی ہے اور اس نور کی پیروی کی ہے جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے، اہل نجات اور کامیاب ہیں۔

سورۂ تغابن آیہ ۸ میں ہے:

فاٰمنوا بالله ورسله والنور الذی انزلنا

خدا، اس کے پیغمبر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے، ایمان لے آؤ۔

اسی طرح متعدد دیگر آیات بھی ہیں لیکن لفظ نور کا اطلاق پیغمبر اسلام کی ذات پر قرآن میں نظر نہیں آتا۔

Marfat.com

علاوہ ازیں بعد والی آیت میں " بہ " کی ضمیر مفرد ہے اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ نور اور کتاب مبین ایک ہی حقیقت ہیں۔

البتہ متعدد روایات میں نور سے امیرالمومنینؑ یا تمام آئمہ اہلِ بیتؑ مراد لیے گئے ہیں لیکن واضح ہے کہ یہ آیات کے مختلف بطون کے حوالے سے ایک بطن کی تفسیر کی طرح ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے ظاہری معانی کے علاوہ کچھ باطنی مفاہیم بھی ہیں جنھیں "بطونِ قرآن" کہا جاتا ہے یہ جو ہم نے کہا ہے کہ واضح ہے کہ یہ تفسیر بطون قرآن سے مربوط ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت آئمہ موجود نہیں تھے کہ اہلِ کتاب کو ان پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ دوسری آیت رضائے الٰہی کے حصول کے لیے قدم بڑھانے والوں کو نوید سناتی ہے کہ قرآن کے سائے میں انھیں تین عظیم نعمتیں دی جائیں گی۔

پہلی نعمت سلامتی کی شاہراہ کی ہدایت ہے..... یہ سلامتی درحقیقت، فرد، معاشرے، روح، خاندان اور اخلاق کی سلامتی ہے (اور یہ سلامتی عملی پہلو رکھتی ہے)۔

دوسری نعمت کفر اور بے دینی کی ظلمتوں سے نکال کر نورِ ایمان کی طرف لے جانا ہے (یہ اعتقادی پہلو رکھتی ہے)۔

تیسری نعمت ان تمام چیزوں کو مختصر ترین اور نزدیک ترین راستے سے انجام دینا ہے، جسے "صراط مستقیم" کہتے ہیں۔

لیکن یہ سب نعمتیں ان لوگوں کو نصیب ہوں گی جو تسلیم اور حق گوئی کے دروازہ سے داخل ہوں گے اور "من اتبع رضوانہ" کے مصداق ہوں گے۔ منافقین اور ہٹ دھرم افراد جو حق سے دشمنی رکھتے ہیں انھیں اس سے کوئی فائدہ نصیب نہیں ہوگا، جیسا کہ قرآن کی دیگر آیات گواہی دیتی ہیں۔

نیز ان سب آثار کا سرچشمہ خدا کا حتمی ارادہ ہے جس کی طرف لفظ "باذنہ" سے اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۷۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○

ترجمہ

۱۷۔ یقیناً جنھوں نے کہا کہ مسیح بن مریم خدا ہے وہ کافر ہوگئے ہیں، کہہ دو اگر خدا چاہے کہ مسیح بن مریم، اس کی

Marfat.com

ماں اور روئے زمین پر موجود تمام لوگوں کو ہلاک کردے تو اسے کون روک سکتا ہے (ہاں) آسمانوں زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان کی حکومت خدا ہی کے لیے ہے جو وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

کیسے ممکن ہے کہ مسیحؑ خدا ہو؟

گذشتہ مباحث کی تکمیل کے لیے اس آیت میں حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے دعویٰ پر شدید حملہ کیا گیا ہے اور اسے ایک واضح کفر قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ امر مسلّم ہے کہ جن لوگوں نے کہا ہے کہ مسیح بن مریم خدا ہے وہ کافر ہو گئے ہیں اور درحقیقت انھوں نے خدا کا انکار کیا ہے (لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم)۔

اس جملے کا مفہوم واضح ہونے کے لیے ہمیں جاننا چاہیے کہ عیسائی خدا کے بارے میں بے بنیاد دعوے کرتے ہیں۔

پہلا وہ تین خداؤں کا عقیدہ رکھتے ہیں جسے سورۂ نساء کی آیہ ۱۷۰ میں باطل قرار دیا گیا ہے:

لا تقولوا ثلاثۃ انتھوا خیراً لکم انما اللہ الٰہ واحد

یعنی ــــــ یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں، اس عقیدے سے باز آجاؤ، یہی تمھارے حق میں بہتر ہے، معبود تو فقط تنہا خدا ہے [1]

دوسرے وہ عالم ہستی پیدا کرنے والے کو ان تین میں سے ایک خدا شمار کرتے ہیں اور اسے "باپ خدا" [2] کہتے ہیں۔ سورہ مائدہ ۷۲ میں قرآن مجید نے اس عقیدے کو بھی باطل قرار دیا ہے:

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثۃ وما من الٰہ الا الٰہ واحد

---

[1] اس آیت کی تفسیر اس جلد کی ابتداء میں گذر چکی ہے۔

[2] عیسائی کتب میں ہے:

باپ خدا بیٹے کے واسطے سے پوری کائنات کا خالق ہے (قاموس کتاب مقدس ص ۳۴۵)

نیز یہ بھی ہے:

خدا یعنی جو خود بخود وجود میں آیا تمام مخلوقات کے خالق اور ساری کائنات کے مالک کا نام ہے اور وہ ایک لامتناہی اور ازلی روح ہے جو اپنے وجود، حکمت، قدرت اور عدالت میں انواع مختلف کے ساتھ ایسا ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں ہے۔

(قاموس کتاب مقدس صفحہ ۳۴۴)

Marfat.com

یعنی ــــــ کافر کہتے ہیں کہ خدا تین میں سے تیسرا ہے۔ جب کہ ایک اکیلے معبود کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔[1]

تیسرا ــــــ وہ کہتے ہیں کہ تینوں خدا تعدد حقیقی کے باوجود ایک ہیں اس عقیدے کو وہ "وحدت در تثلیث" بھی کہتے ہیں اس بات کی طرف زیر نظر آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا مسیح بن مریم ہے اور مسیح بن مریم خدا ہے اور دونوں روح القدس سے مل کر تین متعدد ذاتیں ہونے کے باوجود ایک ہیں۔

سہ گانہ تثلیث کے تمام پہلو جن میں سے ہر ایک مسیائیت کا عظیم ترین انحراف ہے، قرآن کی ایک ہی آیت میں باطل قرار دیئے گئے ہیں۔

عقیدہ تثلیث کے بطلان کے بارے میں تفصیلی وضاحت اسی جلد میں سورۂ نساء کی آیہ ۱۷۱ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

ہم نے جو کچھ مندرجہ بالا سطور میں کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فخرالدین رازی اور بعض دیگر مفسرین کو اس آیت کے سمجھنے میں یہ جو اشکال ہوا ہے کہ کوئی عیسائی بھی صراحت سے خدا اور مسیح کے اتحاد کے عقیدہ کا اظہار نہیں کرتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں مسیحیت کی کتب پر کافی احاطہ نہیں ہے کیونکہ موجودہ عیسائی کتب میں "وحدت در تثلیث" کا مسئلہ بالوضاحت پیش کیا گیا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی کتابیں اس زمانے میں ان مفسرین کے ہاتھ نہ لگی ہوں۔

اس کے بعد عقیدہ الوہیت کے بطلان کے لیے قرآن کہتا ہے: اگر خدا چاہے کہ مسیح، اس کی والدہ اور زمین میں بسنے والے تمام لوگوں کو ہلاک کر دے تو کون اسے روک سکتا ہے (قل فمن یملک من اللہ شیئاً ان اراد ان یھلک المسیح ابن مریم وامہ ومن فی الارض جمیعاً)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ مریم دیگر انسانوں کی طرح انسان ہونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس بنا پر مخلوق ہونے کے لحاظ سے وہ دیگر مخلوقات کی طرح ہیں لہٰذا نابودی ان کے لیے بھی ہے اور وہ چیز جس کے لیے نیستی کا تصور ہو سکے کس طرح ممکن ہے کہ وہ ازلی و ابدی خدا ہو۔

دوسرے لفظوں میں اگر مسیحؑ خدا ہو تو خالق کائنات اسے ہلاک نہیں کر سکتا اور اس طرح اس کی قدرت محدود ہو جائے گی اور ایسی ہستی خدا نہیں ہو سکتی کیونکہ خدا کی قدرت اس کی ذات کی طرح غیر محدود ہے (غور کیجیے گا)۔

آیت میں "مسیح بن مریم" کے الفاظ کا تکرار ہے شاید یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ تم خود معترف ہو کہ مسیحؑ مریم کے فرزند تھے اور وہ ماں کے بطن سے پیدا ہوئے ان پر ایک مرحلہ حالتِ جنین کا گذرا، پھر وہ نوزائیدہ بچے کی حالت میں رہے اور انھوں نے تدریجاً پرورش پائی اور بڑے ہوئے تو کیا یہ ممکن ہے کہ خدا ایک چھوٹے سے محیط مثلاً شکم مادر میں رہے اور اس میں یہ تمام تغیرات اور تحویلات پیدا ہوں نیز جنین اور شیر خوارگی کے عالم میں وہ ماں کا محتاج ہو۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے ذکر کے ساتھ خصوصیت سے ان کی والدہ کے نام کے ساتھ لفظ

---

[1] اس کی تفسیر انشاء اللہ عنقریب آئے گی۔

Marfat.com

"وامہ" آیا ہے یوں مادرِ عیسٰیؑ کو دنیا کے دیگر لوگوں سے ممتاز کیا گیا ہے، ممکن ہے یہ تعبیر اس بنا پر ہو کہ عیسائی پوجا پاٹ کے وقت ان کی والدہ کی پرستش بھی کرتے ہیں اور اس وقت کے کلیساؤں میں دیگر مجسموں کے علاوہ جناب مریم کا مجسمہ بھی ہوتا ہے جس کی وہ تعظیم اور پرستش کرتے ہیں۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۶ میں بھی اس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

واذ قال اللہ یا عیسی بن مریم أانت قلت للناس اتخذونی وامی الٰھین من دون اللہ

روز قیامت جب خدا کہے گا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر میری اور میری والدہ کی پرستش کرو۔

جو لوگ بغیر باپ کے پیدا ہونے کو مسیحؑ کی الوہیت کی دلیل سمجھتے ہیں، آیت کے آخر میں انھیں جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ سب خدا کے قبضہ قدرت میں ہے وہ جیسی مخلوق چاہے پیدا کرتا ہے (وہ چاہے تو کسی کو بغیر ماں باپ کے پیدا کرے جیسے اس نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا، وہ چاہے تو ماں باپ کے توسط سے پیدا کرے جیسے عام انسانوں کو پیدا کرتا ہے اور وہ چاہے تو کسی کو صرف ماں کے توسط سے پیدا کرے جیسے اس نے حضرت مسیحؑ کو پیدا کیا ہے خلقت کا یہ تنوع کسی اور چیز کا نہیں بلکہ اس کی قدرت کی دلیل ہے) اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (و للہ ملک السمٰوٰت والارض و بینھما یخلق ما یشاء واللہ علی کل شیء قدیر)۔

۱۸۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○

ترجمہ

۱۸۔ یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ ہم خدا کے بیٹے ہیں اور اس کے (خاص) دوست ہیں (ان سے) کہہ دو کہ پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے بلکہ تم اس کی مخلوقات میں سے انسان ہو وہ جسے چاہتا ہے (اور اہل پاتا ہے) اسے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) اسے سزا دیتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب اس کے لیے ہے اور تمام موجودات کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

Marfat.com

تفسیر

اس آیت میں گذشتہ مباحث کی تکمیل کی گئی ہے، یہود و نصاریٰ کی بے بنیاد دعووں اور موہوم امتیازات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں (و قالت الیھود والنصٰرٰی نحن ابناء اللہ و احباءہ)۔

وہ اپنے بارے میں صرف اسی امتیاز کے قائل نہیں بلکہ آیات قرآنی میں بارہا ان کے اس قسم کے دعووں کا ذکر کیا گیا ہے سورۂ بقرہ آیت ۱۱۱ میں ان کے دعوے کا بھی ذکر ہے کہ ان کے علاوہ کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا اور یہ کہ جنت یہود و نصاریٰ ہی سے مخصوص ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۸۰ میں یہودیوں کے اس دعویٰ کا ذکر کیا گیا ہے کہ جہنم کی آگ چند دن کے سوا ان تک نہیں پہنچے گی۔ اس دعویٰ کے ذکر کے بعد ان کی سرزنش کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ان کے اس موہوم دعویٰ کا تذکرہ ہے کہ وہ خدا کے بیٹے اور خاص دوست ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا حقیقی بیٹا نہیں سمجھتے تھے عیسائی صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا حقیقی بیٹا سمجھتے ہیں اور بالتصریح اپنے اس عقیدے کا اظہار کرتے ہیں[1]۔ وہ یہ بات اپنے لیے اس مفہوم میں استعمال کرتے تھے کہ وہ خدا سے خاص ربط رکھتے ہیں اور جو شخص بھی ان کی نسل میں سے ہے یا ان کے گروہ میں داخل ہو جاتا ہے وہ اعمال صالح کے بغیر خود بخود خدا کے دوستوں اور فرزندوں میں شمار ہو جاتا ہے[2]۔

ہم جانتے ہیں کہ قرآن ان تمام موہوم امتیازات سے جنگ کرتا ہے اور ہر شخص کا امتیاز صرف ایمان، عمل صالح اور اس کی پرہیزگاری ہی سمجھتا ہے اسی لیے زیر نظر آیت میں اس دعویٰ کے بطلان کے لیے فرمایا گیا ہے: ان سے کہیے کہ اگر ایسا ہے تو پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے (قل فلم یعذ بکم بذ نو بکم)۔

یعنی تم خود اعتراف کرتے ہو کہ تمھیں تھوڑی سی مدّت کے لیے سزا دے گا گناہ گاروں والی جو یہ سزا تمھیں ملے گی اس بات کی دلیل ہے کہ تمھارا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ تم خدا سے کوئی خاص تعلق رکھتے ہو بلکہ اپنے آپ کو خدا کا بیٹا شمار کرتے ہو۔ علاوہ ازیں تمھاری تاریخ شاہد ہے کہ خود اسی دنیا میں تم کئی سزاؤں اور عذابوں میں مبتلا ہوئے ہو۔ یہ تمھارے دعویٰ کے بطلان پر

---

[1] کتب عیسائیت کہتی ہیں:

"خدا کا بیٹا"...... یہ لفظ ہمارے منجی (نجات دینے والے) اور فادی (فدیہ بننے والے) کا ایک لقب ہے جو کسی دوسرے پر نہیں بولا جا سکتا مگر ایسے مقام پر کہ قرآن سے معلوم ہو کہ مقصد خدا کا حقیقی بیٹا نہیں۔

(قاموس کتاب مقدس صفحہ ۲۴۵)

[2] کچھ عرصہ ہوا ہمارے علاقے میں کچھ افراد نے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے خاص تبلیغات شروع کر رکھی تھیں اور وہ اپنے آپ کو "خدا کے بیٹے" کہتے تھے

Marfat.com

دوسری دلیل ہے۔

اس مفہوم کی تاکید کے لیے مزید ارشاد ہوتا ہے: تم مخلوقاتِ خدا میں سے دیگر انسانوں جیسے انسان ہو (بل انتم بشر ممن خلق) یہ سب کے لیے قانونِ عام ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (اور مستحق پاتا ہے) سزا دیتا ہے (یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء)۔

• علاوہ ازیں سب خدا کی مخلوق، اس کے بندے اور مملوک ہیں لہٰذا کسی کو خدا کا بیٹا کہنا منطقی اور اصولی بات نہیں ہے (وللہ ملک السمٰوٰت والارض وما بینھما) اور آخر کار ساری مخلوق نے اسی کی طرف لوٹ جانا ہے (والیہ المصیر)۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے کہاں "خدا کے بیٹے" ہونے کا دعویٰ کیا ہے (چاہے یہاں بیٹا حقیقی میں نہیں مجازی معنی میں ہی ہو)؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موجودہ اناجیل میں یہ بات بارہا دکھائی دیتی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ انجیل یوحنا باب ۸ جملہ ۴۱ کے بعد یہ بات درج کی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہودیوں سے کہا:

"تم اپنے باپ والے کام کرتے ہو۔"

یہودیوں نے جواب دیا:

ہم زنا سے پیدا نہیں ہوئے، ہمارا ایک باپ ہے جو کہ خدا ہے۔

عیسیٰ نے ان سے کہا:

اگر خدا تمھارا باپ ہوتا تو تم مجھے دوست رکھتے۔

روایاتِ اسلامی میں بھی ابنِ عباس سے ایک حدیث مروی ہے:

> پیغمبرِ اسلام نے یہودیوں کی ایک جماعت کو دینِ اسلام کی دعوت دی اور انھیں خدا کے عذاب سے ڈرایا تو وہ کہنے لگے تم ہمیں خدا کے عذاب سے کیسے ڈراتے ہو جب کہ ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔[1]

تفسیر مجمع البیان میں زیرِ بحث آیت کے ذیل میں اس حدیث سے ملتی جلتی ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ:

> پیغمبرِ خدا نے خدا کے عذاب سے ڈرایا تو ایک گروہ کہنے لگا کہ ہمیں تہدید نہ کرو اور نہ ڈراؤ کیونکہ ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں اگر وہ ہم پر ناراض بھی ہو تو اس کی یہ ناراضگی ایسی ہے جیسے کوئی انسان اپنے بیٹے پر ناراض ہوتا ہے (یعنی بہت جلد اس کا یہ غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے)۔

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی جلد ۱۱ صفحہ ۱۹۲

Marfat.com

۱۹۔ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ عَلٰى فَتۡرَةٍ
مِّنَ الرُّسُلِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِيۡرٍ وَّلَا نَذِيۡرٍ
فَقَدۡ جَآءَكُمۡ بَشِيۡرٌ وَّنَذِيۡرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ
قَدِيۡرٌ ۝

ترجمہ

۱۹۔ اے اہلِ کتاب! ہمارا رسول تمھاری طرف آگیا ہے اور وہ پیغمبروں کے درمیانی عرصے اور فاصلے کے بعد تمھارے لیے حقائق بیان کرتا ہے کہ مبادا (روزِ قیامت) کہو کہ ہمارے پاس نہ بشارت دینے والا آیا ہے نہ ڈرانے والا (لہٰذا اب) بشارت دینے والا اور ڈرانے والا (پیغمبر) تمھارے پاس آگیا ہے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں پھر روئے سخن اہلِ کتاب کی طرف ہے: اے اہلِ کتاب! اے یہود و نصاریٰ! ہمارا پیغمبر تمھاری طرف آیا ہے اور اس دور میں جب کہ انبیاء الٰہی کے درمیان فاصلہ اور وقفہ ہوچکا ہے اس نے تمھارے سامنے حقائق بیان کیے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ خدا کی طرف سے ہماری طرف کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا (یاھل الکتب قد جاءکم رسولنا یبین لکم علی فترۃ من الرسل ان تقولوا ما جاءنا من بشیر ولا نذیر)۔

"بشیر" اور "نذیر" یعنی پیغمبر اسلام جنھوں نے صاحبِ ایمان اور نیک افراد کو خدا کی رحمت و جزا کی بشارت دی اور بے ایمان، گنہگار اور آلودہ افراد کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا ایسا پیغمبر تمھاری طرف آگیا ہے (فقد جاءکم بشیر ونذیر)۔

"فترت" دراصل سکون و اطمینان کے معنی میں ہے۔ دو حرکات، دو کوششوں اور دو انقلابات کے درمیانی فاصلے کو بھی "فترت" کہتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ کے درمیان انبیاء مرسلین موجود تھے لیکن حضرت مسیحؑ اور پیغمبر اسلامؐ کے درمیان یہ صورت نہیں تھی قرآن نے اس دور کا نام "فترتِ رسل" رکھا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور بعثتِ پیغمبرؐ کے درمیان

Marfat.com

تقریباً چھ سو سال کا فاصلہ تھا[1] لیکن جس طرف قرآن نے (سورۂ یٰس آیہ ۱۴ میں) اشارہ کیا ہے اور مفسرین اسلام کے قول کے مطابق ان دو پیغمبروں کے درمیانی عرصے میں کم از کم تین رسول آئے ہیں اور بعض ان کی تعداد چار سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ان رسولوں کی وفات اور رسولِ اسلامؐ کے درمیان فاصلہ تھا اسی لیے قرآن نے اس عرصے کو "فترت" قرار دیا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے اس مقام پر کہا جائے کہ ہمارے عقیدے کے مطابق تو انسانی معاشرہ ایک لحظہ کے لیے بھی خدائی نمائندے اور اس کے بھیجے ہوئے افراد سے خالی نہیں ہو سکتا لہٰذا "فترت" کا ایسا دور کیونکر ہو سکتا ہے۔

توجہ رہے کہ قرآن کہتا ہے: "علی فترة من الرسل ......" یعنی اس دور میں رسول نہیں تھا۔ یہ بات اس کے خلاف نہیں کہ اس دور میں اوصیاء موجود ہوں۔

بہتر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ "رسول" ان ہستیوں کو کہتے ہیں جو وسیع و عریض تبلیغات پر مامور تھے۔ لوگوں کو بشارتیں اور نذارتیں دیتے تھے، معاشروں کا سکوت توڑتے تھے اور اپنی آواز تمام لوگوں کے کانوں تک پہنچاتے تھے۔ لیکن سب کے سب اوصیاء ایسی ماموریت اور ذمہ داری نہ رکھتے تھے یہاں تک کہ ممکن ہے وہ بعض اجتماعی عوامل کی وجہ سے پوشیدہ طور پر لوگوں میں زندگی گزارتے ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں ایک بیان میں فرماتے ہیں۔

اللهم بلى لا تخلوا الارض من قائم لله بحجة اما ظاهرًا مشهورًا او خائفا مغمورًا لئلا تبطل حجج الله و بيناته يحفظ الله بهم حججه و بيناته حتى يودعوها نظرائهم و يزرعوها في قلوب اشباههم

ہاں روئے زمین ایسے شخص کے وجود سے ہرگز خالی نہیں ہوتی جو حجتِ خدا کے ساتھ قیام کرے، وہ آشکار اور مشہور ہو یا مخفی اور نہ پہچانا ہو تاکہ خدائی احکام، دلائل اور نشانیاں ختم نہ ہو جائیں (اور وہ انھیں تحریف اور دستبرد سے محفوظ رکھیں) خدا ان کے ذریعے اپنے دلائل اور نشانیوں کی حفاظت کرتا ہے تاکہ وہ انھیں اپنے جیسے افراد تک پہنچا دیں، آہستہ آہستہ خرافات، شیطانی وسوسے، تحریفات اور تعلیماتِ الٰہی سے بے خبری پھیلتی رہے گی ایسے میں ممکن ہے کچھ لوگ ذمہ داریوں سے فرار کیلئے ایسی صورت کو بہانہ بنائیں تو اس صورت میں خدا آسمانی جوانمردوں کے ذریعے اس بہلنے کو منقطع کر دیتا ہے[2]۔

---

[1] بعض لوگ ان دو عظیم پیغمبروں کے درمیانی عرصے کو چھ سو سال سے کم سمجھتے اور بعض زیادہ۔ کچھ کے بقول حضرت مسیحؑ کی ولادت اور پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت کے درمیان رومی سالوں کے حساب سے چھ سو اکیس سال اور ایک سو پچانوے دن کا فاصلہ ہے

(تفسیر ابوالفتوح رازی ج ۴ ص۱۵۱ کے حاشیہ پر مرحوم شعرانی کی تحریر)

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۱۴۷

Marfat.com

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (و اللہ علی کل شیء قدیر)
یعنی پیغمبروں کو بھیجنا اور ان کے جانشینوں کو دعوتِ حق کی نشر و اشاعت کے لیے بھیجنا اس کی قدرت کے سامنے
آسان سا کام ہے ۔

۲۰۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ
يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○

۲۱۔ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا
تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ○

۲۲۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا
حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ○

۲۳۔ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ
الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

۲۴۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ
وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ○

۲۵۔ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ
الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○

۲۶۔ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ
فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○ۧ

Marfat.com

ترجمہ

۲۰۔ وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے قوم! تم پر خدا نے جو نعمت کی ہے اسے یاد رکھو، جب اس نے تمھارے درمیان انبیاء مقرر کیے (اور فرعونی استعمار کی زنجیر توڑ دی) اور تمھیں خود اپنا مختار بنا دیا اور تمھیں ایسی کئی چیزیں بخشیں جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دیں۔

۲۱۔ اے قوم! سرزمینِ مقدس میں داخل ہو جاؤ جسے خدا نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے اور اپنے پچھلے پاؤں نہ لوٹ جاؤ (اور پیچھے نہ ہٹو) کہ خسارے میں رہو گے۔

۲۲۔ وہ کہنے لگے، اے موسیٰ! اس سرزمین میں ظالم رہتے ہیں جب تک وہ نہ نکل جائیں ہم اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے، وہ نکل جائیں تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔

۲۳۔ ان لوگوں میں سے دو شخص جو خدا سے ڈرتے تھے اور خدا نے (عقل، ایمان اور شجاعت کی صورت میں) انھیں اپنی نعمت سے نوازا تھا کہنے لگے، ان کے شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ، جب تم داخل ہو گئے تو کامیاب ہو جاؤ گے اور خدا پر توکل کرو اگر ایمان رکھتے ہو۔

۲۴۔ بنی اسرائیل کہنے لگے، اے موسیٰ! جب تک وہ اس میں ہیں ہم ہرگز وہاں نہیں جائیں گے تو اور تیرا پروردگار جائے اور (ان سے) جنگ کرے، ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔

۲۵۔ موسیٰ نے کہا، پروردگارا! میرا تو بس اپنے پر اور اپنے بھائی پر بس چلتا ہے، میرے اور اس گنہ گار جماعت کے درمیان جدائی ڈال دے۔

۲۶۔ خدا نے موسیٰ سے فرمایا: یہ سرزمین چالیس سال تک ان کیلیے ممنوع ہے (اور یہ اس تک نہیں پہنچ سکیں گے) اور ہمیشہ زمین میں سرگرداں رہیں گے اور اس گنہ گار جمعیت (کے انجام) کے بارے میں غمگین نہ ہو۔

تفسیر

بنی اسرائیل اور سرزمینِ مقدس

ان آیات میں یہودیوں میں روحِ حق شناسی بیدار کرنے، گذشتہ خطاؤں کے بارے میں ان کے شعور کو دعوت دینے اور

Marfat.com

انھیں ان خطاؤں کی تلافی پر ابھارتے کے لیے فرمایا گیا ہے: وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے پیروکاروں سے کہا کہ خدا نے تمھیں جو نعمتیں بخشی ہیں انھیں فراموش نہ کرو (و اذ قال موسٰی لقومہ یٰقوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم)

واضح ہے کہ "نعمۃ اللہ" کا مفہوم پروردگار کی تمام نعمات پر محیط ہے۔ لیکن یہاں ان کے تین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی نعمت یہ ہے کہ بہت سے انبیاء اور رہبران انہیں پیدا ہوئے یہ دراصل ان کے لیے سب سے بڑی نعمت تھی (اذ جعل فیکم انبیاء) یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ صرف حضرت موسیٰ بن عمران کے زمانے میں ستر سے زیادہ پیغمبر تھے۔ وہ تمام ستر افراد جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ کوہ طور پر گئے تھے، انبیاء کے زمرے میں آتے ہیں۔ اسی نعمت کی برکت سے وہ شرک، بت پرستی اور گوسالہ پرستی جیسی ہولناک مصیبتوں سے رہا ہوئے اور انھوں نے طرح طرح کے خرافات، موہومات، قباحتوں اور نجاستوں سے نجات حاصل کی۔ یہ انکے لیے عظیم ترین نعمت تھی۔

ایک عظیم مادی نعمت تھی جو اپنے مقام پر روحانی نعمتوں کے لیے ایک مقدمہ بھی ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے تمھاری جان و مال اور زندگی کا اختیار خود تمھارے ہاتھ میں دے دیا (و جعلکم ملوکًا) بنی اسرائیل سالہا سال سے فرعون اور فرعونیوں کی قید و بند کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور ان کے اپنے ہاتھ میں کوئی اختیار نہ تھا۔ ان کیساتھ قیدی جانوروں کا سا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ حضرت موسیٰ بن عمران نے بحکم خدا سے قیام کیا اور انکے پاؤں میں پڑی غلامی اور استعمار کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا اور انھیں ان کی زندگی کا مختار بنا دیا۔

بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ "ملوک" سے یہاں مراد وہ بادشاہ اور سلاطین ہیں جو بنی اسرائیل میں سے ہوئے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے پاس حکومت ایک مختصر سے دور کے لیے ہی رہی اور ان میں سے چند افراد ہی اس مقام تک پہنچے جب کہ آیت کہتی ہے: وجعلکم ملوکًا ..... یعنی خدا نے تم سب کو یہ مقام عطا کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت سے مراد وہی کچھ ہے جو ہم نے سطور بالا میں کہا ہے۔ علاوہ ازیں "ملک" (بروزن "الف") لغت میں بادشاہ اور صاحب اقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے[1]

درمنثور میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

کانت بنو اسرائیل اذا کان لاحدھم خادم و دابۃ وامرأۃ کتب ملکًا۔

---

[1] کتب لغت میں ہے:

الملك من كان له الملك و الملك هوما يملكه الانسان ويتصرف به — او — العظمة و السلطة

مَلِک وہ شخص ہے جو مِلک رکھتا ہو اور مِلک ان سب چیزوں کو کہتے ہیں جس کا انسان مالک ہو اور ان میں تصرف کرے۔

Marfat.com

بنی اسرائیل میں سے جس شخص کے پاس غلام گھوڑا اور بیوی ہوتی اسے ملک کہتے [1]
آیت کے آخر میں کلی طور پر ان اہم نعمتوں کا ذکر ہے جو اس زمانے میں کسی اور کو نہیں دی گئی تھی۔ تھیں ایسی چیزیں دی گئیں جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دی گئی تھیں (و اٰتاکم مالم یؤت احدًا من العالمین)۔
ایسی طرح طرح کی بہت زیادہ نعمتیں تھیں ان میں سے یہ بھی تھیں کہ انھیں معجزانہ طور پر فرعون سے نجات ملی، ان کیلیے دریا شق ہوا اور من و سلویٰ جیسی خاص غذا انھیں میسر آئی۔ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ آیت ۵۰ کے ذیل میں جلد اوّل (ص۲۱۴، اردو ترجمہ) میں گزر چکی ہے۔
اس کے بعد سرزمین مقدس میں بنی اسرائیل کے حدود کے بارے میں یوں بیان کیا گیا ہے، موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سرزمین مقدس میں جسے خدا نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے داخل ہو جاؤ، اس سلسلے میں مشکلات سے نہ ڈرو، فداکاری سے منہ نہ موڑو اور اگر تم نے اس حکم سے پیٹھ پھیری تو خسارے میں رہو گے (یٰقوم ادخلوا الارض المقدسة التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا خاسرین)۔
آیت میں ارضِ مقدسہ سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے، بعض بیت المقدس کہتے ہیں کچھ اردن یا فلسطین کا نام لیتے ہیں اور بعض سرزمین طور سمجھتے ہیں، لیکن بعید نہیں کہ اس سے مراد منطقہ شامات ہو جس میں تمام مذکورہ علاقے شامل ہیں کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ یہ سارا علاقہ انبیاء الٰہی کا گہوارہ، عظیم ادیان کے ظہور کی سرزمین اور طویل تاریخ میں توحید، خدا پرستی اور تعلیمات انبیاء کی نشر و اشاعت کا مرکز رہا ہے لہٰذا اسے سرزمین مقدس کہا گیا ہے اگرچہ بعض اوقات خاص بیت المقدس کو بھی ارضِ مقدس کہا جاتا ہے۔
"کتب اللہ علیکم" سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ بنی اسرائیل سرزمین مقدس میں امن و سکون اور خوشحالی کی زندگی بسر کریں (اس شرط کے ساتھ کہ اسے شرک اور بت پرستی سے پاک رکھیں اور خود بھی انبیاء کی تعلیم سے منحرف نہ ہوں) لیکن وہ اگر اس حکم پر کاربند نہ رہے تو انھیں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ لہٰذا اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی مخاطب بنی اسرائیل کی ایک نسل اس سرزمین میں داخل نہ ہو سکی اور چالیس سال تک بیابان میں سرگرداں رہی اور ان کی اگلی نسل کو یہ توفیق ملی .... تو یہ بات "کتب اللہ لکم" (خدا نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے) کے مفہوم کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ بات چند شرائط سے مشروط تھی جنھیں انھوں نے پورا نہیں کیا۔ جیسا کہ بعد والی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔
بنی اسرائیل نے اس حکم پر حضرت موسیٰؑ کو وہی جواب دیا جو ایسے موقع پر کمزور، بزدل اور جاہل لوگ دیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ تمام کامیابیاں انھیں اتفاقاً اور معجزانہ طور پر ہی حاصل ہو جائیں یعنی لقمہ بھی کوئی اٹھا کر ان کے منہ میں ڈال دے، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے: آپ جانتے ہیں کہ اس علاقے میں ایک جابر اور جنگجو گروہ رہتا ہے

---

[1] المیزان جلد ۵ ص۳۱۹، تفسیر طبری ج ۶ ص۱۰۱ میں بھی یہ روایت نقل ہے۔

Marfat.com

جب تک وہ اسے خالی کر کے باہر نہ چلا جائے ہم تو اس علاقے میں قدم تک نہیں رکھیں گے۔ اسی صورت میں ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور سرزمینِ مقدم میں داخل ہوں گے (قالوا یٰموسیٰ ان فیها قوماً جبارین[۱] وانا لن ندخلها حتیٰ یخرجوا منها فان یخرجوا منها فانا داخلون)۔

بنی اسرائیل کا یہ جواب اچھی طرح نشاندہی کرتا ہے کہ طویل فرعونی استعمار نے ان کی نسلوں پر کیسا منحوس اثر چھوڑا تھا۔ لفظ "لن" جو دائمی نفی پر دلالت کرتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ سرزمینِ مقدس کی آزادی کے لیے مقابلے سے کس قدر خوفزدہ تھے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل سعی و کوشش کرتے، جہاد و قربانی کے جذبے سے کام لیتے اور سرزمینِ مقدس پر قبضہ کر لیتے اگر فرض کریں کہ سنتِ الٰہی کے برخلاف بغیر کسی اقدام کے ان کے تمام دشمن معجزانہ طور پر نابود ہو جاتے اور بغیر کوئی تکلیف اٹھائے وہ وسیع علاقے کے وارث بن جاتے تو اس کا انتظام چلانے اور اس کی حفاظت میں بھی ناکام رہتے۔ بغیر زحمت سے حاصل کی ہوئی چیز کی حفاظت سے انھیں کیا سروکار ہو سکتا تھا نہ وہ اس کے لیے تیار ہوتے اور نہ اہل۔

جیسا کہ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے آیت میں قوم جبار سے مراد قوم عمالقہ[۲] ہے یہ لوگ سخت جان اور بلند قامت تھے۔ یہاں تک کہ ان کی بلند قامت کے بارے میں بہت مبالغے ہوئے اور افسانے تراشے گئے۔ اس سلسلے میں مضحکہ خیز باتیں گھڑی گئیں جن کے لیے کوئی عملی دلیل نہیں ہے۔

خصوصاً "عوج" کے بارے میں خرافات سے معمور ایسی کہانیاں تاریخوں میں ملتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے افسانے جن میں سے بعض اسلامی کتب میں بھی آ گئے ہیں، دراصل بنی اسرائیل کے گھڑے ہوئے ہیں انھیں عام طور پر "اسرائیلیات" کہا جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خود موجودہ تورات کے متن میں ایسے افسانے دکھائی دیتے ہیں۔ سفر اعداد کی تیرہویں فصل کے آخر میں ہے:

> اس زمین کے بارے میں جس کے تجسس میں (بنی اسرائیل کے جاسوس) لگے ہوئے تھے انھوں نے آکر ایک بری خبر دی۔ وہ کہنے لگے کہ جس زمین کے بارے میں ہم تجسس کرنے گئے ہوئے تھے جب ہم اس کے نزدیک سے گزرے تو دیکھا کہ وہ ایسی زمین ہے جو اپنے رہنے والوں کو تلف کر

---

[۱] توجہ رہے کہ لفظ "جبار" اصل میں مادہ "جبر" سے ہے اس کا معنی ہے کسی چیز کی قوت سے اور زبردستی اصلاح کرنا۔ اسی لیے ٹوٹی ہوئی ہڈی باندھنے کو "جبر" کہتے ہیں۔ بعد ازاں ایک طرف ہر طرح کی اصلاح اور دوسری طرف ہر طرح کے تسلط اور غلبہ کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ خدا کو بھی جبار اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ تمام چیزوں پر تسلط رکھتا ہے یا ہر محتاج کی اصلاح کرتا ہے۔

[۲] عمالقہ، سام کی اولاد میں سے ایک قوم تھی یہ لوگ جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں صحرائے سینا کے نزدیک رہتے تھے وہ مصر پر حملہ آور ہوئے اور مدتوں اس پر قابض رہے ان کی حکومت کا عرصہ تقریباً ۵۰۰ سال تھا (۲۲۱۳ ق م سے لے کر ۱۷۰۳ ق م تک)۔
(دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۶ صفحہ ۲۳۲ طبع سوم)

Marfat.com

دیتی ہے اور اس میں ہم نے جتنے لوگوں کو دیکھا سب بلند قامت تھے۔ وہاں ہم نے بلند قد والوں یعنی اولاد عناق جو بلند قامت ہیں کو دیکھا ہے ہمیں ایسا لگا جیسے ہم ٹڈی دل ہیں اور خود ان کی نگاہوں میں بھی ہم ایسے ہی تھے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: اس وقت اہلِ ایمان میں سے دو افراد ایسے تھے جن کے دل میں خوفِ خدا تھا اور اس بنا پر انھیں عظیم نعمتیں میسر تھیں ان میں استقامت و شجاعت بھی تھی، وہ دور اندیش بھی تھے اور اجتماعی اور فوجی نقطہ نظر سے بھی بصیرت رکھتے تھے انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دفاعی تجویز کی حمایت کی اور بنی اسرائیل سے کہنے لگے: تم شہر کے دروازے سے داخل ہو جاؤ اور اگر تم داخل ہو گئے تو کامیاب ہو جاؤ گے (قال رجلان من الذین یخافون انعم اللّٰہ علیھما ادخلوا علیھم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غٰلبون) لیکن ہر صورت میں تمھیں روحِ ایمان سے مدد حاصل کرنا چاہیے خدا پر بھروسہ کرو تاکہ اس مقصد کو پالو (وعلی اللّٰہ فتوکلوا ان کنتم مؤمنین)۔

اس بارے میں کہ یہ دو آدمی کون تھے؟ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا (یوفنہ بھی لکھتے ہیں) تھے جو بنی اسرائیل کے نقیبوں میں سے تھے کہ جن کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے[۱]۔

من الذین یخافون ..... کی تفسیر میں بھی کئی احتمالات پیش کیے گئے ہیں لیکن واضح ہے کہ ظاہری مفہوم یہ ہے کہ وہ دونوں مرد ایسے تھے جو خدا سے ڈرتے تھے اسی لیے تو انھیں غیر خدا کا کوئی خوف نہ تھا۔

انعم اللّٰہ علیھما ...... خدا نے ان پر فراواں نعمت کی ..... یہ جملہ بھی مندرجہ بالا مفہوم کا شاہد ہے کیونکہ اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی کہ انسان صرف اللہ سے ڈرے نہ کہ اس کے غیر سے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ دو شخص کیسے جانتے تھے کہ اگر بنی اسرائیل اچانک حملہ کر کے شہر میں داخل ہو جائیں تو عمالقہ شکست کھا جائیں گے۔

شاید یہ اس لیے ہو کہ وہ موسیٰ بن عمران کے وعدۂ فتح و نصرت پر اعتماد رکھتے تھے اور اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تمام جنگوں کا ایک یہ اصول ہے کہ اگر حملہ آور فوج اپنے دشمن کے اصلی مرکز پر جا پہنچے یعنی اس کے گھر میں جا کر لڑے، تو عام طور پر کامیاب ہو جاتی ہے[۲]۔

علاوہ ازیں جیسا کہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ عمالقہ ایک تنومند اور قوی ہیکل قوم تھی (البتہ ان کے بارے میں افسانوی پہلوؤں کا ہم نے انکار کیا ہے) اور ایسی قوم بیابانی جنگ میں اپنی مہارت کا بہتر مظاہرہ کر سکتی ہے لیکن شہر کے گلی کوچوں میں ویسا نہیں

۱۔ موجودہ تورات کے سفر تثنیہ باب اول سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دو افراد کے نام یوشع اور کالب تھے۔

۲۔ نہج البلاغہ میں بھی خطبہ جہاد میں اس جنگی حکمتِ عملی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔

فو اللّٰہ ما غزی قوم فی عقر دارھم الا ذلوا

بخدا جس قوم پر بھی اس کے گھر میں حملہ کیا گیا، وہ ذلیل ہوئی۔ (خطبہ۔ ۲۷)

Marfat.com

لڑسکتی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر جیسا کہ کہا جاتا ہے وہ لوگ تومند اور قوی ہیکل ہونے کے باوجود ڈرپوک تھے اور اچانک حملے سے جلدی مرعوب ہو جاتے۔ ان تمام امور کے باعث ان دو افراد نے بنی اسرائیل کی کامیابی کی ضمانت دی تھی۔ مگر بنی اسرائیل نے یہ تجویز قبول نہ کی اور ضعف و کمزوری جوان کی روح پر قبضہ کر چکی تھی، کے باعث انھوں نے صراحت سے حضرت موسیٰؑ سے کہا: جب تک وہ لوگ اس سرزمین میں ہیں ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے، تم اور تمھارا پروردگار جس نے تم سے کامیابی کا وعدہ کیا ہے، جاؤ اور عمالقہ سے جنگ کرو اور جب کامیاب ہو جاؤ تو ہمیں بتا دینا ہم یہیں بیٹھے ہیں (قالوا یموسی انا لن ندخلها ابدًا ما داموا فیها فاذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون)۔

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کے سامنے جسارت کی انتہا کر دی تھی، کیونکہ پہلے تو انھوں نے لفظ "لن" اور "ابدا" استعمال کر کے اپنی صریح مخالفت کا اظہار کیا اور پھر یہ کہا کہ تم اور تمھارا پروردگار جاؤ اور جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ .... انھوں نے حضرت موسیٰؑ اور ان کے وعدوں کی تحقیر کی یہاں تک کہ خدا کے ان دو بندوں کی تجویز کی بھی پروا نہیں کی اور شاید انھیں تو کوئی مختصر سا جواب تک نہیں دیا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ موجودہ تورات میں بھی اس داستان کے بعض اہم حصے موجود ہیں۔ یہ واقعہ سفر اعداد باب ۱۴ میں ہے، جہاں مذکور ہے:

> تمام بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون پر معترض ہوئے اور سب انھیں کہنے لگے کہ کاش ہم سرزمین مصر ہی میں مر گئے ہوتے یا پھر کسی جنگل بیابان میں مرجاتے۔ خدا اس زمین میں ہمیں کیوں لے آیا ہے کہ جہاں ہم تلوار زنی کا شکار ہو جائیں اور ہماری عورتیں اور بچے لوٹ کا مال بن جائیں...... پس موسیٰ اور ہارون بنی اسرائیلی عوام کے سامنے منہ کے بل گر پڑے اور یوشع بن نون اور کالیب بن یفنہ جو زمین کے متجسسین میں سے تھے انھوں نے اپنا گریبان چاک کر لیا۔

اگلی آیت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں سے بالکل مایوس ہو گئے اور انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور ان سے علیحدگی کے لیے یوں تقاضا کیا: پروردگارا! میرا تو صرف اپنے آپ پر اور اپنے بھائی پر بس چلتا ہے: خدایا! ہمارے اور اس فاسق و سرکش گروہ میں جدائی ڈال دے تاکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیں اور ان کی اصلاح ہو جائے (قال رب انی لا املك الا نفسی واخی فافرق بیننا و بین القوم الفسقین)۔

البتہ بنی اسرائیل نے جو کام کیا تھا یعنی اپنے پیغمبر کے حکم صریح کی نافرمانی وہ کفر کی حد تک پہنچی ہوئی تھی اور اگر قرآن نے انھیں فاسق کا لقب دیا ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ "فاسق" ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس میں ہر طرح کی عبودیت اور خدا کی بندگی سے خارج ہونے کا مفہوم شامل ہے اسی لیے شیطان کے بارے میں ہے:

ففسق عن امر ربه

وہ فرمان خدا کے مقابلے میں فاسق ہو گیا اور اس نے مخالفت کی۔

(کہف .... ۵۰)

Marfat.com

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ گذشتہ آیات میں "مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ" سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں اقلیت میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جو خدا سے ڈرتے تھے۔ یوشع اور کالیب ایسے ہی افراد میں سے تھے لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ اپنا اور اپنے بھائی ہارونؑ ہی کا نام لیتے ہیں اور ان دونوں کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ حضرت ہارونؑ ایک تو حضرت موسیٰؑ کے جانشین تھے اور دوسرا یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ افضل تھے لہٰذا خصوصیت سے ان کا نام لیا گیا ہے۔

آخر کار حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور بنی اسرائیل اپنے ان برُے اعمال کے انجام سے دوچار ہوئے۔ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کو وحی ہوئی: یہ لوگ اس مقدس سرزمین سے چالیس سال تک محروم رہیں گے جو طرح طرح کی مادی اور روحانی نعمات سے مالامال ہے (قال فانها محرمة علیهم اربعین سنة) علاوہ ازیں ان چالیس سالوں میں انھیں اس بیابان میں سرگرداں رہنا ہوگا (یتیهون فی الارض)[1] اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا ہے: اس قوم کے سر پر جو کچھ بھی آئے وہ صحیح ہے، ان کے اس انجام پر کبھی غمگین نہ ہونا (فلا تأس علی القوم الفسقین)۔

آخری جملہ شاید اس لیے ہو کہ جب بنی اسرائیل کے لیے یہ فرمان صادر ہوا کہ وہ چالیس سال تک سزا کے طور پر بیابان میں سرگرداں رہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں جذبۂ مہربانی پیدا ہوا ہو اور شاید انھوں نے درگاہ خداوندی میں ان کے لیے عفو و درگذر کی درخواست بھی کی ہو جیسا کہ موجودہ تورات میں بھی ہے لیکن انھیں فوراً جواب دیا گیا کہ وہ اس سزا کے مستحق ہیں نہ کہ عفو و درگذر کے، کیونکہ جیسا کہ قرآن میں ہے کہ وہ فاسق اور سرکش لوگ تھے اور جو ایسے ہوں ان کے لیے یہ انجام حتمی ہے۔

توجہ رہے کہ ان کے لیے چالیس سال کی یہ محرومیت انتقامی جذبے سے نہ تھی (جیسا کہ خدا کی طرف سے کوئی سزا بھی ایسی نہیں ہوتی بلکہ وہ یا اصلاح کے لیے ہوتی ہے اور یا عمل کا نتیجہ) درحقیقت اس کا ایک فلسفہ تھا اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل ایک طویل عرصے تک فرعونی استعمار کی ضربیں جھیل چکے تھے۔ اس عرصے میں حقارت آمیز رسومات، اپنے مقام کی عدم شناخت اور احساسات ذلت کا شکار ہو چکے تھے اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے عظیم رہبر کی سرپرستی میں اس تھوڑے سے عرصے میں اپنی روح کو ان خامیوں سے پاک نہیں کر سکے تھے اور وہ ایک ہی جست میں افتخار، قدرت اور سربلندی کی نئی زندگی کے لیے تیار نہیں ہو پائے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے انھیں مقدس سرزمین کے حصول کیلیے جہاد آزادی کا جو حکم دیا تھا اس پر عمل نہ کرنے کے لیے انھوں نے جو کچھ کہا وہ اس حقیقت کی واضح دلیل ہے لہٰذا ضروری تھا کہ وہ ایک طویل مدت وسیع بیابانوں میں سرگرداں رہیں اور اس طرح ان کی ناتواں اور غلامانہ ذہنیت کی حامل موجودہ کمزور نسل آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی اور نئی نسل حریت و آزادی کے ماحول میں اور خدائی تعلیمات کی آغوش میں پروان چڑھے تاکہ وہ اس قسم کے جہاد کے لیے اقدام کر سکے اور اس طرح سے اس سرزمین پر حق کی حکمرانی قائم ہو سکے۔

---

[1] یتیهون کا مادہ "تیہ" ہے جس کا معنی ہے سرگردانی۔ بعد ازاں "تیہ" اس بیابان کا نام ہو گیا جس میں بنی اسرائیل سرگرداں رہے۔ جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ جلد اول (ص۲۱۳، اردو ترجمہ) میں بیان کر چکے ہیں یہ صحراء، صحرائے سینا کا ایک حصہ ہے۔

Marfat.com

۲۷۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَىْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ
اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا
يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ○
۲۸۔ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَىَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِىْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِىَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ
اِنِّىْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ○
۲۹۔ اِنِّىْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِىْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ
ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ○ ۚ

ترجمہ

۲۷۔ آدم کے دو بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ ان کے سامنے پڑھیے جبکہ ان میں سے ہر ایک نے (پروردگار کے) تقرب کیلیے ایک کام کیا مگر وہ ایک کا (عمل) تو قبول ہوگیا، لیکن دوسرے سے قبول نہ کیا گیا (وہ بھائی جس کا عمل قبول نہیں ہوا تھا دوسرے بھائی سے) کہنے لگا: خدا کی قسم میں تجھے قتل کر دوں گا۔ (دوسرے بھائی نے) کہا: (میں نے کونسا گناہ کیا ہے، کیونکہ) خدا تو صرف پرہیزگاروں سے قبول کرتا ہے۔

۲۸۔ اگر تو میرے قتل کے لیے ہاتھ بڑھائے تو میں تو تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، کیونکہ میں عالمین کے پروردگار سے ڈرتا ہوں۔

۲۹۔ میں تو چاہتا ہوں کہ (تو یہ عمل انجام دے کر) میرا اور اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے لوٹے اور (دونوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے) تو جہنمیوں میں سے ہو جائے اور ستمگروں کی یہی سزا ہے۔

تفسیر

روئے زمین پر پہلا قتل

ان آیات میں حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک کے ہاتھوں دوسرے کے قتل کے

Marfat.com

بارے میں داستان بیان کی گئی ہے۔ ان آیات کا گذشتہ آیات سے شاید یہ ربط ہو کہ بنی اسرائیل کے بہت سے غلط اعمال کا سبب حسد تھا ان آیات کے ذریعے خدا تعالیٰ انھیں متوجہ کر رہا ہے کہ حسد کا انجام کتنا ناگوار اور ہولناک ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی وجہ سے ایک بھائی اپنے بھائی کے خون سے بھی ہاتھ رنگین کر لیتا ہے پہلے فرمایا: اے پیغمبر! انھیں آدم کے دو بیٹوں کا حقیقی قصہ سنا دیجیے (واتل علیھم نبأ ابنی آدم بالحق)۔

"بالحق" ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ مذکورہ سرگذشت عہد قدیم (تورات) میں بڑی خرافات کی آمیزش کے ساتھ بیان کی گئی ہے لیکن قرآن میں اس کی حقیقت و واقعیت کو بیان کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہاں "آدم" سے مراد وہی مشہور آدم ہیں جو موجودہ نسل انسانی کے پہلے باپ ہیں اور یہ جو بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد آدم بنی اسرائیل میں سے ایک فرد تھا، بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ یہ لفظ قرآن مجید میں بارہا اس معنی میں استعمال ہوا ہے اور اگر یہاں کوئی اور معنی مراد ہوتا تو ضروری تھا کہ اس کے لیے کوئی قرینہ ہوتا باقی رہی آیت "من اجل ذٰلک ..." کہ جس کی تفسیر عنقریب آئے گی جیسا کہ ہم وضاحت کریں گے ہرگز اس معنی کے لیے قرینہ قرار نہیں پا سکتی۔

اس کے بعد واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب ہر ایک نے تقرب پروردگار کے لیے ایک کام انجام دیا تو ایک کا عمل تو قبول کر لیا گیا لیکن دوسرے کا قبول نہ ہوا (اذ قربا قربانا فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الاٰخر)

اسی وجہ سے جس کا عمل قبول نہ ہوا تھا اس نے دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دی اور قسم کھا کر کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا (قال لاقتلنک)۔

لیکن دوسرے بھائی نے اسے نصیحت کی اور کہا کہ اگر یہ واقعہ پیش آیا ہے تو اس میں میرا کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ اعتراض تو تجھ پر ہونا چاہیے کیونکہ تیرے عمل میں تقویٰ شامل نہیں تھا اور خدا تو صرف پرہیزگاروں کا عمل قبول کرتا ہے (قال انما یتقبل اللہ من المتقین) مزید کہا کہ حتی اگر تم اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناؤ اور میرے قتل کے لیے ہاتھ بڑھاؤ تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا اور تمھارے قتل کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا (لئن بسطت الی یدک لتقتلنی ما انا بباسط یدی الیک لاقتلک) کیونکہ میں تو خدا سے ڈرتا ہوں اور ایسے گناہ سے ہرگز اپنے ہاتھ آلودہ نہیں کروں گا (انی اخاف اللہ رب العٰلمین) علاوہ ازیں میں نہیں چاہتا کہ دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنی گردن پر لاد لوں بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ تم ہی میرے اپنے گناہ کا بار اپنے کندھے پر اٹھا لو (کیونکہ اگر واقعاً تم اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ پہناؤ تو میرے گذشتہ گناہوں کا بوجھ بھی تمھارے کندھوں پر آپڑے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم مجھ سے حق حیات چھینو گے تو تاوان بھی تمھی کو دینا ہو گا اور چونکہ تمھارے پاس کوئی صالح عمل نہیں ہے لہٰذا میرے گناہ تمھیں اپنے کندھوں پر اٹھانا ہوں گے (انی ارید ان تبوء[1] باثمی و اثمک)۔

❖ ❖ ❖

---

[1] "تبوء" مادہ "بواء" سے ہے اور اس کا معنی ہے "بازگشت"۔

Marfat.com

اور مسلّم ہے کہ یہ بوجھ اٹھا کر تم جہنمیوں میں سے ہوجاؤ گے اور ستمگروں کی یہی سزا ہے (فتکون من اصحٰب النار وذٰلک جزٰؤا الظّٰلمین)۔

چند اہم نکات

آدم کے بیٹوں کے نام: ۱۔ قرآن مجید میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا نام نہیں لیا گیا ہے، نہ اس جگہ اور نہ کسی اور مقام پر لیکن اسلامی روایات کے مطابق ایک کا نام ہابیل ہے اور دوسرے کا قابیل۔ موجودہ تورات کے سفر تکوین کے چوتھے باب میں ایک کا نام قائن مذکور ہے اور دوسرے کا ہابیل۔ جیسا کہ مشہور مفسر ابوالفتح رازی کہتے ہیں ہر ایک کے نام میں چند لغوی پہلو ہیں۔ پہلے کا نام "ہابیل" ، "ہابل" یا "ہابن" تھا اور دوسرے کا نام "قابیل" ، "قابن" یا "قبن" تھا۔ بہرحال اسلامی روایات اور تورات کے متن میں قابیل کے نام کے بارے میں اختلاف لغت کی طرف بازگشت ہے اور یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ ایک عیسائی عالم نے اس امر کو قرآن پر اعتراض کی بنیاد بنا لیا ہے کہ قرآن نے "قائن" کو "قابیل" کیوں کہا ہے حالانکہ اول تو یہ اختلاف لغت ہے اور لغت میں ناموں کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے مثلاً تورات "ابراہیم" کو "ابراہام" لکھتی ہے اور قرآن اسے "ابراہیم" لکھتا ہے، ثانیاً بنیادی طور پر "ہابیل" اور "قابیل" کے نام قرآن میں مذکور ہی نہیں یہ اسماء تو اسلامی روایات میں آئے ہیں[1]

۲۔ "قربان" کا مفہوم: ہم جانتے ہیں کہ "قربان" ایسی چیز کو کہتے ہیں جو تقرب الٰہی کا باعث بنے مگر جو کام ان دونوں بھائیوں نے انجام دیا اس کا قرآن میں تذکرہ موجود نہیں ہے بعض اسلامی روایات اور تورات کے سفر تکوین باب چہارم میں جو کچھ مذکور ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہابیل کے پاس چونکہ پالتو جانور تھے اس نے ان میں سے ایک بہترین پلا ہوا مینڈھا منتخب کیا، قابیل کسان تھا اس نے گندم کا گھٹیا حصہ یا گھٹیا آٹا اس کے لیے منتخب کیا۔

۳۔ قبولیت کی دلیل کیا تھی: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرزندان آدمؑ کو کیسے پتہ چلا کہ ایک کا عمل بارگاہ ایزدی میں قبول ہوگیا ہے اور دوسرے کا عمل رد کر دیا گیا ہے۔ قرآن میں اس کی بھی وضاحت نہیں ہے البتہ بعض اسلامی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں اپنی مہیا شدہ چیزیں پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے قبولیت کے اظہار کے طور پر بجلی نے ہابیل کی قربانی کھا لیا اور اسے جلا دیا لیکن دوسری اپنی جگہ پر باقی رہی اور یہ نشانی پہلے سے مروج تھی۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ایک عمل کی قبولیت دوسرے کا رد حضرت آدمؑ کو وحی کے ذریعے بتایا گیا اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ ہابیل ایک باصفا، باکردار اور راہ خدا میں سب کچھ کر گذرنے والا شخص تھا جبکہ قابیل تاریک دل، حاسد اور ہٹ دھرم تھا۔ قرآن نے دونوں بھائیوں کی جو گفتگو بیان کی ہے اس سے ان کی روحانی کیفیت اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے۔

---

[1] علامہ شیخ محمد جواد بلاغی نے اس سلسلے میں ایک رسالہ "الاکاذیب الاعاجیب" (تعجب انگیز جھوٹ) کے نام سے لکھا ہے جس میں مذکورہ جھوٹ کی طرح کے کئی جھوٹ بتائے گئے ہیں اس رسالے کا فارسی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

Marfat.com

۴۔ ظلم کا پہلا سرچشمہ حسد ہے، ان آیات سے یہ واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ جہانِ انسانیت میں اختلاف، قتل تجاوز اور ظلم کا پہلا سرچشمہ حسد ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی رذالت کے حوالے سے حسد کا مقام کس قدر پست ہے۔ بہت سے اجتماعی اور معاشرتی امور پر اس کے گہرے منفی اثرات بھی اس سے ظاہر ہوتے ہیں۔

۳۰۔ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○

۳۱۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِى الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِىْ سَوْءَةَ
اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِىَ
سَوْءَةَ اَخِىْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ○ۚ

ترجمہ

۳۰۔ نفسِ سرکش نے آہستہ آہستہ اسے بھائی کے قتل کے لیے پختہ کردیا اور اس نے اسے قتل کردیا، اور وہ زیاں کاروں میں سے ہوگیا۔

۳۱۔ اس کے بعد خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین میں کوشش کرتا (اور اسے کھودتا) تاکہ وہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کا جسم زمین میں کیسے دفنائے۔ تو وہ کہنے لگا وائے ہو مجھ پر کہ میں اس کوّے جیسا (بھی) نہیں ہوسکا کہ اپنے بھائی کو دفن کرتا اور آخرکار وہ (رسوائی کے خوف اور وجدان کے دباؤ سے اپنے کام پر) پشیمان ہوا۔

تفسیر

ظلم پر پردہ پوشی

ان آیات میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ، ایک بھائی کا دوسرے کے ہاتھوں قتل اور قتل کے بعد کے حالات بیان کیے گئے ہیں، پہلے فرمایا: سرکش نفس نے بھائی کے قتل کے لیے اسے پختہ کردیا اور اس نے اسے قتل کردیا (فطوعت له نفسه قتل اخيه فقتله)۔

"طوع" کا معنی ہے کسی چیز کا رام اور مطیع ہونا۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہابیل کا عمل قبول ہوجانے کے بعد قابیل کے دل میں ایک طوفان پیدا ہوگیا ایک طرف دل میں ہر وقت حسد کی آگ بھڑکتی رہتی اور اسے انتقام پر ابھارتی اور دوسری طرف بھائی کا رشتہ، انسانی جذبہ اور گناہ، ظلم، بے انصافی اور قتل نفس سے ذاتی تنفر اسے اس جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا، لیکن آخرکار سرکش نفس

Marfat.com

آہستہ آہستہ روکنے والے عوامل پر غالب آ گیا اور اس نے اس کے بیدار وجدان کو رام کر لیا اور اسے جکڑ دیا اور بھائی کو قتل کرنے پر آمادہ کر لیا "طوعت" ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن اس سارے مفہوم کی طرف بھرپور اشارہ کرتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کسی کو ایک ہی لمحے میں رام نہیں کیا جاسکتا بلکہ ایسا تدریجی طور پر کئی طرح کی کشمکش کے بعد عمل میں آتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس کام کے نتیجے میں وہ زیاں کاروں میں سے ہو گیا (فاصبح من الخاسرین) اس سے بڑھ کر اور کیا خسارہ ہوگا کہ اس نے وجدان کا عذاب، خدا کی طرف سے سزا اور قیامت تک کے لیے اپنے نام پر ننگ و عار خرید لی۔

"اصبح" سے بعض نے یہ استفادہ کیا ہے کہ یہ قتل رات کے وقت ہوا حالانکہ یہ لفظ لغت عرب میں رات یا دن کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ کسی چیز کے واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے، مثلاً سورۂ آلِ عمران آیہ ۱۰۳ میں ہے:

"فاصبحتم بنعمته اخوانا"

نعمتِ خدا کی وجہ سے تم ایک دوسرے کے بھائی بن گئے

امام صادق علیہ السلام سے منقول بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قابیل نے جب اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو اس کی لاش اس نے صحرا میں ڈال رکھی تھی اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے زیادہ دیر نہ گذری کہ درندے ہابیل کے جسم کی طرف آنے لگے۔ قابیل ضمیر کے شدید دباؤ کا شکار تھا بھائی کے جسم کو بچانے کے لیے وہ لاش کو ایک مدت تک کندھے پر لیے پھرتا رہا، کچھ پرندوں نے پھر بھی اسے گھیر رکھا تھا اور وہ اس انتظار میں تھے کہ وہ کب اسے زمین پر پھینکتا ہے تاکہ وہ لاش پر جھپٹ پڑیں[1]

جیسا کہ قرآن کہتا ہے اس موقع پر خدا تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا مقصد یہ تھا کہ وہ زمین کھودے اور اس میں دوسرے مُردہ کوے کا جسم چھپا دے یا اپنے کھانے کی چیزوں کو زمین میں چھپا دے جیسا کہ کوے کی عادت ہے تاکہ قابیل سمجھ سکے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح سپرد خاک کرے (فبعث الله غرابا یبحث فی الارض لیریه کیف یواری سوأة اخیه)[2]

البتہ اس بات میں کوئی تعجب نہیں کہ انسان کوئی چیز کسی پرندے سے سیکھے کیونکہ تاریخ اور تجربہ شاہد ہیں کہ بہت سے جانور طبعی طور پر بعض معلومات رکھتے ہیں اور انسان نے اپنی پوری تاریخ میں جانوروں سے بہت کچھ سیکھا ہے یہاں تک کہ میڈیکل کی

---

1. مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔
2. "یبحث" "بحث" کے مادہ سے ہے جیسا کہ مجمع البیان میں ہے دراصل یہ لفظ مٹی میں سے کسی چیز کو تلاش کرنے کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ ہر طرح کی جستجو حتیٰ کہ عقلی و فکری مباحث کے لیے بھی استعمال ہونے لگا اور "سوأة" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو پسند نہ آئے اس لیے کبھی شرمگاہ تک کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ضمناً توجہ رہے کہ "لیریه" کا فاعل ممکن ہے خدا ہو، یعنی خدا چاہتا تھا کہ ہابیل کا احترام ملحوظ رہے اور اس کے لیے قابیل کو اسے دفن کرنے کا طریقہ سکھائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا فاعل وہی کوا ہو کہ جس نے حکم خدا سے یہ کام انجام دیا۔

Marfat.com

بعض کتب میں ہے کہ انسان اپنی بعض طبی معلومات میں حیوانات کا مرہونِ منت ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: اس وقت قابیل اپنی غفلت اور جہالت سے پریشان ہوگیا اور چیخ اٹھا کہ وائے ہو مجھ پر، کیا میں اس کوّے سے بھی زیادہ ناتواں اور عاجز ہوں، مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میں اس کی طرح اپنے بھائی کا جسم دفن کروں (قال یا ویلتی اعجزت ان اکون مثل ھذا الغراب فاواری سوأۃ اخی) بہرحال وہ اپنے کیے پر نادم و پشیمان ہوا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: (فاصبح من النادمین)

کیا اس کی پشیمانی اس بنا پر تھی کہ اس کا گھٹیا اور برا عمل آخرکار اس کے ماں باپ پر اور احتمالی طور پر جو دوسرے بھائی تھے ان پر آشکار ہو جائے گا اور وہ اسے بہت سرزنش کریں گے ——— یا کیا یہ پشیمانی اس بنا پر تھی کہ کہیں میں ایک مدت تک بھائی کی لاش کندھے پر لیے پھرتا رہا اور اسے دفن نہ کیا اور یا پھر کیا یہ ندامت اس وجہ سے تھی کہ اصولی طور پر انسان ہر برا کام انجام دے لینے کے بعد اپنے دل میں ہر طرح کی پریشانی اور ندامت محسوس کرتا ہے لیکن واضح ہے کہ اس کی ندامت کی جو بھی وجہ ہو وہ اس کے گناہ سے توبہ کی دلیل نہیں ہے کیونکہ توبہ یہ ہے کہ ندامت خوفِ خدا کے باعث اور عمل کے برا ہونے کے احساس کی بنا پر ہو اور یہ احساس اسے اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ آئندہ ہرگز ایسا کام نہیں کرے گا۔ قرآن میں قابیل کی ایسی کسی توبہ کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ بلکہ شاید اگلی آیت میں ایسی توبہ کے نہ ہونے کی طرف ہی اشارہ ہے۔

پیغمبر اسلامؐ سے ایک حدیث منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

"لا تقتل نفس ظلمًا الا کان علی ابن آدم الاول کفل من دمھا لانہ کان اول من سن القتل"[1]

جس کسی انسان کا بھی خون بہایا جاتا ہے اس کی جوابدہی کا ایک حصہ قابیل کے ذمہ ہوتا ہے کہ جس نے انسان کشی کی اس بری سنت کی دنیا میں بنیاد رکھی تھی۔

اس حدیث سے ضمناً یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر بری اور منحوس سنت جو دنیا میں باقی ہے اس کی سزا کا ایک حصہ اس شخص کے کندھے پر ہے جو اس کی بنیاد رکھتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا یہ واقعہ ایک حقیقی واقعہ ہے اس کے علاوہ کہ آیاتِ قرآن اور اسلامی روایات کا ظاہری مفہوم اس کی واقعیت کو ثابت کرتا ہے اس کے "بالحق" کی تعبیر بھی جو ان آیات میں آئی ہے اس بات پر شاہد ہے لہٰذا جو لوگ ان آیات میں بیان کیے گئے واقعہ کو تشبیہ، کنایہ یا علامتی (SYMBOLIC) داستان سمجھتے ہیں، بغیر دلیل کے ایسا کرتے ہیں۔

اس کے باوجود اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ حقیقی واقعہ اس جنگ کے لیے نمونہ کے طور پر بیان کیا گیا ہو جو ہمیشہ سے مردانِ پاکباز، صالح و مقبولِ بارگاہِ خدا انسانوں اور آلودہ، منحرف، کینہ پرور، حاسد اور ناجائز ہٹ دھرمی کرنے والوں کے درمیان

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد ۲ صفحہ ۷۰۳۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ مسند احمد بن حنبل

Marfat.com

جاری رہی ہے۔ وہ لوگ کتنے پاکیزہ اور عظیم ہیں جنھوں نے ایسے بُرے لوگوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔
آخرکار یہ بُرے لوگ اپنے شرمناک اور بُرے اعمال کے انجام سے آگاہ ہوجاتے ہیں اور ان پر پردہ ڈالنے اور انھیں دفن کرنے کے درپے ہوجاتے ہیں اس موقع پر ان کی آرزوئیں ان کی مدد کو لپکتی ہیں۔ کوا ان آرزوؤں کا مظہر ہے جو جلدی سے پہنچتا ہے اور انھیں ان کے جرائم پر پردہ پوشی کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن آخرکار انھیں خسارے، نقصان اور حسرت کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

۳۲۔ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۲۔ اس بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ قرار دیا کہ جو شخص کسی انسان کو بغیر اس کے کہ وہ ارتکاب قتل کرے اور روئے زمین پر فساد پھیلائے قتل کرے تو یہ اس طرح ہے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جو کسی ایک انسان کو قتل سے بچالے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی ہے اور ہمارے رسول واضح دلائل کے ساتھ بنی اسرائیل کی طرف آئے پھر بھی ان میں سے بہت سے لوگوں نے روئے زمین پر ظلم اور تجاوز کیا۔

تفسیر

انسانی رشتہ

حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا ذکر کرنے کے بعد اس آیت میں ایک عمومی نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے:
اس بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ قرار دیا کہ جب کوئی انسان کسی شخص کو ارتکاب قتل اور زمین پر فساد پھیلانے کے جرم کے بغیر قتل کرے تو ایسے ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جو کسی ایک انسان کو موت سے بچالے، ایسے ہے گویا اس نے تمام انسانوں کو موت سے بچالیا (من اجل[1] ذلك كتبنا على بنى اسرائيل انه من قتل نفسًا بغير نفس

---

[1] "اجل" (بروزن "نخل") دراصل "جرم" کے معنی ہیں۔ بعد ازاں ہر اس کام کو اجل کہا جانے لگا جس کا انجام ناگوار ہو اور اب زیادہ تر تعلیل اور کسی چیز کی علت بیان کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

Marfat.com

او فسادا فی الارض فکانما قتل الناس جمیعًا و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعًا)۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ ایک انسان کا قتل سب انسانوں کے قتل کے برابر کیسے ہو سکتا ہے اور اسی طرح ایک انسان کو بچا لینا سب کی نجات کیسے قرار پا سکتا ہے۔

مفسرین نے بہت سے جوابات دیے ہیں تفسیر تبیان میں چھ جواب ہیں، مجمع البیان میں پانچ اور کنز العرفان میں چار جواب دیئے گئے ہیں ان میں سے بعض جوابات تو آیت کے معنی سے بہت دور ہو گئے ہیں۔

بہر حال مذکورہ سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن اس آیت میں ایک اجتماعی اور تربیتی حقیقت بیان کرتا ہے۔ درحقیقت جو شخص کسی بے گناہ کے خون میں ہاتھ رنگتا ہے وہ اس بات پر تیار ہوتا ہے کہ وہ اس مقتول جیسے دیگر بے گناہ انسانوں پر بھی حملہ کر کے انھیں قتل کر دے وہ حقیقت میں ایک درندہ ہے جس کی غذا بے گناہ انسان ہیں ہم جانتے ہیں کہ اس لحاظ سے بے گناہ انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح جو شخص بھی انسانی جذبے اور انسان دوستی کی بنیاد پر ایک انسان کو موت سے نجات دیتا ہے وہ اس بات پر تیار ہوتا ہے کہ ایسا سلوک ہر انسان کے ساتھ کرے۔ وہ بے گناہ انسانوں کی نجات سے لگاؤ رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی نگاہ میں اس انسان میں اور اُس انسان میں کوئی فرق نہیں اور قرآن جو یہ کہتا ہے: فکانما ... . (یعنی ..... یہ ایسے ہے گویا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی موت یا حیات اگرچہ پورے معاشرے کی موت یا حیات کے برابر نہیں لیکن اس سے شباہت ضرور رکھتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانی معاشرہ درحقیقت ایک ہی اکائی ہے اس کے افراد ایک جسم کے اعضاء کی طرح ہیں۔ جو تکلیف اس پیکر کے ایک عضو کو پہنچتی ہے اس کا اثر کم و بیش تمام اعضاء پر ظاہر ہوتا ہے، معاشرہ افراد سے بنتا ہے ایک فرد کی نابودی سے پورے معاشرہ کو نقصان پہنچتا ہے ایک فرد کا فقدان اس کے وجود کے اثرات کی مناسبت سے معاشرے کے ایک حصے کا فقدان ہے یوں یہ نقصان پورے معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح ایک نفس کی زندگی اس جسم کے باقی اعضاء کی زندگی کا سبب ہے کیونکہ ہر کوئی اپنے وجود کی حیثیت کے اعتبار سے انسانی معاشرے کی عظیم عمارت میں اس کی ضرورت و احتیاج کو پورا کرتا ہے، کوئی زیادہ کردار ادا کرتا ہے اور کوئی کم۔

یہ جو بعض روایات میں ہے کہ ایسے انسان کی سزا قیامت میں اس شخص کی سی ہے جس نے تمام انسانوں کو قتل کیا ہو، دراصل یہ بھی اسی مذکورہ مفہوم کی طرف اشارہ ہے نہ یہ کہ ایک انسان ہر لحاظ سے تمام بنی نوع انسان کے برابر ہے اسی لیے ان روایات میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی بہت سے افراد کو قتل کرے تو سزا بھی اسی نسبت سے بڑھ جائے گی۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی نظر میں ایک انسان کی موت یا حیات کس قدر اہمیت رکھتی ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ آیات ایسے ماحول میں نازل ہوئیں جس میں انسانی خون کی کوئی قیمت نہ تھی، اس کی عظمت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

یہ قابل توجہ ہے کہ متعدد روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ آیت ظاہری طور پر اگرچہ مادی موت و حیات کے بارے میں ہے لیکن اس سے زیادہ اہم معنوی موت و حیات ہے یعنی کسی شخص کو گمراہ کرنا یا کسی شخص کو گمراہی سے نجات دلانا۔

Marfat.com

کسی نے امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو آپؑ نے فرمایا:

"من حرق او غرق ـــــ ثم سکت ـــــ ثم قال تأویلها الاعظم ان دعاها فاستجاب له"

یعنی ـــــ قتل کرنے اور موت سے نجات دینے سے آیت میں مراد جلنے سے نجات یا غرق ہونے سے بچانا وغیرہ ہے۔

پھر امامؑ کچھ خاموش ہو گئے، کچھ توقف کے بعد مزید فرمایا:

آیت کی سب سے بڑی تاویل اور سب سے بڑا مفہوم یہ ہے کہ دوسرے کو راہ حق کی طرف دعوت دی جائے یا باطل کی طرف اور وہ یہ دعوت قبول کرلے[1]

دوسرا سوال جو آیت کے بارے میں باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خصوصیت سے بنی اسرائیل کا نام کیوں لیا گیا ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ مذکورہ حکم انہی سے مخصوص نہیں ہے۔

اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ذکر اس لیے ہے کہ ان میں ایسے قتل بہت ہوئے جن کا جذبہ محرکہ حسد اور جاہ طلبی تھا۔ دور حاضر میں بھی بہت سا قتل و خون انہی کے ہاتھوں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ خدائی حکم سب سے پہلے ان کے بارے میں آیا۔

آیت کے آخر میں بنی اسرائیل کی قانون شکنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہمارے پیغمبر روشن دلائل کے ساتھ ان کی ہدایت کے لیے آئے لیکن ان میں سے بہت سوں نے قوانین الٰہی کو توڑ دیا اور تجاوز کا راستہ اختیار کیا (و لقد جاء تهم رسلنا بالبینات ثم ان کثیرًا منهم بعد ذلك فی الارض لمسرفون)۔

توجہ رہے کہ "اسراف" لغت میں وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں حد سے ایسا تجاوز بھی شامل ہے اگرچہ اکثر اوقات مصارف و اخراجات میں تجاوز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۳۳۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ

۳۴۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱ صفحہ ۶۲۰۔ اسی مضمون کی اور روایات بھی موجود ہیں۔

Marfat.com

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ ع

ترجمہ

۳۳- جو لوگ خدا اور پیغمبر سے جنگ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور روئے زمین پر فساد برپا کرتے ہیں (اور ڈرا دھمکا کر لوگوں کی جان و مال اور ناموس پر حملہ کرتے ہیں) ان کی سزا یہ ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے یا ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں (کی چار انگلیوں) کو کاٹ دیا جائے اور یا انھیں انکی زمین سے جلاوطن کر دیا جائے یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کیلیے بہت بڑا عذاب ہے۔

۳۴- مگر وہ جو ان پر تمھارے ہاتھ ڈالنے سے پہلے توبہ کر لیں اور جان لو کہ (خدا ان کی توبہ قبول کرے گا کیونکہ) خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں منقول ہے کہ مشرکین کی ایک جماعت خدمت پیغمبرؐ میں پہنچی اور یہ لوگ مسلمان ہو گئے لیکن مدینہ کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی ان کے رنگ زرد ہو گئے اور وہ بیمار پڑ گئے۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے ان کی صحت کے پیش نظر حکم دیا کہ وہ مدینہ سے باہر ایک صحت افزا صحرائی علاقے میں چلے جائیں، جس میں زکوٰۃ کے اونٹوں کو چرایا جاتا تھا، تاکہ اونٹنیوں کا تازہ دودھ بھی انھیں میسر آسکے۔ وہ صحت مند ہو گئے لیکن پیغمبر اکرمؐ کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے انھوں نے مسلمان چرواہوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے، ان کی آنکھیں نکال لیں، انھیں قتل کرنا شروع کر دیا، زکوٰۃ کے اونٹ لوٹ لیے اور اسلام سے خارج ہو گئے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ انھیں گرفتار کر لیا جائے اور جو سلوک انھوں نے چرواہوں سے کیا ہے قصاص کے طور پر وہی ان سے کیا جائے۔ آنکھیں نکال لی گئیں ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے اور انھیں قتل کر دیا گیا تاکہ دوسرے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسے انسانیت کش افعال کا ارتکاب نہ کریں زیر نظر آیت ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جس میں ان کے بارے میں حکمِ شریعت بیان کیا گیا۔[1]

* * *

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۳۵۲ اور تفسیر قرطبی ج ۳ صفحہ ۲۱۴۵۔

Marfat.com

تفسیر

لوگوں کی جان و مال پر حملہ کرنے والوں کی سزا

یہ آیت حقیقت میں قتلِ نفس کے بارے میں جاری بحث کی تکمیل کرتی ہے اس میں مسلمانوں کے خلاف مسلح ہو کر دھمکیاں دیتے ہوئے بلکہ انھیں قتل کر کے ان کا مال اسباب لوٹنے والوں کی نہایت سخت سزا بیان کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ خدا اور پیغمبر کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں یہ ہے کہ ان چار سزاؤں میں سے کوئی ایک ان پر جاری کی جائے:

پہلی یہ کہ وہ قتل کر دیئے جائیں۔

دوسری یہ کہ انھیں سُولی پر لٹکا دیا جائے۔

تیسری یہ کہ ان کے اُلٹے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔

اور چوتھی یہ کہ وہ جس علاقے میں رہتے ہوں انھیں اس سے جلاوطن کر دیا جائے (انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض)۔

چند اہم نکات

۱۔ خدا اور رسول سے جنگ کرنے سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ روایت اہلِ بیت علیہم السلام میں آیا ہے اور کم و بیش آیت کی شانِ نزول بھی اس کی گواہی دیتی ہے، خدا اور رسول سے جنگ کرنے سے مراد یہ ہے کہ کوئی ڈرا دھمکا کر مسلح ہو کر لوگوں کے جان و مال پر حملہ آور ہو جائے تو چوروں ڈاکوؤں کی طرح شہروں سے باہر ایسا کرے یا شہر کے اندر۔ اس بنا پر وہ بدمعاش لٹیرے جو لوگوں کے جان و مال اور ناموس پر حملہ کرتے ہیں سب اس حکم میں شامل ہیں۔

ضمناً توجہ رہے کہ اس آیت میں بندگانِ خدا کے ساتھ جنگ کو خدا سے جنگ قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اسلام کی نظر میں انسانوں کے حقوق اور ان کے امن و سکون کی کس قدر اہمیت ہے۔

۲۔ ہاتھ پاؤں کاٹنے کا کیا مطلب ہے؟ جیسا کہ فقہی کتب میں نشاندہی کی گئی ہے کہ ہاتھ پاؤں کاٹنے سے مراد اتنی ہی مقدار ہے جو چوری کے بارے میں بیان ہوئی ہے یعنی ہاتھ یا پاؤں کی صرف چار انگلیاں کاٹنا[1]

۳۔ کیا چاروں سزائیں اختیاری ہیں: زیرِ نظر آیت میں چار سزائیں بیان ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے

---

[1] کنز العرفان فی فقہ القرآن ج ۲ صفحہ ۳۵۲

Marfat.com

کہ کیا یہ سزائیں اختیاری حیثیت رکھتی ہیں یعنی حکومت اسلامی ان میں سے جسے جس شخص کیلیے مناسب سمجھے جاری کرے یا جرم کی مناسبت سے ان میں سے سزا اختیار کی جائے گی یعنی اگر حملہ آوروں (ڈاکوؤں) نے بے گناہ لوگوں کو قتل کیا ہے تو ان کے لیے قتل والی سزا انتخاب ہوگی اور اگر مسلح ہوکر لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان کا مال لوٹا ہے تو ان کی انگلیاں کاٹی جائیں گی اور اگر انھوں نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی چرایا ہے تو انھیں قتل کیا جائے گا اور لوگوں کی عبرت کے لیے ان کی لاشیں کچھ عرصے کے لیے سُولی پر لٹکائی جائیں گی اور لوگوں کے خلاف ہتھیار لے کر نکلے ہیں لیکن انھوں نے خون نہیں بہایا اور چوری بھی نہیں کی تو انھیں دوسرے شہر کی طرف جلاوطن کیا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ دوسرا معنی حقیقت سے زیادہ قریب ہے اور یہی مفہوم آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے منقول چند احادیث میں بھی آیا ہے[1]

یہ صحیح ہے کہ کچھ احادیث میں اس سلسلے میں حکومتِ اسلامی کو اختیار حاصل ہونے کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے لیکن جن احادیث کی پہلے بات کی گئی ہے ان کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اختیار سے مراد یہ نہیں کہ حکومت اسلامی ان چار میں سے خود ہی کوئی سزا منتخب کرے اور جرم کی کیفیت کو پیش نظر نہ رکھے کیونکہ یہ بہت بعید ہے کہ قتل اور سولی دیئے جانے کو جلاوطنی کا ہم پلہ قرار دیا جائے یہ سب ایک ہی سطح پر نہیں ہو سکتے۔

اتفاق کی بات ہے کہ آج کی دنیا میں جرائم اور سزا کے بہت سے قوانین میں بھی یہ بات صریح طور پر دیکھی جاتی ہے کہ ایک قسم کے جرم کے لیے متعدد سزائیں مقرر کی جاتی ہیں مثلاً بعض جرائم کے لیے قانون میں تین سے لے کر دس سال تک قید معین کی جاتی ہے اور قاضی کا ہاتھ اس سلسلے میں کھلا رکھا جاتا ہے اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ جج اپنی مرضی سے قید کی مدت کا تعین کرے بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ سزا کی مدت جرم کے خفیف یا شدید ہونے کے حوالے سے معین کرے اور مناسب سزا کا انتخاب کرے۔

اس اہم اسلامی قانون میں بھی حملہ آوروں کے لیے سزا کی کیفیت مختلف بیان کی گئی ہے کیونکہ جرم کی کیفیت بھی اس سلسلے میں مختلف ہوتی ہے اور سب حملہ آور یقیناً ایک جیسے نہیں ہوتے۔

کہے بغیر واضح ہے کہ اسلام نے حملہ آوروں کے بارے میں اتنی شدید سزا اس لیے مقرر کی ہے تاکہ بے گناہوں کے خون، جان و مال اور ناموس کی ہٹ دھرم، منہ زور، اوباش اور فسادی لوگوں کے حملوں اور تجاوزات سے حفاظت کی جائے[2]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ رسوائی اور سزا تو ان کے لیے دنیا میں ہے لیکن صرف اسی سزا پر اکتفا نہیں کی جائے گی بلکہ آخرت میں بھی انھیں سخت سزا دی جائے گی (ذٰلک لھم خزی فی الدنیا و لھم فی الاٰخرۃ عذاب عظیم) اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی حدود اور سزائیں اگر دنیا میں جاری ہو جائیں تو وہ آخرت کی سزاؤں سے

---

[1] نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۶۲۲

[2] سطور بالا میں جو احکام بیان کیے گئے ہیں وہ اجمال اور خلاصہ کے طور پر ہیں اس اسلامی قانون کی تفصیل اور شرائط کا مطالعہ فقہی کتب میں کیا جانا چاہیے۔

Marfat.com

مانع نہیں ہیں۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ لوٹ آنے کا راستہ ایسے خطرناک مجرموں پر بھی بند نہ کیا جائے اور اگر وہ مائل بہ اصلاح ہو جائیں تو ان کے تلافی اور تجدید نظر کا راستہ کھلا رکھا جائے، ارشاد ہوتا ہے: مگر وہ لوگ کہ جو قابو آنے سے پہلے توبہ کر لیں تو عفو الٰہی ان کے شاملِ حال ہوگا اور جان لو کہ خدا غفور و رحیم ہے (الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیھم فاعلموا ان اللہ غفور رحیم)۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں انھیں صرف اس صورت میں سزا نہیں ملے گی کہ اگر وہ پکڑے جانے سے پہلے اپنے ارادے اور رغبت سے اس جرم سے صرفِ نظر کر لیں اور پشیمان ہو جائیں۔

یہاں شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ ان کی توبہ اس کا سبب نہیں بنے گی کہ اگر انھوں نے قتل کیا ہے یا چوری کی ہے تو اس کی سزا انھیں نہیں ملے گی بلکہ صرف اسلحہ اٹھا کر لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کی سزا برطرف ہو جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں صرف حقوق اللہ میں ان کی سزا توبہ کی صورت میں ساقط ہو جائے گی، لیکن حقوق الناس میں صاحبانِ حق کی رضا کے بغیر ساقط نہیں ہوگی (غور کیجیے گا)۔

اس کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ محارب کی سزا عام قاتل یا چور سے زیادہ سخت اور شدید تر ہے لیکن توبہ کرنے سے محارب والی سزا اس سے برطرف ہو جائے گی۔ باقی رہی چور، غاصب یا عام قاتل والی سزا تو وہ اسے ملے گی۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال کیا جائے کہ توبہ تو ایک باطنی امر ہے اسے کس طرح ثابت کیا جائے گا اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ بات ثابت کرنے کے بہت سے راستے ہیں مثلاً دو عادل گواہی دیں کہ فلاں مجلس میں انھوں نے اس کی توبہ سنی ہے اور اس نے بغیر کسی دباؤ کے اپنی رضا و رغبت سے توبہ کی ہے۔ یا مثلاً وہ اپنی زندگی کی روش اور طور طریقہ اس طرح سے بدل لے کہ اس سے توبہ کے آثار ظاہر ہوں۔

۳۵۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

ترجمہ

۳۵۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور قرب خدا کا وسیلہ تلاش کرو اور راہ خدا میں جہاد کرو تاکہ فلاح اور نجات پا جاؤ۔

تفسیر

توسّل کی حقیقت

اس آیت میں روئے سخن اہلِ ایمان کی طرف ہے اور نجات کے لیے انھیں تین حکم دیئے گئے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے

Marfat.com

اے ایمان والو! تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو (یا یھا الذین امنوا اتقوا اللہ) اس کے بعد حکم دیا گیا ہے تقرب الٰہی کا وسیلہ اختیار کرو (وابتغوا الیہ الوسیلۃ) آخر میں راہ خدا میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے (وجاھدوا فی سبیلہ) ان سب احکام پر عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم نجات پا جاؤ گے (لعلکم تفلحون)۔

اس آیت میں جس موضوع کو زیر بحث لایا جانا چاہیے وہ اس میں اہل ایمان کو وسیلہ تلاش کرنے کے لیے دیا جانے والا حکم ہے۔

"وسیلہ" قرب حاصل کرنے کو کہتے ہیں یا اس چیز کو کہتے ہیں جو لگاؤ اور رضا و رغبت سے دوسرے کا قرب حاصل کرنے کا باعث بنے لہٰذا آیت میں لفظ "وسیلہ" ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے اس کے مفہوم میں ہر وہ کام اور چیز شامل ہے جو پروردگار کی بارگاہ مقدس سے قریب ہونے کا باعث ہو اس میں اہم ترین خدا اور پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانا اور جہاد کرنا، نیز نماز، زکوٰۃ، روزہ اور خانہ خدا کا حج، اسی طرح صلہ رحمی، راہ خدا میں پنہاں و یا آشکار خرچ کرنا اور ایسا ہر اچھا اور نیک کام اس کے مفہوم میں داخل ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے:

ان افضل ما توسل بہ المتوسلون الی اللہ سبحانہ و تعالیٰ الایمان بہ و برسولہ والجھاد فی سبیلہ فانہ ذروۃ الاسلام وکلمۃ الاخلاص فانھا الفطرۃ و اقام الصلوٰۃ فانھا الملۃ وایتاء الزکوٰۃ فانھا فریضۃ واجبۃ وصوم شھر رمضان فانہ جنۃ من العقاب وحج البیت واعتمارہ فانھما ینفیان الفقر و یرحضان الذنب، وصلۃ الرحم فانھا مثراۃ فی المال ومنساۃ فی الاجل، وصدقۃ السر فانھا تکفر الخطیئۃ وصدقۃ العلانیۃ فانھا تدفع میتۃ السوء وصنائع المعروف فانھا تقی مصارع الھوان۔

یعنی ..... بہترین چیز جس کے ذریعے اور وسیلے سے تقرب الٰہی حاصل ہو سکتا ہے وہ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لانا اور جہاد کرنا ہے کہ جو کہ ہمارا اسلام کی چوٹی ہے اسی طرح جملہ اخلاص (لا الٰہ الا اللہ) کہ جو وہی فطرت توحید ہے اور نماز قائم کرنا کہ جو آئین اسلام ہے اور زکوٰۃ کہ جو واجب فریضہ ہے اور ماہ رمضان کے روزے کہ جو گناہ اور عذاب خدا کے سامنے سپر ہیں اور حج و عمرہ کہ جو فقر و فاقہ اور پریشانی کو دور کرتے ہیں اور گناہوں کو دھو ڈالتے ہیں اور صلہ رحمی کہ جو مال و ثروت کو زیادہ اور زندگی کو طویل کرتا ہے اور مخفی طور پر خرچ کرنا کہ جو گناہوں کی تلافی کا باعث بنتا ہے اور ظاہری طور پر خرچ کرنا کہ جو ناگہانی اور بری موت کو دور کرتا ہے اور نیک کہ جو انسان کو ذلت و خواری کے گڑھے میں گرنے سے بچاتے ہیں (سب تقرب الٰہی کا وسیلہ ہیں)۔[1]

---

[1] یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ یہاں یہ مقصد ہرگز نہیں کہ کوئی چیز ذات پیغمبر یا امام سے مستقل طور پر مانگی جائے بلکہ مراد اعمال صالح بجا لانا ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

انبیاء، آئمہ اور خدا کے نیک بندوں کی شفاعت بھی کہ جو صراحت قرآنی کے مطابق تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے وسیلہ کے وسیع مفہوم میں داخل ہے۔ اسی طرح پیغمبر اور امام کی پیروی بھی بارگاہِ الٰہی کی قربت کا موجب ہیں یہاں تک کہ خدا کو انبیاء، آئمہ اور صالحین کے مرتبہ و مقام کا واسطہ دینا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے کیونکہ ان کا ذکر دراصل ان کے مقام اور مکتب کو اہمیت دینے کے مترادف ہے۔

جن لوگوں نے زیر نظر آیت کو ان مفاہیم میں سے کسی ایک کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے ان کے پاس درحقیقت اس تخصیص کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ جیسے ہم کہہ چکے ہیں لغوی مفہوم کے لحاظ سے ہر چیز جو تقرب الٰہی کا سبب بنے "وسیلہ" ہے۔

قرآن اور توسّل

قرآن کی دیگر آیات سے بھی اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نیک انسان کے مقام کو بارگاہِ خدا میں وسیلہ قرار دینا اور اسکی وجہ سے خدا سے کوئی چیز طلب کرنا کسی طرح بھی ممنوع نہیں ہے اور یہ توحید کے منافی نہیں ہے سورۂ نساء آیت ۶۴ میں ہے:

ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاء وك فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحيما۔

اور جب ان لوگوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا (اور گناہ کے مرتکب ہوئے) اگر تمھارے پاس آجاتے اور خدا سے مغفرت طلب کرتے اور تم بھی ان کے لیے طلب مغفرت کرتے تو خدا کو توبہ قبول کرنیوالا اور رحیم و مہربان پاتے۔

نیز سورۂ یوسف آیہ ۹۷ میں ہے کہ برادرانِ یوسف نے اپنے باپ سے درخواست کی کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں ان کے لیے استغفار کریں اور حضرت یعقوبؑ نے بھی ان کی اس درخواست کو منظور کر لیا۔

سورۂ توبہ آیت ۱۱۴ میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ہے کہ انھوں نے اپنے باپ[ل] کے لیے طلب مغفرت کی یہ امر بھی دوسرے لوگوں کے لیے انبیاء کی دعا کے مؤثر ہونے کی تائید کرتا ہے اسی طرح قرآن کی دیگر متعدد روایات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) پیغمبر و امام کی پیروی کرنا ہے، ان کی شفاعت کا حصول ہے یا پھر ان کے مقام و مکتب کا واسطہ دینا ہے (جو کہ خود ایک قسم کا احترام ہے اور اس سے واسطہ دینے والے کی نظر میں ان کی حیثیت و مقام کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی ایک قسم کی خدا کی عبادت ہے) اور اس ذریعے خدا سے کچھ مانگا جائے تو اس میں کوئی بوئے شرک نہیں اور نہ ہی یہ قرآن کی دوسری آیات کے خلاف ہے اور نہ ہی یہ زیر بحث آیت کے عمومی مفہوم سے متجاوز ہے (غور کیجیے گا)۔

ل یہ حضرت ابراہیمؑ کے چچا کی طرف اشارہ ہے جنھیں وہ اپنے باپ کے بمنزلہ سمجھتے تھے (مترجم)۔

Marfat.com

روایاتِ اسلامی اور توسّل

بہت سی شیعہ سنی روایات سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ توسل کے مذکورہ مفہوم میں کوئی اشکال نہیں ہے بلکہ یہ ایک اچھا طریقہ شمار ہوتا ہے۔ ایسی روایات بہت زیادہ ہیں اور بہت سی کتب میں مذکور ہیں۔ ہم نمونہ کے طور پر اہلِ سنت کی کتب سے چند روایات نقل کرتے ہیں:

۱۔ کتاب "وفاء الوفا" اہلِ سنت کے ایک مشہور عالم سمہودی کی تالیف ہے اس کتاب میں ہے:

بارگاہِ خدا میں رسول اللہؐ اور ان کے مقام و مرتبہ کے وسیلہ سے آپ کی ولادت سے پہلے، آپ کی ولادت کے بعد، آپ کی رحلت کے بعد، عالمِ برزخ کے دوران میں اور قیامت کے دن، شفاعت طلب کرنا جائز ہے۔

اس کے بعد وہ اس روایت کو نقل کرتے ہیں جس میں ہے کہ حضرت آدمؑ نے پیغمبر اسلام کو وسیلہ قرار دیا چونکہ آپ پیغمبر اسلام کے آئندہ پیدا ہونے کے بارے میں جانتے تھے حضرت آدمؑ نے بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض کیا:

"یا رب اسئلك بحق محمد لما غفرت لی"

خداوندا! بحق محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے[1]

اس کے بعد صاحب "وفاء الوفاء" نے ایک اور حدیث، راویانِ حدیث کی ایک جماعت جس میں نسائی اور ترمذی جیسے مشاہیر علماء شامل ہیں کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے دوران میں توسل کے جواز کے بارے میں بطور شاہد نقل کی ہے حدیث کا خلاصہ یہ ہے:

ایک نابینا نے پیغمبر اکرمؐ سے اپنی بیماری سے شفا کے لیے دعا کی درخواست کی تو پیغمبر اکرمؐ نے اسے حکم دیا کہ اس طرح دعا کرو۔

"اللّٰھم انی اسئلك واتوجه الیك بنبیك محمد نبی الرحمة یامحمد انی توجهت بك الی ربی فی حاجتی لتقضی لی اللّٰھم شفعه فی"

یعنی... خدایا! میں تجھ سے تیرے پیغمبر جو نبیٔ رحمت ہے کے صدقے میں سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اے محمد! میں آپ کے وسیلے سے اپنی حاجت روائی کے لیے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، خدایا! انھیں میرا شفیع قرار دے[2]

اس کے بعد صاحب وفاالوفا نے آنحضرتؐ کے وفات کے بعد آپؐ سے توسل کے جواز میں یہ روایت نقل کی ہے:

---

[1] وفاء الوفاء جلد ۳ صفحہ ۱۳۷۱، کتاب "التوصل الی حقیقۃ التوسل" میں بھی بیہقی کی "دلائل النبوۃ" کے حوالے سے یہ روایت مذکور ہے۔

[2] وفاء الوفا، صفحہ ۱۳۷۲

Marfat.com

حضرت عثمان کے زمانے میں ایک حاجت مند پیغمبر اکرمؐ کی قبر کے پاس آیا اور نماز پڑھ کر اس نے اس طرح دعا کی:

"اللّٰھم انی اسئلك واتوجه الیك بنبینا محمد (ص) نبی الرحمة، یا محمد انی اتوجه بك الی ربك ان تقضی حاجتی."

یعنی ..... خداوندا! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور اپنے پیغمبر جو نبیؐ رحمت کے وسیلے سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اے محمدؐ! میں آپ کے وسیلے سے آپ کے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ میری مشکل آسان ہو جائے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ فوراً اس کی مشکل حل ہو گئی[1]

۲۔ کتاب "التوصل الی حقیقة التوسل" کا مؤلف نے جو توسل کے بارے میں بہت سخت گیر ہے، ۲۶ احادیث مختلف کتب اور مصادر سے نقل کی ہیں جن سے توسل کا جواز ظاہر ہوتا ہے اگرچہ موصوف نے ان احادیث کی اسناد میں کیڑے نکالنے کی کوشش کی ہے لیکن واضح ہے کہ روایات جب بہت زیادہ ہوں اور حد تواتر تک پہنچ جائیں تو پھر سند حدیث میں کوئی خدشہ اور ردوقدح کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور توسل و وسیلہ کے بارے میں منابع اسلامی میں مذکورہ روایات حد تواتر سے بھی زیادہ ہیں۔

ان میں سے ایک روایت صواعق میں اہلِ سنت کے مشہور امام شافعی سے نقل کی گئی ہے وہ اہلِ بیتِ رسولؐ سے متوسّل ہونے کے بارے میں کہتے ہیں:

آل النبی ذریعتی — وھم الیه وسیلتی
ارجو بھم اعطی غدًا — بید الیمین صحیفتی

اہلِ بیتِ رسول میرا وسیلہ ہیں۔
وہ اس کی بارگاہ میں میرے تقرب کا ذریعہ ہیں
میں امید کرتا ہوں کہ ان کے ذریعے سے کل قیامت کے دن
میرا نامہ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا[2]

نیز بیہقی سے صاحبِ صواعق نے نقل کیا ہے کہ خلیفہ دوم کی خلافت کے زمانے میں ایک مرتبہ قحط پڑ گیا، حضرت بلال چند صحابہ کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کی قبر انور کے پاس آئے اور یوں کہنے لگے:

"یا رسول الله استسق لامتك ..... فانھم قد ھلکوا ...."

---

[1] وفاء الوفاء صفحہ ۱۳۷۳

[2] التوصل صفحہ ۳۲۹

Marfat.com

یعنی ــــــ اے رسول خدا! اپنی امت کے لیے اپنے خدا سے باران رحمت طلب کیجیے
ــــــ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ہلاک ہوجائے۔[1]

یہاں تک کہ ابن حجر سے کتاب "الخیرات الحسان" میں منقول ہے کہ امام شافعی جن دنوں بغداد میں تھے امام ابوحنیفہ کی زیارت کے لیے گئے اور اپنی حاجات کے لیے ان سے متوسّل ہوئے۔[2]

نیز صحیح دارمی میں ابوالجوزاء سے منقول ہے:

ایک سال مدینہ میں سخت قحط پڑا تو بعض لوگوں نے حضرت عائشہ سے شکایت کی، انھوں نے کہا: قبر پیغمبر کے اوپر چھت میں ایک سوراخ کریں تاکہ قبر پیغمبر کی برکت سے خدا کی طرف سے بارش نازل ہو، ان لوگوں نے ایسا کیا تو بہت زیادہ بارش برسی۔

تفسیر آلوسی میں مندرجہ بالا احادیث میں سے متعدد نقل کی گئی ہیں اس کے بعد ان کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے حتی کہ ان احادیث کے بارے میں سخت رویہ اختیار کیا گیا ہے آخر میں مجبوراً صاحب تفسیر نے اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے:

ان تمام باتوں کے باوجود میں بارگاہ خدا میں مقام پیغمبرؐ سے متوسل ہونے سے نہیں روکتا، خواہ حیات پیغمبرؐ میں ہو یا آپ کی رحلت کے بعد۔

پھر مزید تفصیلی بحث کے بعد کہا ہے۔

خدا کی بارگاہ میں رسول اللہؐ کے علاوہ کسی اور سے متوسل ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ جسے وسیلہ بنایا جائے وہ بارگاہِ الٰہی میں مقام و منزلت رکھتا ہو۔[3]

رہیں شیعہ کتب تو ان میں یہ بات اتنی واضح ہے کہ کوئی حدیث نقل کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

چند قابل توجہ باتیں

۱۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ توسل سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شخص پیغمبرؐ یا آئمہؑ سے حاجت طلب کرے بلکہ مقصد یہ ہے کہ انکے مقام و منزلت کو بارگاہِ خدا میں رابطے کا وسیلہ قرار دے یہ درحقیقت خدا کی طرف ہی توجہ کرنا ہے کیونکہ پیغمبرؐ کا احترام بھی اس بنا پر ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے تھے اور انھوں نے اسی راہ میں قدم بڑھایا ہے ہمیں ایسے لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو اس قسم کے توسل کو شرک کی ایک قسم خیال کرتے ہیں حالانکہ شرک تو یہ ہے کہ خدا کی صفات اور افعال میں کسی کو خدا کا شریک سمجھا جائے لیکن ایسا توسل جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کسی طرح سے بھی شرک سے مشابہ نہیں ہے۔

۲۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ کی حیات اور وفات میں فرق کریں حالانکہ مذکورہ روایات جن میں سے اکثر وفات کے بعد کے زمانے سے مربوط ہیں سے قطع نظر بھی ایک مسلمان کی نظر میں انبیاء اور آئمہ علیہم السلام وفات کے بعد برزخ میں ایسی حیات رکھتے ہیں جیسی قرآن نے شہداء کے بارے میں بیان کی ہے اور کہا ہے:

---

[1] التوصل صفحہ ۲۵۳ [2] التوصل صفحہ ۳۲۱ [3] روح المعانی جلد ۴، ج ۶، صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵۔

Marfat.com

انھیں مُردہ نہ سمجھو بلکہ وہ تو زندہ ہیں۔ (آل عمران ..... ۱۶۹)

۳۔ بعض پیغمبر اکرمؐ سے دعا کی درخواست کرنے اور خدا کو ان کے مقام کی قسم دینے میں بھی فرق پر اصرار کرتے ہیں وہ دعا کی درخواست کو جائز سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ کو ممنوع سمجھتے ہیں حالانکہ منطقی طور پر ان میں کوئی فرق نہیں۔

۴۔ اہلِ سنت کے بعض مؤلفین اور علماء خصوصاً وہابی حضرات بڑی ہٹ دھرمی سے توسّل کے سلسلے میں وارد ہونے والی روایات کو ضعیف ثابت کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ وہ فضول اور بے بنیاد اعتراضات کے ذریعے انھیں طاق نسیاں کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی بحث اس طرح سے ہوتی ہے کہ ایک غیر جانبدار شخص محسوس کرتا ہے کہ عقیدہ انھوں نے پہلے بنا لیا ہے اور پھر اپنے عقیدے کو روایاتِ اسلامی پر ٹھونسنا چاہتے ہیں اور جو کچھ ان کے عقیدے کے خلاف ہے اسے راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ایک محقق ایسی غیر منطقی اور تعصب آمیز بحث کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔

۵۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں توسل والی روایات حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں یعنی اس قدر زیادہ ہیں کہ ہمیں اسناد کی تحقیق سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں صحیح روایات بھی بہت سی ہیں لہٰذا بعض دیگر کی اسناد میں ردوقدح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۶۔ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ روایات جو اس آیہ کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں اور ان میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ لوگوں سے فرماتے تھے کہ خدا سے میرے لیے وسیلہ کی دعا کرو۔ یا کتاب کافی میں حضرت علیؑ کا یہ فرمان کہ "وسیلہ" جنت میں بالاترین مقام ہے ——— ایسی روایات آیت کی مذکورہ بالا تفسیر کے منافی نہیں ہیں کیونکہ جیسے ہم نے بارہا نشاندہی کی ہے، وسیلہ میں تقرب پروردگار کا ہر مفہوم شامل ہے اور خدا سے پیغمبر اکرمؐ کا تقرب اور جنت میں بلند ترین درجہ اس کا ایک مصداق ہے۔

۳۶۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

۳۷۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْهَا ۫ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ۝

ترجمہ

۳۶۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں، اگر روئے زمین میں جو کچھ ہے اس کے برابر ان کے پاس ہو اور وہ روزِ قیامت

Marfat.com

سزا سے نجات کے لیے فدیہ کے طور پر دے دیں تو بھی ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

۳۷۔ وہ ہمیشہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل آئیں لیکن وہ اس سے نکل نہ پائیں گے، اور ان کے لیے پائیدار عذاب ہوگا۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں مومنین کو تقویٰ، راہ جہاد اور وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا گیا تھا اب ان دو آیات میں گذشتہ حکم کا سبب بیان کرنے کے حوالے سے بے ایمان اور آلودۂ گناہ افراد کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، جو لوگ کافر ہوگئے ہیں اگر جو کچھ روئے زمین میں ہے اس جتنا سرمایہ رکھتے ہوں اور اسے روز قیامت سے سزا سے نجات کے لیے دے دیں تو ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا (ان الذین کفروا لوان لهم ما فی الارض جمیعًا و مثله معه لیفتدوا به من عذاب یوم القیٰمة ما تقبل منهم ولهم عذاب الیم)۔

یہی مضمون سورۂ رعد آیہ ۱۸ میں بھی ہے۔ اس سے خدائی سزا کے بارے میں انتہائی تاکید ظاہر ہوتی ہے اور یہ کہ کسی بھی سرمائے اور طاقت کے ذریعے اس سے رہائی حاصل نہیں کی جا سکتی چاہے وہ سرمایہ ساری زمین کے برابر یا اس سے بھی زیادہ کیوں نہ ہو، نجات فقط ایمان، تقویٰ، جہاد اور عمل ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد اس سزا کے دائمی ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ ہمیشہ چاہیں گے کہ جہنم کی آگ سے باہر نکل آئیں لیکن نکل نہ سکیں گے اور ان کی سزا باقی اور برقرار رہے گی (یریدون ان یخرجوا من النار وما هم بخارجین منها ولهم عذاب مقیم)۔

دائمی سزا اور کفار کے دوزخ میں ہمیشہ رہنے کی بحث انشاء اللہ سورۂ ہود آیہ ۱۰۸ کے ذیل میں آئے گی۔

۳۸۔ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

۳۹۔ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

۴۰۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

Marfat.com

ترجمہ

۳۸۔ چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ اس کے انجام دیئے گئے عمل کی پاداش میں خدائی سزا کے طور پر کاٹ دو ، خدا توانا اور حکیم ہے۔

۳۹۔ لیکن جو شخص ظلم کرنے کے بعد توبہ ، اصلاح اور تلافی کرلے تو خدا اس کی توبہ قبول کرلے گا، کیونکہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۴۰۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ خدا آسمانوں اور زمین کا مالک اور حکمران ہے جسے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) سزا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) بخش دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

چور کی سزا

قبل ازیں چند آیات میں "محارب"، یعنی ڈرا دھمکا کر علی الاعلان مسلح ہو کر لوگوں کی جان و مال اور ناموس کے خلاف حملہ کرنے والے شخص کے بارے میں احکام بیان ہوئے ہیں۔ اسی مناسبت کی بنا پر ان آیات میں چور کہ جو مخفی طور پر لوگوں کا مال لے جاتا ہے، کے بارے میں حکم بیان ہوا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دو (والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما)۔ یہاں چور مرد کو چور عورت پر مقدم رکھا گیا ہے چونکہ چوری کے سلسلے میں اصلی عامل زیادہ تر مرد ہوتے ہیں لیکن ارتکاب زنا کے موقع پر زیادہ اہم عامل اور محرک بے لگام عورتیں ہوتی ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ سزا ان اعمال پر ہے جو انھوں نے انجام دیئے ہیں اور یہ خدا کی طرف سے عذاب ہے (جزاء بما کسبا نکالا من اللہ)۔ اس جملے میں درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ اول تو یہ سزا ان کے کام کا نتیجہ ہے اور ایسی چیز ہے جو انھوں نے خود اپنے لیے خریدی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک طرح سے پیش بندی اور حق و عدالت کی طرف بازگشت ہے کیونکہ "نکال" کا معنی ہے ایسی سزا جو پیش بندی کے لیے اور ترک گناہ کے مقصد کے لیے ہو۔ دراصل اس لفظ کا معنی ہے "لگام" بعد ازاں ہر اس کام کے لیے استعمال ہونے لگا جو انحراف اور کج روی سے روکے۔

آیت کے آخر میں اس لیے کہ مبادہ یہ وہم ہو کہ مذکورہ سزا عادلانہ نہیں ، فرمایا گیا ہے، خدا قادر و توانا ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ کسی سے انتقام لے اور حکیم بھی ہے اس لیے وہ کسی کو بلاوجہ سزا نہیں دیگا (واللہ عزیز حکیم)۔

Marfat.com

بعد والی آیت میں ان کے لیے لوٹ آنے کا راستہ کھولتے ہوئے فرماتا ہے: اس ظلم کے بعد جو شخص توبہ کرلے اور اصلاح و تلافی کی راہ اپنائے خدا اسے بخش دے گا کیونکہ وہ بخشنے والا مہربان ہے (فمن تاب من بعد ظلمه واصلح فان الله يتوب عليه ان الله غفور رحيم)

کیا توبہ کرنے سے صرف اس کا گناہ بخشا جائے گا یا چوری کی سزا (ہاتھ کاٹنا) بھی ساقط ہوجائے گی۔ اس سلسلے میں ہمارے فقہاء میں یہی مشہور ہے کہ اگر وہ اسلامی عدالت میں چوری ثابت ہوجانے سے پہلے توبہ کرلے تو چوری کی حد بھی برطرف ہوجائے گی لیکن جب دو عادل گواہوں کے ذریعے اس کا جُرم ثابت ہوجائے تو پھر توبہ سے حد ساقط نہیں ہوگی۔

دراصل حقیقی توبہ جس کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ ہے جو عدالت میں ثبوت جرم سے پہلے انجام پائے ورنہ تو ہر چور جب اپنے آپ کو سزا کے سامنے پائے گا اظہار توبہ کرے گا اور اس طرح تو کسی پر سزا جاری ہی نہ ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں "اختیاری توبہ" وہ ہے جو شرعی عدالت میں جرم ثابت ہونے سے پہلے انجام پائے ورنہ "اضطراری توبہ" ہوگی اور اضطراری توبہ تو ایسی ہے جیسے عذابِ الٰہی یا آثارِ موت دیکھ کر کی جائے اور ایسی توبہ کی کوئی قیمت نہیں۔

چوروں کے بارے میں توبہ کا حکم بیان کرنے کے بعد روئے سخن اسلام کے عظیم پیغمبرؐ کی طرف کیا گیا ہے، فرمایا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ خدا آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور جس طرح مناسب سمجھتا ہے ان میں تصرف کرتا ہے، جس شخص کو سزا کا مستحق سمجھتا ہے سزا دیتا ہے اور جسے بخشش کے لائق سمجھتا ہے بخش دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (الم تعلم ان الله له ملك السمٰوت والارض يعذب من يشاء و يغفر لمن يشاء والله على كل شیء قدير)۔

چند اہم نکات

۱۔ چور کو سزا دینے کی شرائط: دیگر احکام کی طرح اس حکم میں قرآن نے بنیادی بات بیان کی ہے اس کی تفصیل سنتِ پیغمبرؐ پر چھوڑ دی ہے۔ روایاتِ اسلامی سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی اس اسلامی حد کے اجراء کے لیے بہت سی شرائط ہیں جن کے بغیر اسے جاری کرنا جائز نہیں ہے ان میں سے کچھ شرائط یہ ہیں:

(i) چوری کیا ہوا مال کم از کم ایک چوتھائی دینار کی مالیت کا ہونا چاہیے۔[1]

(ii) مال محفوظ جگہ سے مثلاً گھر، دوکان یا اندر کی جیب سے چوری کیا جائے۔

(iii) چوری قحط سالی کے زمانے میں جبکہ لوگ بھوک زدہ ہوتے ہیں اور انھیں کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی، نہ ہوئی ہو۔

(iv) چور عاقل و بالغ ہو اور اس نے حالتِ اختیار میں یہ کام کیا ہو۔

(v) باپ کا بیٹے کے مال سے چوری کرنا یا ایک شریک کا شرکت والے مال سے چوری کرنا اس حکم میں نہیں آتا۔

(vi) باغ کے درختوں سے پھل کی چوری کو بھی اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] دینار سے مراد ہے سکہ دار سونے کا ایک مثقالِ شرعی اور مثقالِ شرعی برابر ہے ۱۸ چنے کے دانوں کے یعنی عام مثقال کا ۳/۴ حصہ

Marfat.com

(viii) ہر وہ موقع جہاں چور کے لیے اشتباہ کا احتمال ہو کہ اس نے دوسرے کے مال کو اشتباہ سے اپنا مال سمجھتے ہوئے لیا ہے بھی اس حکم سے مستثنیٰ ہوگا۔

کچھ اور شرائط بھی ہیں جن کی تفصیل فقہی کتب میں آئی ہے۔

اشتباہ نہ ہو کہ مذکورہ شرائط کی صورت ہی میں چوری حرام ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ مذکورہ حد کا اجراء ان شرائط سے مخصوص ہے ورنہ چوری تو ہر شکل وصورت، ہر مقدار، اور ہر کیفیت سے اسلام میں حرام ہے۔

۲۔ **ہاتھ کاٹنے کی مقدار:** روایات اہل بیت علیہم السلام سے استفادہ کرتے ہوئے ہمارے فقہا میں مشہور یہی ہے کہ دائیں ہاتھ کی صرف چار انگلیاں کاٹی جائیں نہ کہ اس سے زیادہ۔ اگرچہ فقہاء اہل سنت اس سے زیادہ کے قائل ہیں۔

۳۔ **کیا یہ سخت سزا ہے؟:** مخالفینِ اسلام اور کچھ ناواقف مسلمانوں کی طرف سے بارہا یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ اسلامی سزا بہت سخت ہے اور اگر آج کی دنیا میں یہ سزا نافذ ہو جائے تو بہت سے ہاتھ کٹ جائیں، علاوہ ازیں اس حکم کے اجراء سے ایک شخص نہ صرف اپنے بدن کے ایک اہم حصے سے محروم ہو جائے گا بلکہ ساری عمر کے لیے لوگوں کی انگشت نمائی کا شکار بھی ہو جائے گا۔

اس سوال کے جواب میں ان حقائق کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

(i) جیسا کہ ہم نے اس حکم کی شرائط میں کہا ہے کہ یہ حکم ہر چور کے لیے نہیں ہے، بلکہ چوروں کے ایک خطرناک گروہ کے لیے ہے۔

(ii) اس جرم کے ثبوت کے لیے اسلام میں چونکہ خاص شرائط معین ہیں لہٰذا اس سے بہت کم لوگوں پر یہ سزا جاری ہوگی۔

(iii) کم معلومات رکھنے والے لوگ جو بہت سے اعتراضات اسلامی قوانین پر کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے وہ ایک حکم کو مستقل طور پر دوسرے تمام احکام سے الگ کر کے بحث کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اس حکم کو سو فی صد غیر اسلامی معاشرے میں فرض کرتے ہیں لیکن اگر ہم توجہ رکھیں کہ اسلام صرف اسی ایک حکم کا نام نہیں بلکہ وہ احکام کے ایک مجموعے کا نام ہے اور اگر یہ تمام احکام کسی معاشرے پر حکمران ہوں تو عدالتِ اجتماعی وجود میں آجائے، فقر و تنگدستی کے خلاف جنگ کی جائے، تعلیم و تربیت صحیح طور پر آداب و اخلاق، آگاہی، بیداری اور تقویٰ کا دور دورہ ہو۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس حکم کے زیر اثر آنے والے لوگوں کی تعداد کس قدر کم ہوگی۔

کہیں اشتباہ نہ ہو، مقصد یہ نہیں کہ آج کے مختلف معاشروں میں یہ حکم جاری نہ ہو بلکہ مراد یہ ہے کہ فیصلہ اور قضاوت کرتے وقت ان تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھنا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام افراد کو بنیادی ضروریات مہیا کرے، انھیں ضروری تعلیم دلائے اور ان کی اخلاقی تربیت کرے واضح ہے کہ پھر ایسے ماحول میں غلط کار افراد بہت کم ہوں گے۔

(iv) اگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ چور زیادہ ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا حکم جاری نہیں ہوا لہٰذا جس علاقے میں یہ اسلامی حکم

Marfat.com

جاری ہوتا ہے (مثلاً سعودی عرب میں گذشتہ سالوں میں یہ حکم جاری ہوتا تھا) وہاں بہت اچھا مالی امن امان ہوتا ہے۔ خانہ خدا کے بہت سے زائرین سوٹ کیس، بٹوے اور تھیلے حجاز کے گلی کوچوں میں پڑے دیکھتے ہیں انھیں کوئی شخص ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کرتا یہاں تک کہ گمشدہ چیزوں کے ادارے کے مامورین آتے ہیں اور انھیں اس ادارے میں لے جاتے ہیں اور مالک نشانی بتا کر لے جاتے ہیں اسی طرح رات کو بغیر دروازوں کے اکثر دکانیں کھلی پڑی رہتی ہیں اور کوئی ان میں چوری نہیں کرتا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ اسلامی حکم اگرچہ صدیوں تک جاری ہوتا رہا اور اس کی پناہ میں صدر اسلام کے مسلمان امن و امان کی زندگی بسر کرتے رہے لیکن صدیوں میں گنتی کے صرف چند افراد پر یہ حکم جاری ہوا۔

ایک ملّت کی صدیوں کی زندگی کے لیے اگر چند غلط کار افراد کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں تو کیا یہ کوئی زیادہ قیمت ہے۔

۴۔ ایک اعتراض کا جواب: بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک چوتھائی دینار کی چوری پر حد کا اجراء کیا مسلمان کی جان کے بارے میں احترامات کے اسلامی احکام کے منافی نہیں کیونکہ اسلام تو مسلمان کے لیے ہر قسم کی گزند سے محفوظ رہنے کا قائل ہے اور ایک انسان کی چار انگلیاں کاٹنے کی دیت اسلام نے بہت زیادہ معین کی ہے۔

جیسا کہ بعض تواریخ سے معلوم ہوتا ہے، اتفاقاً یہی سوال اسلام کے ایک عظیم عالم مرحوم سید مرتضیٰ علم الہدیٰ سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہوا تھا۔ سائل نے شعر کی صورت میں اپنا سوال یوں پیش کیا:

يد بخمس مئين عسجد وديت

مابالها قطعت في ربع دينار

یعنی ـــــــ وہ ہاتھ جس کی دیت پانچ سو دینار ہے[1]، ایک چوتھائی دینار کے بدلے کیوں کاٹا جاتا ہے۔

سید مرتضیٰ نے اس کے جواب میں یہ شعر ارشاد فرمایا:

عز الامانة اغلاها وارخصها

ذل الخيانة فافهم حكمة البارى

یعنی ـــــــ امانت کی عزت نے اس ہاتھ کو گراں قیمت بنا دیا تھا لیکن خیانت کی ذلت نے اس کی قیمت گرا دی، تم ذرا حکمتِ الٰہی کو سمجھو[2]

۴۱۔ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا

---

[1] توجہ رہے کہ پانچسو دینار پانچ انگلیاں کاٹنے پر ہے، لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں فقہائے اہل بیتؑ کے نزدیک چوری میں چار انگلیاں کاٹی جاتی ہیں۔

[2] تفسیر آلوسی جلد ۳ صفحہ ۶ پر بھی یہ واقعہ منقول ہے لیکن وہاں سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کی بجائے علم الدین سخاوی کا نام آیا ہے۔

Marfat.com

بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا ۛ سَمّٰعُونَ
لِلْكَذِبِ سَمّٰعُونَ لِقَوْمٍ اٰخَرِينَ ۙ لَمْ يَاْتُوكَ ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ
بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُولُونَ اِنْ اُوتِيتُمْ هٰذَا فَخُذُوهُ وَاِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ
فَاحْذَرُوا ۚ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۚ
اُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ
وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○
۴۲۔ سَمّٰعُونَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُونَ لِلسُّحْتِ ۚ فَاِنْ جَآءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ
اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوكَ شَيْـًٔا ۚ وَاِنْ حَكَمْتَ
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ○

ترجمہ

۴۱۔ اے (خدا کے) رسول! وہ لوگ جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کے دل ایمان نہیں لائے اور وہ راہِ کفر میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں، تم ان کے بارے میں غم نہ کرو اور یونہی یہودیوں کے بارے میں (جو اسی راہ پر چلتے ہیں) وہ زیادہ آپ کی باتیں سنتے ہیں تاکہ انھیں تمھاری تکذیب کے لیے کوئی بات ہاتھ آجائے وہ دوسرے لوگوں کے جاسوس ہیں جو لوگ خود تمھارے پاس نہیں آئے۔ وہ باتوں کو ان کی جگہ سے بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ (جو ہم چاہتے ہیں) تمھیں دیں (اور محمد تمھاری خواہش کے مطابق فیصلہ کریں) تو اسے قبول کر لو، ورنہ دُوری اختیار کرو (اور اس پر عمل نہ کرو) اور جسے خُدا (اس کے پے در پے گناہوں کی وجہ سے) سزا دینا چاہے تو کوئی اسے بچا نہیں سکتا وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کی پاکی نہیں چاہتا۔ انھیں دنیا میں رسوائی نصیب ہوگی اور آخرت میں وہ عذاب عظیم سے دوچار ہوں گے۔

Marfat.com

۴۲۔ وہ تمھاری باتیں بہت غور سے سنتے ہیں تاکہ انھیں جھٹلائیں وہ مالِ حرام زیادہ کھاتے ہیں۔ اگر وہ تمھارے پاس آئیں تو ان کے درمیان قضاوت کرو یا (اگر مصلحت ہو) تو انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دو اور اگر ان سے صرف نظر کر لو تو وہ تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر ان کے درمیان فیصلہ کرو تو عدالت سے کام لو کہ خدا عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں متعدد روایات ہیں ان میں سے زیادہ واضح روایت وہ ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

خیبر کے یہودیوں کے ایک بڑے آدمی نے جو شادی شدہ تھا، ایک شوہر دار عورت سے خلاف عفت کام کیا وہ عورت بھی خیبر کے ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

تورات میں اس سلسلے میں سنگساری کا حکم تھا، یہودی اس کے اجراء میں پریشان تھے اور ایسے حل کی تلاش میں تھے، جس میں دونوں کی معافی ہو جائے اور اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو احکام الٰہی کا پابند بھی کہیں۔

انھوں نے اپنے ہم مذہب اہلِ مدینہ کو پیغام بھیجا کہ وہ اس حادثہ کے بارے میں پیغمبرؐ اسلام سے حکم دریافت کریں (تاکہ اگر اسلام میں اس سے کوئی آسان حکم ہو تو اسے انتخاب کر لیا جائے ورنہ اس سے بھی صرف نظر کر لیا جائے اور شاید اس طرح سے وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ پیغمبرؐ اسلام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائیں اور اپنے آپ کو مسلمانوں کا دوست ظاہر کریں)۔

اسی مقصد کے لیے مدینہ کے بڑے یہودی پیغمبرؐ اسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا: میں جو حکم کروں گا کیا اسے قبول کرو گے؟

وہ کہنے لگے، ہم اسی لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔

اس موقع پر زنائے محصنہ کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سنگسار کیے جانے کا حکم نازل ہوا لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا (اور عذر یہ پیش کیا کہ ہمارے مذہب میں تو ایسا حکم نہیں آیا)۔

پیغمبرؐ اسلام نے مزید فرمایا: یہ وہی حکم ہے جو تمھاری تورات میں بھی آیا ہے کیا تم اس بات سے اتفاق کرتے ہو کہ میں تم میں سے ایک شخص کو فیصلے کے لیے بلاؤں اور جو کچھ وہ تورات سے بیان کرے اسے قبول کر لوں۔

وہ کہنے لگے: جی ہاں۔

Marfat.com

پیغمبرؐ اسلام نے فرمایا: ابن صوریا.... جو کہ فدک میں رہتا ہے، کیسا عالم ہے؟

وہ بولے: وہ تو تورات کا سب سے بڑا عالم ہے۔

کسی کو اسے لینے کے لیے بھیجا گیا جب وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچا تو آپؐ نے اس سے فرمایا: تجھے اس خدائے یکتا کی قسم دیتا ہوں جس نے تورات کو موسیٰؑ پر نازل کیا، تمھارے لیے دریا شگاف کیا، تمھارے دشمن فرعون کو غرق کیا اور تمھیں بیابان میں اپنی نعمتوں سے نوازا.... کہو کیا ایسے موقع پر تورات میں تمھارے لیے سنگسار کرنے کا حکم نازل ہوا ہے یا نہیں؟

وہ کہنے لگا: آپ نے مجھے ایسی قسم دی ہے کہ میں مجبور ہو گیا ہوں کہ کہوں جی ہاں! ایسا ہی حکم تورات میں موجود ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: پھر اس حکم کے اجراء کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟

وہ بولا: حقیقت یہ ہے کہ ہم گذشتہ زمانے میں یہ حد عام افراد پر تو جاری کر دیتے تھے لیکن دولتمندوں اور بڑے لوگوں پر نہیں کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ ہمارے معاشرہ کے خوش حال طبقوں میں یہ گناہ رائج ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ایک سردار کا چچا زاد بھائی اس قبیح عمل کا مرتکب ہوا اور حسب معمول اسے سزا نہ دی گئی۔ اسی اثنا میں ایک عام آدمی اس کا مرتکب ہوا۔ جب اسے سنگسار کرنے لگے تو اس کے رشتہ داروں نے اعتراض کیا اور کہنے لگے اگر یہ حکم جاری ہونا ہے تو پھر دونوں پر ہو، اس صورت حال کے پیش نظر ہم بیٹھ گئے اور سنگسار کے قانون کی جگہ ایک آسان قانون بنا لیا اور وہ یہ تھا کہ ہر ایک کو چالیس کوڑے لگائے جائیں اور ان کا منہ کالا کر کے اور سواری پر بٹھا کر انھیں گلی کوچوں میں پھرایا جائے۔

اس وقت پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ اس مرد اور عورت کو مسجد کے سامنے سنگسار کیا جائے۔[1]

پھر آپؐ نے فرمایا: خدایا! میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا، جبکہ یہودی اسے ختم کر چکے تھے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

تفسیر

دوست اور دشمن کے درمیان فیصلہ

زیر نظر آیات اور بعد کی چند آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے قاضی حق رکھتے ہیں کہ مخصوص شرائط کے ساتھ غیر مسلموں کے

[1] بیہقی نے اپنی سنن جلد ۸ صفحہ ۲۴۶ میں جو روایت نقل کی ہے۔ اس کے مطابق علماءِ یہود جب پیغمبرؐ اسلام کی خدمت میں آئے تھے تو اس عورت اور مرد کو بھی ساتھ لائے تھے۔

Marfat.com

مقدمات کا بھی فیصلہ کریں، تفصیل آیات کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔

زیرِ نظر آیات میں سے پہلی آیت یا ایھا الرسول (اے بھیجے ہوئے) سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں یہ تعبیر صرف دو جگہ پر نظر آتی ہے ایک اس مقام پر اور ایک اسی سورہ کی آیہ ۶۷ میں جہاں ولایت وخلافت کے مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے، معاملہ چونکہ اہم ہے اور دشمن کا خوف بھی ہے لہٰذا چاہتا ہے پیغمبر میں احساس مسئولیت کو اور متحرک کرے اور ان کے ارادے کو تقویت پہنچائے یہ کہتے ہوئے کہ تو صاحبِ رسالت ہے اور رسالت بھی بھاری .... اس لیے حکم بیان کرنے میں استقامت اور پامردی سے کام لو۔

اس کے بعد پیغمبر کی دلجوئی اور تسلی کے لیے بعد والے حکم کی تمہید کے طور پر فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ زبان سے ایمان کے دعویدار ہیں اور ان کا دل ہرگز ایمان نہیں لایا اور کفر میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں وہ تمھارے غم واندوہ کا سبب نہ بنیں (کیونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے) (لا یحزنک الذین یسارعون فی الکفر من الذین قالوا اٰمنا بافواھھم ولم تؤمن قلوبھم)۔

بعض کا نظریہ ہے کہ "یسارعون فِی الکفر" اور "یسارعون الی الکفر" میں فرق ہے کیونکہ پہلا جملہ ایسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے جو کافر ہیں اور کفر کے اندر غوطہ زن ہیں اور کفر کے آخری مرحلے تک پہنچنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں ہیں لیکن دوسرا جملہ ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو باہر سے کفر کی چاردیواری کی طرف حرکت میں ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت کر رہے ہیں۔[۱]

منافقین اور داخلی دشمنوں کی کارستانیوں پر ان کی حوصلہ شکنی کے بعد خارجی دشمنوں اور یہودیوں کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، اسی طرح یہودیوں میں سے بھی جو لوگ اس راہ پر چل رہے ہیں وہ بھی تمھارے لیے حزن وملال کا باعث نہ ہوں (ومن الذین ھادوا)۔

اس کے بعد ان کے منافقانہ افعال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ تمہاری باتوں کو بڑے غور سے سنتے ہیں لیکن ان کی یہ توجہ اطاعت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ انھیں تمھاری تکذیب کے لیے اور تم پر افترا باندھنے کے لیے کوئی عذر ہاتھ آجائے (سمّٰعون للکذب)۔

اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ: وہ اپنے گذشتہ لوگوں کے جھوٹ اور افتراء کی طرف زیادہ کان دھرتے ہیں، لیکن حق بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔[۲]

ان کی ایک اور صفت یہ ہے کہ یہ نہ صرف جھوٹ باندھنے کے لیے تمھاری مجلس میں آتے ہیں بلکہ جو لوگ تمہارے پاس نہیں آتے ان کے جاسوس کا کردار بھی ادا کرتے ہیں (سمّٰعون لقوم اٰخرین لم یأتوک)۔

---

[۱] المنار ج ۶ صفحہ ۳۸۸

[۲] پہلی صورت میں "للکذب" کی لام "لام تعلیل" ہے اور دوسری صورت میں "لام تعدیہ" ہے۔

Marfat.com

دوسری تفسیر کے مطابق وہ اپنے گروہ کے حکم پر کان دھرتے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی حکم اپنی منشاء کے مطابق سُن لیں تو اسے قبول کر لیتے ہیں اور اگر کوئی حکم ان کے میلانِ طبع کے خلاف ہے تو اس کی مخالفت کرتے ہیں لہٰذا وہ اپنے بڑوں کا فرمان سنتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں نہ کہ تمھاری ۔ ان حالات میں ان کی مخالفت تمھارے لیے باعثِ غم و اندوہ نہیں ہونا چاہیے ، کیونکہ وہ ابتداء سے ہی تمھارے پاس قبولِ حق کی غرض سے نہیں آئے ۔ ان کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ کلامِ الٰہی میں تحریف کرتے ہیں (چاہے تحریفِ لفظی ہو یا تحریفِ معنوی) جس حکم کو وہ اپنے مفاد اور ہوا و ہوس کے خلاف سمجھتے ہیں اس کی کوئی توجیہ کر لیتے ہیں یا اسے بالکل مسترد کر دیتے ہیں (یحرفون الکلم من بعد مواضعہ)۔[1]

زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ تمھارے پاس آنے سے پہلے ہی پختہ ارادہ کر لیتے ہیں ان کے بڑوں نے انھیں حکم دیا ہے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوئی حکم ہماری خواہش کے مطابق دے تو اسے قبول کر لو اور اگر ہماری خواہش کے خلاف ہو تو اس سے دور رہو (یقولون ان اوتیتم ھٰذا فخذوہ وان لم توتوہ فاحذروا)۔

وہ اس طرح سے گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اپنے ان افکار و نظریات میں اتنے پختہ ہیں کہ بغیر کسی سوچ بچار اور تحقیق و مطالعہ کے جو کچھ بھی ان کے تحریف شدہ مطالب کے خلاف ہو اسے رد کر دیتے ہیں اس طرح ان کی ہدایت کی کوئی امید نہیں اور خدا چاہتا ہے کہ اس ذریعے سے سزا دے کہ انھیں رسوا کرے اور جس کی سزا اور رسوائی کا خدا ارادہ کر لے تو تم ہرگز اس کا دفاع نہیں کر سکتے (ومن یرد اللہ فتنتہ فلن تملک لہ من اللہ شیئاً)۔

وہ اس قدر آلودہ ہیں کہ ان کی آلودگی دھلنے کے قابل نہیں ہے لہٰذا وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کو پاک نہیں کرنا چاہتا (اولٰئک الذین لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم) کیونکہ خدا کا کام ہمیشہ حکمت آمیز ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اپنے ارادے سے زندگی کا ایک حصّہ کجروی میں گزار چکے ہیں اور نفاق ، جھوٹ ، مخالفتِ حق اور قوانینِ الٰہی میں تحریف کا جرم کر چکے ہیں ان کے لیے پلٹنا عادتاً ممکن نہیں ہے ۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے ، وہ اس دنیا میں بھی رسوا ہوں گے اور آخرت میں بھی انھیں عذابِ عظیم ہوگا (لھم فی الدنیا خزی ولھم فی الاٰخرۃ عذاب عظیم)۔

دوسری آیت میں قرآن دوبارہ تاکید کرتا ہے کہ ان کے سننے والے کان تو تمھاری بات سن کر اس کی تکذیب کرنے کے لیے ہیں یا پھر وہ اپنے بڑوں کے جھوٹ سننے کے لیے گوش شنوا رکھتے ہیں (سمّٰعون للکذب) یہ جملہ تاکید کے طور پر ہے اور اس بُری صفت کے اثبات کے لیے تکرار ہے ۔

اس کے علاوہ وہ ناحق ، حرام اور رشوت زیادہ کھاتے ہیں (اکّالون للسحت)۔[2]

---

[1] تحریف کی کیفیت اور اقسام کے بارے میں اسی سورہ کی آیت ۱۳ کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے ۔

[2] "سحت" (بروزن "جفت") دراصل درخت کے چھلکا اتارنے اور شدید بھوک کے معنی میں ہے بعد ازاں ناجائز مال اور خصوصاً رشوت کے لیے بولا جانے لگا کیونکہ ایسا مال معاشرے سے تازگی ، پاکیزگی اور برکت چھین لیتا ہے جیسے درخت سے چھلکے اتار دیئے جائیں تو اس پر پژمردگی چھا جاتی ہے اور وہ خشک ہو جاتا ہے اس بنا پر "سحت" کا ایک وسیع معنی ہے اگر بعض روایات میں اس کا کوئی خاص مصداق بیان کیا گیا ہے تو وہ اختصاص کی دلیل نہیں ہے ۔

Marfat.com

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر ایسے لوگ فیصلہ حاصل کرنے کے لیے ان کی طرف رجوع کریں تو وہ احکام اسلام کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کر سکتے ہیں اور یہ بھی کہ ان سے منہ پھیر بھی سکتے ہیں (فان جاءوك فاحكم بينهم اواعرض عنهم)۔

البتہ یہاں یہ مراد نہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کسی ذاتی میلان کی بنیاد پر کوئی راستہ اپنائیں بلکہ مراد یہ ہے کہ حالات و اوضاع کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر مصلحت ہو تو حکم جاری کریں ورنہ صرف نظر کر لیں۔

روحِ پیغمبر کی تقویت کے لیے مزید فرمایا گیا ہے: اگر مصلحت اس میں ہو کہ ان سے منہ پھیر لو تو وہ تمھیں کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے (و ان تعرض عنهم فلن يضروك شيئًا)۔

اور اگر ان کے درمیان فیصلہ کرنا چاہو تو یقیناً تمھیں اصولِ عدالت کو ملحوظ رکھنا چاہیے کیونکہ خدا، حق، انصاف اور عدالت کے مطابق فیصلہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (و ان حكمت فاحكم بينهم بالقسط ان الله يحب المقسطين)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومتِ اسلامی کو آج بھی یہ اختیار ہے کہ وہ غیر مسلموں کے بارے میں احکامِ اسلام کے مطابق فیصلہ کرے یا فیصلہ کرنے سے اعراض کرے۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ اسلامی ماحول میں جو شخص بھی زندگی بسر کرتا ہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، حقوق اور جزا و سزا کے اسلامی قوانین سب کے بارے میں یکساں ہیں۔ اس بنا پر مندرجہ بالا آیت کا حکم یا تو منسوخ ہو چکا ہے یا غیر ذمی کفار سے مخصوص ہے (یعنی وہ کفار جو ایک اقلیت کے طور پر اسلامی ملک میں زندگی بسر نہیں کرتے لیکن مسلمانوں کے ساتھ معاہدوں میں شریک ہیں اور ان سے میل جول رکھتے ہیں)

بعض دیگر حضرات کا نظریہ ہے کہ اسلامی حکومت اس وقت بھی غیر مسلموں کے بارے میں یہ اختیار رکھتی ہے کہ وہ حالات و اوضاع کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصلحت سمجھے تو ان کے بارے میں احکامِ اسلام کے مطابق فیصلہ کرے اور یا انھیں ان کے اپنے قوانین کی طرف رجوع کرنے کی اجازت دے دے (تفصیلی مطالعہ اور تحقیق کے لیے فقہی کتب میں قضاوت کی بحث سے رجوع کریں)

۴۳- وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۴۳- وہ کس طرح تجھے فیصلہ کے لیے بلاتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات ہے اور اس میں خدا کا حکم موجود ہے (اور پھر) فیصلہ کے بعد انھوں نے چاہا کہ تجھ سے منہ پھیر لیں اور وہ مومن نہیں ہیں۔

Marfat.com

تفسیر

گذشتہ آیت میں پیغمبر اکرمؐ سے یہودیوں کے فیصلہ طلب کرنے کا ذکر تھا یہ آیت بھی اسی معاملے کے بارے میں ہے۔ یہاں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ کس طرح تجھے فیصلہ کے لیے بلاتے ہیں جب کہ تورات ان کے پاس ہے اور اس میں خدا کا حکم بھی آچکا ہے (وکیف یحکمونك وعندھم التورىة فیھا حکم الله)۔

یاد رہے کہ زنائے محصنہ کے مرتکب مرد عورت کو سنگسار کرنے کا مذکورہ حکم موجودہ تورات کے سفر تثنیہ فصل بائیس میں موجود ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ وہ تو تورات کو ایک منسوخ کتاب نہیں مانتے اور دین اسلام کو باطل سمجھتے ہیں اس کے باوجود وہ تورات کے ان احکام کو چھوڑ کر جو ان کی طبیعت کے مطابق نہیں ہیں ایسے حکم کی تلاش کرتے ہیں جو اصولی طور پر ان کے موافق نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ تجھے فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کر لینے کے بعد تیرا حکم قبول نہیں کرتے کہ جو حکم تورات کے مطابق ہے کیونکہ یہ حکم ان کے میلان اور رغبت کے خلاف ہے (ثم یتولون من بعد ذٰلک) حقیقت یہ ہے کہ وہ ایمان ہی نہیں رکھتے ورنہ احکام خدا کے ساتھ ایسا کھیل نہ کھیلتے (وما اولٰئك بالمؤمنین)۔

ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ مندرجہ بالا آیت یہ کیونکر کہتی ہے کہ حکم خدا تورات میں مذکور ہے حالانکہ قرآنی آیات اور تاریخی اسناد سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات تحریف شدہ کتاب ہے اور یہی تحریف شدہ کتاب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھی۔

اس سلسلے میں توجہ رہے کہ اول تو ہم تمام تورات کو تحریف شدہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کے کچھ حصے کو واقع کے مطابق جانتے ہیں اور اتفاق کی بات ہے کہ زیر بحث حکم غیر تحریف شدہ احکام میں سے ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تورات جو کچھ بھی تھی یہودیوں کے نزدیک تو ایک آسمانی کتاب تھی جو تحریف شدہ نہیں سمجھی جاتی تھی لہٰذا ان حالات میں کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس پر عمل نہ کریں۔

۴۴۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○

Marfat.com

ترجمہ

۴۴- ہم نے تورات کو نازل کیا کہ جس میں ہدایت اور نور تھا اور انبیاء کہ جو حکم خدا کے سامنے تسلیم تھے اس کے مطابق یہودیوں میں فیصلہ کرتے تھے اور (اسی طرح) علماء بھی اس کتاب کے مطابق حکم کرتے تھے کہ جو ان کے سپرد تھی اور وہ اس پر گواہ تھے اس بنا پر (آیاتِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کے بارے میں) لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیات معمولی قیمت پر نہ بیچو اور جو لوگ خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

تفسیر

زیرِ نظر اور آئندہ آیت گزشتہ بحث کی تکمیل کرتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی آسمانی کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے، ہدایت حق کی طرف راہنمائی کے لیے اور نور جہل و نادانی کی تاریکیوں کو دور کرنے کے لیے (انا انزلنا التوراة فیھا ھدی و نور)۔

اس بنا پر وہ پیغمبرانِ خدا جو حکم خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے تھے اور نزولِ تورات کے بعد مصروفِ کار تھے، سب یہودیوں کے لیے اس کے مطابق حکم کرتے تھے (یحکم بھا النبیون الذین اسلموا للذین ھادوا)

صرف وہی ایسا نہ کرتے تھے بلکہ یہودیوں کے بزرگ علماء اور صاحبِ ایمان پاکباز دانشور اس آسمانی کتاب کے ہی مطابق فیصلہ کرتے تھے جو ان کے سپرد کی گئی تھی اور وہ اس پر گواہ تھے (و الربانیون و الاحبار بما استحفظوا من کتاب اللہ و کانوا علیہ شھداء)۔[1]

یہاں روئے سخن اہلِ کتاب کے ان علماء کی طرف ہے جو اس زمانے میں موجود تھے ارشاد ہوتا ہے: لوگوں سے نہ ڈرو اور خدا کے حقیقی احکام بیان کرو اور چاہیے تو یہ کہ میری مخالفت سے ڈرو کیونکہ اگر تم نے حق کو چھپایا تو تمھیں سزا دی جائے گی (فلا تخشوا الناس و اخشون) اور اسی طرح آیاتِ خدا کو کم قیمت پر نہ بیچو (و لا تشتروا

---

[1] "ربانی" کے معنی اور اس کے اصلی مادہ کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد دوم ص۔۔ (اردو ترجمہ) میں بحث کی جا چکی ہے نیز "احبار" "حبر" (بروزن "فکر") کی جمع ہے اور اسی طرح بروزن "ابر" ہو تو اس کا معنی ہے "نیک اثر"۔ بعد ازاں یہ لفظ ایسے علماء کے بارے میں استعمال ہونے لگا جو معاشرے میں اچھا اور نیک اثر رکھتے ہوں۔ دوات کی سیاہی کو بھی "حبر" اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ نیک آثار رکھتی ہے۔

Marfat.com

بآیاتی ثمنا قلیلا)۔

دراصل حق کو چھپانے کی وجہ یا لوگوں کا خوف ہے یا پھر ذاتی مفاد کا حصول بہرحال جو کچھ بھی ہو ضعفِ ایمان کی دلیل اور مقامِ انسانیت کی نفی ہے اور مندرجہ بالا جملوں میں دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ایسے اشخاص کے بارے میں آیت کے آخر میں قطعی فیصلہ صادر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

جو لوگ احکامِ خدا کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک هم الکافرون)۔

واضح ہے کہ حکمِ خدا کے مطابق فیصلہ نہ کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ خاموش رہا جائے اور بالکل کوئی فیصلہ نہ کیا جائے اور اپنی خاموشی سے لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیا جائے اور یہ بھی کہ بات کی جائے اور حکمِ خدا کے خلاف فیصلہ دیا جائے۔

یہ بھی واضح ہے کہ کفر کے کئی مراتب اور مختلف درجات ہیں اور یہ اصل وجودِ خدا کے انکار سے شروع ہوتا ہے اور اس کی نافرمانی اور معصیت تک جا پہنچتا ہے۔ کیونکہ ایمانِ کامل انسان کو حکمِ خدا کے مطابق عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور وہ جو عمل نہیں کرتے ان کا ایمان کامل نہیں ہے۔

یہ آیت ہر اُمت کے علماء اور دانشوروں پر عائد ہونے والی بھاری ذمہ داری اور جوابدہی کو واضح کرتی ہے۔ آیت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے گرد رونما ہونے والے معاشرتی طوفانوں اور حوادث کا مقابلہ کریں۔ کجرویوں کے خلاف فیصلہ کن انداز میں ڈٹ جائیں اور کسی سے خوف نہ کھائیں۔

۴۵۔ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِۦ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُۥ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ ۝

ترجمہ

۴۵۔ اور ہم نے اس (تورات) میں ان (بنی اسرائیل) کے لیے مقرر کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان ہے اور ہر زخم کے لیے قصاص ہے اور اگر کوئی (قصاص سے صرف نظر کرتے ہوئے) اسے بخش دے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ شمار ہوگا اور

Marfat.com

جو شخص خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

تفسیر

قصاص اور درگذر

اس آیت میں ان حدود الٰہی کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے جو تورات میں ہیں، فرمایا گیا ہے: ہم نے تورات میں قانونِ قصاص مقرر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو قتل کر دے تو مقتول کے اولیاء قاتل کو اس کے بدلے قتل کر سکتے ہیں (وکتبنا علیهم فیها ان النفس بالنفس)۔

اور اگر کوئی دوسرے کی آنکھ کو نقصان پہنچائے اور اسے ختم کر دے تو وہ اس کی آنکھ نکال سکتا ہے (والعین بالعین)

اسی طرح کسی کی ناک کاٹنے کے بدلے جائز ہے کہ مجرم کی ناک کاٹی جائے (والانف بالانف)۔

نیز کان کاٹنے کے بدلے مدمقابل کا کان کاٹا جا سکتا ہے (والاذن بالاذن)۔

اور اگر کوئی کسی کا دانت توڑ دے تو وہ بھی اس کا دانت توڑ سکتا ہے (والسن بالسن)۔

اسی طرح جو بھی کسی کو کوئی زخم لگائے تو وہ اس کے بدلے قصاص لے سکتا ہے (والجروح قصاص)

لہٰذا حکمِ قصاص بغیر کسی نسلی، طبقاتی، اجتماعی، قبائلی اور شخصی امتیاز کے جاری ہوگا اور اس سلسلے میں کسی کے لیے بھی کسی پہلو سے کوئی فرق اور تبعیض نہیں ہے (البتہ دیگر اسلامی احکام کی طرح اس حکم کی بھی کچھ شرائط ہیں جو فقہی کتب میں موجود ہیں کیونکہ یہ حکم بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں ہے اسلام میں بھی اس کی نظیر موجود ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۷۸ میں مذکور ہے کہ جو آیہ قصاص ہے)۔

ناروا امتیازات اور تفریقات جو اس زمانے میں مروج تھیں انھیں یہ آیت ختم کرتی ہے جیسا کہ بعض تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں یہودِ مدینہ کے دو گروہوں میں ایک عجیب عدمِ مساوات موجود تھی اور وہ یہ کہ بنی نضیر کا کوئی شخص بنی قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو اس سے قصاص نہ لیا جاتا لیکن اس کے برعکس بنی قریظہ کا کوئی شخص بنی نضیر کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو وہ اس کے بدلے قتل کیا جاتا۔

جب مدینہ میں اسلام آیا تو بنی قریظہ نے اس بارے میں پیغمبر اسلامؐ سے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا،

خون کسی کا ہو کوئی فرق نہیں۔

اس پر بنی نضیر اعتراض کرنے لگے اور کہنے لگے:

آپ ہمارا مقام نیچے لے آئے ہیں اور اسے پست کر دیا ہے۔

زیرِ نظر آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی اور انھیں بتایا گیا کہ نہ صرف اسلام میں بلکہ یہودیوں کے دین میں بھی مساوات کا

Marfat.com

یہ قانون موجود ہے[1]

لیکن اس بنا پر کہ کہیں یہ گمان نہ ہو کہ خدا نے قصاص کو لازمی قرار دیا ہے اور مقابلہ بمثل کی دعوت دی ہے، مزید فرمایا گیا ہے: اگر کوئی اپنے حق سے درگذر کرے اور عفو و بخشش سے کام لے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ شمار ہو گا اور جس طرح[2] اس نے درگذر سے کام لیا ہے خدا اس سے درگذر کرے گا (فمن تصدق بہ فھو کفارۃ لہ)۔

گویا قصاص ایک صدقہ و عطیہ ہے جو مجرم کو بخش دیا گیا ہے یہاں "تصدق" کی تعبیر اور خدا کی طرف سے "تصدق" کرنے والے کو عفو کا وعدہ، یہ سب کچھ عفو و درگذر کا شوق پیدا کرنے کے لیے ہے۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ قصاص کے ذریعے کھوئی ہوئی چیز تو ہاتھ میں نہیں آسکتی یہ تو فقط وقتی سکون و اطمینان دیتا ہے لیکن خدا کی طرف سے عفو و بخشش کا وعدہ دراصل ایک دوسری صورت میں اس کی تلافی ہے جو وہ ہاتھ سے دے بیٹھا ہے اور اس طرح سے اس کی پریشانی ختم ہو جاتی ہے اور یہ ایسے لوگوں کے لیے عمدہ اور بہترین تشویق ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

جو شخص معاف کر دیتا ہے، خدا بھی اسی طرح اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے[3]

یہ جملہ درحقیقت ان لوگوں کے لیے ایک دندان شکن جواب ہے جو قانون قصاص کو غیر عادلانہ سمجھتے ہیں اور اسے ایک آدم کش قانون قرار دیتے ہیں، پوری آیت پر غور و خوض سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص کی اجازت مجرموں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہے تا کہ بے گناہ لوگ ان کے اقدام جرم سے مامون رہیں لیکن اس کے باوجود عفو و بازگشت کا راستہ بھی کھلا رکھا گیا ہے۔ خوف و امید کی یہ کیفیت پیدا کرتے ہوئے اسلام چاہتا ہے کہ ظلم و زیادتی کو بھی روکے اور جتنا ہو سکے اور مناسب ہو خون کو خون سے پاک کرنے کی پیش بندی بھی کرے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ خدا کے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظٰلمون)۔

اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہو گا کہ ہم جھوٹے احساسات اور جذبات سے مغلوب ہو کر قاتل سے اس بہانے سے صرف نظر کرلیں کہ خون کو خون سے نہ دھویا جائے اور قاتلوں کے ہاتھ دوسرے لوگوں کو قتل کرنے کے لیے کھلے چھوڑ دیں، اور اس طرح سے بے گناہوں پر ظلم و ستم کریں۔

[1] توجہ رہے کہ موجودہ تورات میں بھی سفر خروج کی اکیسویں فصل میں ہے کہ:
اور اگر دوسرے کو اذیت پہنچائی گئی ہو تو اس وقت جان کے عوض جان دی جائے۔ آنکھ کے

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۳ صفحہ ۲۱۸۸

[2] بہت سے مفسرین نے آیت کے بارے میں ایک اور احتمال بھی پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ "لہ" کی ضمیر مجرم کے بارے میں ہے اس طرح آیت کا معنی یہ ہو گا: جو شخص اپنے حق سے درگذر کرے تو اس سے جان کا قصاص برطرف ہو جائے گا اور یہ اس کے عمل کا کفارہ شمار ہو گا لیکن آیت کا ظہور وہی ہے جو ذکر ہو چکا ہے۔

[3] نور الثقلین ج ۱ ص ۶۳۷

Marfat.com

عوض آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں اور جلانے کے بدلے جلایا جائے، زخم کے عوض زخم اور تھپڑ کے بدلے تھپڑ[1]

۴۶۔ وَقَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ

۴۶۔ اور ان (گذشتہ انبیاء) کے بعد ہم نے عیسٰی کو مقرر کیا تاکہ اس سے پہلے جو تورات میں بھیجا گیا تھا اس کی تصدیق کرے اور ہم نے اسے انجیل دی کہ جس میں ہدایت اور نور تھا اور اس کی یہ آسمانی کتاب بھی) تورات کی تصدیق کرتی تھی جو اس سے پہلے تھے اور متقیوں کے لیے ہدایت اور موعظہ ہے۔

تفسیر

تورات سے مربوط آیات کے بعد یہ آیت انجیل کی کیفیت بیان کر رہی ہے ارشاد ہوتا ہے، گذشتہ رہبروں اور پیغمبروں کے بعد ہم نے مسیح کو مبعوث کیا جبکہ اس کی نشانیاں بالکل ان نشانیوں کے مطابق تھیں جو تورات نے بیان کی تھیں (وقفینا علی آثارھم بعیسی ابن مریم مصدقا لما بین یدیہ من التورٰۃ)۔

اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ حضرت مسیح نے تورات کی حقانیت کا اعتراف کیا کہ جو حضرت موسیٰ بن عمران پر نازل ہوئی تھی جیسے تمام آسمانی پیغمبر اپنے سے پہلے انبیاء کی حقانیت کے معترف تھے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے انجیل سونپی کہ جس میں ہدایت اور نور تھا (و آتیناہ الانجیل فیہ ھدی و نور)

قرآن مجید میں تورات، انجیل اور قرآن تینوں کو نور کہا گیا ہے۔ تورات کے بارے میں ہے:

انا انزلنا التورٰۃ فیہا ھدی و نور (مائدہ - ۴۴)

---

[1] سفر خروج۔ جملہ ۲۳، ۲۴ اور ۲۵

Marfat.com

انجیل کے بارے میں تو مندرجہ بالا آیت شاہد ہے اور قرآن کے بارے میں ہے:

"قد جاءکم من الله نور وکتاب مبین"

(مائدہ - ۱۵)

درحقیقت جیسے تمام موجوداتِ عالم اپنی زندگی کے تسلسل کے لیے نور کے سخت محتاج ہیں۔ اسی طرح خدا کے دین اور آسمانی کتب کے احکام و قوانین انسانوں کے رشد و تکامل اور ارتقاء کے لیے ناگزیر ہیں۔ اصولی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ تمام توانائیوں اور حرکات اور زیبائیوں کا سرچشمہ نور ہے اور نور نہ ہو تو خاموشی اور موت تمام جگہوں پر چھا جائے۔ اسی طرح پیغمبروں کی تعلیمات نہ ہوں تو تمام انفرادی و اجتماعی انسانی قدریں موت کی نیند سو جائیں اور اس کے نمونے ہم مادی معاشروں میں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

قرآن نے کئی ایک مقامات پر تورات اور انجیل کو آسمانی کتاب کے عنوان سے یاد کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ دونوں کتابیں اصل میں خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں لیکن یہ بھی مسلّم ہے کہ اپنے پیغمبروں کے بعد یہ دونوں آسمانی کتابیں تحریف کی نذر ہو گئیں کچھ حقائق ان میں سے کم کر دیئے گئے اور کچھ بے ہودہ باتیں اور خرافات ان میں شامل کر دی گئیں اور یوں ان کی قدر و قیمت گرا دی گئی یا یہ کہ اصلی کتب تو بھلا دی گئیں اور کچھ اور کتب نے ان کی جگہ لے لی۔ جن میں کچھ حصہ اصلی کتب کا بھی تھا[لہ] لہٰذا نور کا اطلاق اصلی تورات اور انجیل پر ہوتا ہے۔ تحریف شدہ کتب پر نہیں۔

دوبارہ بطور تاکید فرمایا گیا ہے کہ: نہ صرف یہ کہ عیسیٰ بن مریم، تورات کی تصدیق کرتے تھے بلکہ ان کی آسمانی کتاب انجیل بھی تورات کی صداقت پر گواہ تھی (مصدقا لما بین یدیه من التورٰة)۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے: یہ آسمانی کتاب پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت کا سرمایہ ہے (وھدًی وموعظةً للمتقین)۔

یہ تعبیر بھی ویسی ہی ہے جیسی سورۂ بقرہ کی ابتداء میں قرآن کے بارے میں آئی ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے:

ھدی للمتقین

یعنی...... قرآن پرہیزگاروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے۔

نہ صرف قرآن بلکہ تمام آسمانی کتب اسی طرح پرہیزگاروں کی ہدایت کا ذریعہ ہیں۔ پرہیزگاروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کی تلاش میں رہتے ہیں اور اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ و تیار رہتے ہیں۔ واضح ہے کہ جو لوگ ہٹ دھرمی اور دشمنی کی بنا پر اپنے دل کا دریچہ حق کے سامنے بند کر لیتے ہیں وہ کسی بھی حقیقت سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔

لہ تورات اور انجیل میں تحریف اور اس کی تاریخی اسناد کے بارے میں زیادہ وضاحت کے لیے کتاب "الھدیٰ الی دین المصطفیٰ" اور "انیس الاعلام" کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں پہلے انجیل کے بارے میں " فیہ ھدًی " کہا گیا ہے اور بعد میں بطور مطلق " ھدی " کہا گیا ہے۔ تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ انجیل اور دوسری آسمانی کتب میں ہر شخص کے لیے بلا استثناء ہدایت کے دلائل موجود ہیں لیکن پرہیزگاروں کے لیے کہ جو اس میں دقت نظر کرتے ہیں وہ ہدایت تربیت، تکامل اور ارتقاء کا باعث ہے۔

۴۷۔ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ○

ترجمہ

۴۷۔ ہم نے اہل انجیل (پیروانِ مسیح) سے کہا کہ جو کچھ خدا نے اس میں نازل کیا ہے وہ اس کے مطابق حکم کریں اور جو لوگ اس کے مطابق حکم نہیں کرتے جو خدا نے نازل کیا ہے، وہ فاسق ہیں۔

تفسیر

وہ جو قانونِ الٰہی کے مطابق حکم نہیں کرتے

گذشتہ آیات میں انجیل کے نازل ہونے کا ذکر ہے۔ اب اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے اہل انجیل کو حکم دیا کہ جو کچھ خدا نے اس میں نازل کیا ہے اس کے مطابق حکم اور فیصلہ کریں (و لیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ)۔

اس میں شک نہیں کہ اس جملے سے یہ مراد نہیں کہ قرآن عیسائیوں کو یہ حکم دے رہا ہے کہ انھیں اس وقت انجیل کے احکام پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ یہ بات تو قرآن کی دیگر آیات اور خود وجود قرآن سے مناسبت نہیں رکھتی کہ جو نئے آئین اور دین کا اعلان کر رہا ہے، پرانے دین کو منسوخ کر رہا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم نے عیسیٰ پر انجیل نازل کرنے کے بعد اس کے پیروکاروں کو حکم دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں اور اس کے مطابق فیصلے کریں۔[1]

آیت کے آخر میں پھر بطور تاکید فرماتا ہے: جو لوگ حکم خدا کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ فاسق ہیں (و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الفاسقون)۔

---

[1] درحقیقت اسی طرح جیسے بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ "قلنا" یہاں مقدر ہے اور آیت کا مفہوم ہے: و قلنا لیحکم اھل الانجیل......

Marfat.com

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ان آیات میں ایک مقام پر انھی افراد کو "کافر" کہا گیا ہے۔ دوسرے مقام پر "ظالم" قرار دیا گیا ہے اور تیسرے مقام پر "فاسق" کہا گیا ہے۔ تعبیر میں یہ فرق ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ ہر حکم تین پہلو رکھتا ہے۔ ایک طرف سے وہ قانون بنانے والے (خدا) پر منتہی ہوتا ہے دوسری طرف قانون جاری کرنے والے (حاکم و قاضی) تک پہنچتا ہے اور تیسری طرف اس شخص کہ جس پر قانون جاری ہو رہا ہے (محکوم) تک پہنچتا ہے۔ گویا ہر تعبیر تین میں سے ایک پہلو کیطرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ جو شخص خدا کے ایک حکم کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ ایک طرف سے قانونِ الٰہی کو پاؤں تلے روند کر "کفر" اختیار کرتا ہے۔ دوسری طرف ایک بے گناہ انسان پر "ظلم" کرتا ہے اور تیسری طرف وہ اپنی ذمہ داری اور مسئولیت کی سرحد سے انحراف کر کے "فاسق" بن جاتا ہے جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ فسق کا معنی بندگی اور مسئولیت کی سرحد سے تجاوز ہے۔

۴۸۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ۝

ترجمہ

۴۸۔ اور اس کتاب کو ہم نے حق کے ساتھ تم پر نازل کیا جبکہ یہ گذشتہ کُتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی محافظ و نگہبان ہے لہٰذا خدا نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کے مطابق حکم کرو اور ان کے ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور احکامِ الٰہی سے منہ نہ پھیرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے واضح آئین اور طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمّت قرار دیتا لیکن خدا چاہتا ہے کہ اس نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے اس میں تمھیں آزمائے (اور تمھاری صلاحیتوں کی نشو و نما کرے) اس لیے تم کوشش کرو اور نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ۔ تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور جس میں تم نے اختلاف کیا ہے وہ تمھیں اس کی

Marfat.com

خبر دیتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد اس آیت میں قرآن کے مقام مرتبے کا تذکرہ ہے "مھیمن" دراصل ایسی چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی محافظ، شاہد، امین اور نگہدار ہو۔ قرآن چونکہ گذشتہ آسمانی کتب کے اصولوں کی مکمل حفاظت و نگہداری کرتا ہے اور ان کی تکمیل کرتا ہے لہذا اسے "مھیمن" قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے ہم نے اس آسمانی کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے، جبکہ یہ گذشتہ کتب کی تصدیق کرتا ہے (اور اس کی نشانیاں اور علامات اس کے مطابق ہیں جو گذشتہ کتب نے بتائی ہیں) اور یہ ان کا محافظ و نگہبان ہے (وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقاً لما بین یدیہ من الکتاب و مھیمناً علیہ)۔

بنیادی طور پر تمام آسمانی کتابیں اصولِ مسائل میں ہم آہنگ ہیں اور سب کا ہدف و مقصد ایک ہی ہے یعنی سب انسانی تربیت، ارتقاء اور تکامل کے درپے ہیں اگرچہ فروعی مسائل میں تکامل و ارتقاء کے تدریجی قانون کے مطابق مختلف ہیں اور ہر نیا دین بالاتر مرحلے کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور جامع تر پروگرام پیش کرتا ہے۔

"مصدقاً لما بین یدیہ" کے بعد "مھیمناً علیہ" کا ذکر اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی گذشتہ کتب کے اصول کی تصدیق کرتے ہوئے قرآن جامع ترین پروگرام پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد حکم دیا گیا ہے کہ جب ایسا ہے تو ان احکام کے مطابق فیصلہ کرو جو تم پر نازل ہوئے ہیں (فاحکم بینھم بما انزل اللہ) یہ جملہ فاء تفریع کے ساتھ آیا ہے جو گذشتہ ادیان کے احکام کی نسبت احکامِ اسلام کی جامعیت کا نتیجہ ہے۔ یہ حکم گذشتہ آیات کے اس حکم کے منافی نہیں کہ جن میں پیغمبر کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ان کے درمیان خود فیصلہ کریں یا انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ کیونکہ یہ آیت کہتی ہے کہ جب اہلِ کتاب کے درمیان فیصلہ کرنا چاہو تو قرآن کے احکام کے مطابق فیصلہ کرو۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ احکامِ الٰہی کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال لیں، تم ان کے ہوا و ہوس اور خواہشات کی اتباع نہ کرو۔ اور حق میں سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس سے منہ نہ پھیرو (ولا تتبع اھوائھم عما جاءک من الحق)۔

بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے: تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے دین، شریعت، طریقہ اور واضح راستے کا تعین کر دیا ہے (لکل جعلنا منکم شرعۃ و منھاجا) "مشرع" اور "شریعۃ" اس راستے کو کہتے ہیں جو پانی کی طرف جاتا ہو اور وہاں جا کر ختم ہوتا ہو اور دین کو شریعت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حقائق اور ایسی تعلیمات تک پہنچتا ہے جو پاکیزگی، طہارت اور انسانی زندگی کا سرمایہ ہیں "نھج" اور "منھاج" واضح راستے کو کہتے ہیں راغب نے مفردات میں ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

Marfat.com

"شرعة" اور "منهاج" میں یہ فرق ہے کہ "شرعة" اسے کہا جاتا ہے جو قرآن میں وارد ہوا ہے اور منہاج سے مراد وہ امور ہیں جو سنتِ پیغمبرؐ میں وارد ہوئے ہیں۔

یہ فرق اگرچہ جاذبِ نظر ہے لیکن اس کے لیے کوئی قطعی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے[1]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: خدا میں یہ طاقت تھی کہ وہ تمام لوگوں کو ایک ہی امت قرار دے دیتا اور سب کو ایک ہی دین کا پیرو بنا دیتا لیکن یہ بات تدریجی تکامل کے قانون اور مختلف تربیتی مراحل کے اصول سے مناسبت نہیں رکھتی تھی (ولو شاء الله لجعلكم امة واحدة ولكن ليبلوكم فيما اٰتاكم)۔

ليبلوكم فيما اٰتاكم — یعنی تاکہ تمھیں ان چیزوں کے متعلق آزمائے جو تمھیں دی گئی ہیں۔

یہ جملہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اور وہ یہ کہ خدا نے وجودِ انسانی میں مختلف قسم کی استعدادیں اور صلاحیتیں پیدا کی ہیں اور وہ آزمائشوں کے ذریعے اور تعلیماتِ انبیاء کے ذریعے لوگوں کی تربیت اور پرورش کرتا ہے۔ اسی لیے ایک مرحلہ طے کرنے کے بعد انھیں بالاتر مرحلے میں لے جاتا ہے ایک دور کے ختم ہونے پر دوسرے پیغمبر کے ذریعے بالاتر دور میں لے جاتا ہے بالآخر تمام اقوام و ملل کو مخاطب کر کے دعوت دیتا ہے کہ بجائے اس کے کہ اپنی توانائیاں اختلافات و مشاجرات میں صرف کرو، نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو (فاستبقوا الخيرات) کیونکہ سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور وہی روزِ قیامت ان چیزوں سے آگاہ کرے گا، جن میں تم اختلاف کرتے ہو (الى الله مرجعكم جميعًا فينبئكم بما كنتم فيه تختلفون)۔

۴۹۔ وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ‌ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّصِيۡبَهُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ‌ؕ وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ ○

۵۰۔ اَفَحُكۡمَ الۡجَاهِلِيَّةِ يَبۡغُوۡنَ‌ؕ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكۡمًا لِّقَوۡمٍ

---

[1] بعض بزرگ مفسرین کا نظریہ ہے کہ دین اور شریعت کے درمیان فرق یہ ہے کہ دین توحید اور دیگر اصول سے عبارت ہے جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں اسی لیے دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے لیکن شریعت ایسے قوانین و احکام کو کہا جاتا ہے جو ان مذاہب میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن ہمارے پاس اس فرق کے لیے بھی کوئی واضح دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں الفاظ بہت سے مواقع پر ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

Marfat.com

يُوْقِنُوْنَ ۝ ؑ

ترجمہ

۴۹- اور ان (اہل کتاب) کے درمیان تمھیں اس کے مطابق حکم کرنا چاہیے جو خدا نے نازل کیا ہے اور انکی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور اس سے بچو کہ کہیں تمھیں وہ بعض ایسے احکام سے منحرف کردیں جو تم پر نازل ہوئے ہیں اور اگر وہ (تمھارے کام اور فیصلے سے) روگردانی کریں تو جان لو کہ خدا چاہتا ہے کہ ان کے کچھ گناہوں کے بدلے انھیں سزا دے اور بہت سے لوگ فاسق ہیں۔

۵۰- کیا وہ (تم سے) زمانۂ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے خدا سے بہتر حکم کون کرسکتا ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے اس پہلی آیت کی شانِ نزول میں ابن عباس سے نقل کیا ہے،

یہودیوں کے بڑوں کی ایک جماعت نے آپس میں سازش کی اور کہا کہ محمد (ص) کے پاس جاتے ہیں۔ شاید اسے ہم اس کے دین سے منحرف کردیں۔ یہ طے کرکے وہ پیغمبر اسلام کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم یہودیوں کے علماء اور اشراف ہیں، اگر ہم آپ کی پیروی کرلیں تو مسلّم ہے کہ باقی یہودی ہماری اقتداء کریں گے لیکن ہمارے اور ایک اور گروہ کے درمیان ایک نزاع ہے (ایک شخص کے قتل یا کسی اور بات کے بارے میں) اگر اس جھگڑے میں آپ ہمارے فائدے میں فیصلہ کردیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

اس پر پیغمبر اسلامؐ نے ایسے (غیر عادلانہ) فیصلے سے منہ موڑ لیا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی[1]

تفسیر

اس آیت میں خدا تعالیٰ دوبارہ اپنے پیغمبر کو تاکید کرتا ہے کہ اہلِ کتاب کے درمیان حکم خدا کے مطابق فیصلہ کریں، اور ان کی ہوا و ہوس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں (وان احکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھوا ئھم)۔

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ ص ۴۲۱

Marfat.com

اس حکم کی تکرار یا تو ان مطالب کی وجہ سے ہے جو آیت کے ذیل میں آئے ہیں یا اس بنا پر ہے کہ اس فیصلے کا موضوع گذشتہ آیات کے فیصلے کے موضوع سے مختلف ہے۔ گذشتہ آیات میں موضوع زنائے محصنہ تھا اور یہاں موضوع قتل یا کوئی اور جھگڑا تھا۔

اس کے بعد پیغمبر کو متوجہ کیا گیا ہے کہ انھوں نے سازش کی ہے کہ تمھیں آئین حق وعدالت سے روگرداں کر دیں تم ہوشیار اور آگاہ رہو (واحذرهم ان يفتنوك عن بعض ما انزل الله اليك)۔

اور اگر اہل کتاب تمھارے عادلانہ فیصلے کے سامنے سر نہیں جھکاتے تو جان لو کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کے گناہوں نے ان کا دامن پکڑ رکھا ہے اور ان سے توفیق سلب ہو چکی ہے اور خدا چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے انھیں سزا دے (فان تولوا فاعلم انما يريد الله ان يصيبهم ببعض ذنوبهم)۔

تمام گناہوں کی بجائے بعض گناہوں کا ذکر ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ تمام گناہوں کی سزا اس دنیا میں انجام نہیں پاتی صرف کچھ سزا انسان کو ملتی ہے اور باقی معاملہ دوسرے جہان کے سپرد ہو جاتا ہے۔

انھیں کون سی سزا دامن گیر ہوئی، اس کی آیت میں کوئی صراحت نہیں ہے لیکن احتمال ہے کہ یہ اسی انجام کی طرف اشارہ ہے، جس سے مدینہ میں یہودی دوچار ہوئے۔ وہ اپنی پے در پے خیانتوں کے باعث اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ سے باہر چلے جانے پر مجبور ہوئے یا یہ کہ سلب توفیق ان کے لیے ایک سزا شمار ہوئی ہو۔ دوسرے لفظوں میں پیہم گناہ اور ہٹ دھرمی کی سزا عادلانہ احکام سے محرومی اور بے راہ و سرگرداں زندگی کی صورت میں انھیں ملی ہو۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اگر یہ لوگ راہ باطل میں ڈٹے ہوئے ہیں تو تم پریشان نہ ہونا کیونکہ بہت سے لوگ فاسق ہیں (وان كثيرًا من الناس لفاسقون)۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ہو سکتا ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ زیر بحث آیت اس امر پر دلیل ہے کہ پیغمبر بھی حق سے انحراف کر سکتے ہیں لہٰذا خدا انھیں تنبیہ کر رہا ہے تو کیا یہ بات انبیاء کے معصوم ہونے کے مقام سے مناسبت رکھتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ معصوم ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ پیغمبر اور امام کے لیے گناہ محال ہے ورنہ ان کے لیے ایسی عصمت میں تو کوئی فضیلت نہ ہوگی بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ گناہ کی طاقت رکھنے کے باوجود گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اگرچہ یہ مرتکب نہ ہونا تذکرات الٰہی کی وجہ سے ہی ہو۔ دوسرے لفظوں میں خدائی توجہات گناہ سے پیغمبر کے محفوظ رہنے کا ایک عامل ہے۔

انبیاء اور آئمہ کے مقام عصمت کے بارے میں تفصیلی بحث انشاء اللہ آیت تطہیر (احزاب - ۳۳) کے ذیل میں آئے گی۔

بعد والی آیت میں استفہام انکاری کے طور پر فرمایا گیا ہے: کیا یہ لوگ آسمانی کتب کی پیروی کے مدعی ہیں،

Marfat.com

توقع رکھتے ہیں کہ تم زمانہ جاہلیت کے احکام کی طرح اور تبعیض و امتیاز برتتے ہوئے ان کے درمیان قضاوت کرو (افحکم الجاھلیۃ یبغون) حالانکہ اہلِ ایمان کے لیے حکمِ خدا سے بہتر اور بالاتر کوئی فیصلہ نہیں ہے (ومن احسن من اللہ حکمًا لقوم یوقنون)۔

جیسا کہ ہم گذشتہ آیات کے ذیل میں کہہ چکے ہیں کہ یہودیوں کے مختلف قبائل میں بھی عجیب وغریب امتیازات تھے۔ مثلاً اگر بنی قریظہ کا کوئی شخص بنی نضیر کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو قصاص لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس بنی نضیر کا کوئی شخص بنی قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو قصاص نہ لیا جاتا یا یہ کہ دیت اور خون بہا عام دیت سے دوگنا لیتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسے امتیازات زمانہ جاہلیت کی نشانیاں ہیں۔ جبکہ خدائی احکام کی نظر میں بندگانِ خدا میں کوئی امتیاز نہیں۔

کافی میں امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

الحکم حکمان حکم اللہ وحکم الجاھلیۃ فمن اخطأ حکم اللہ حکم بحکم الجاھلیۃ

حکم صرف دو طرح کے ہیں۔ اللہ کا حکم یا جاہلیت کا حکم۔ اور جو خدا کا حکم چھوڑ دے، اس نے جاہلیت کا حکم اختیار کر لیا[1]

اس سے واضح ہوتا ہے آسمانی احکام کے حامل ہونے کے باوجود آج مسلمان دوسری اقوام و ملل کے جعلی قوانین کے جو پیچھے پڑے ہوئے ہیں، درحقیقت جاہلیت کے راستے پر گامزن ہیں۔

۵۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

۵۲۔ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۗىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝ۭ

۵۳۔ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝

---

[1] نورالثقلین جلد ۱ ص ۶۴۰

Marfat.com

ترجمہ

۵۱۔ اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا سہارا نہ بناؤ۔ وہ تو ایک دوسرے کے لیے سہارا ہیں اور جو اُن پر بھروسہ کرتے ہیں وہ انھی میں سے ہیں اور خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

۵۲۔ تم ایسے لوگوں کو دیکھتے ہو جن کے دلوں میں بیماری ہے جو (ایک دوسرے کی دوستی میں) ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہمیں کوئی حادثہ پیش نہ آئے (کہ جس میں ہمیں ان کی مدد کی ضرورت پڑے) شاید خدا کی طرف سے کوئی اور کامیابی یا واقعہ (مسلمانوں کے فائدے میں) رونما ہو جائے اور یہ لوگ اپنے دلوں میں جو کچھ چھپائے ہوئے ہیں اس پر پشیمان ہیں۔

۵۳۔ اور وہ جو ایمان لائے ہیں کہتے ہیں کیا یہ وہی (منافق) ہیں جو بڑی تاکید سے قسم کھاتے ہیں کہ وہ تمھارے ساتھ ہیں (ان کا معاملہ یہاں تک کیوں آپہنچا کہ) ان کے اعمال نابود ہو گئے اور وہ خسارے میں جا پڑے۔

شانِ نزول

بہت سے مفسّرین نے نقل کیا ہے کہ جنگِ بدر کے بعد عبادہ بن صامت خزرجی پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: یہودیوں میں کچھ میرے ہم پیمان ہیں جو تعداد میں بہت ہیں اور طاقت ور ہیں، اب جبکہ وہ ہمیں جنگ کی دھمکی دے رہے ہیں اور مسلمانوں کا معاملہ غیر مسلموں سے الگ ہو گیا ہے تو میں ان کی دوستی اور عہد و پیمان سے برأت کا اظہار کرتا ہوں میرا ہم پیمان صرف خدا اور اس کا رسولؐ ہے۔

عبداللہ بن ابی کہنے لگا، میں تو یہودیوں کی ہم پیمانی سے براءت نہیں کرتا کیونکہ میں مشکل حوادث سے ڈرتا ہوں اور مجھے ان لوگوں کی ضرورت ہے۔

اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: یہودیوں کی دوستی کے سلسلہ میں مجھے جس بات کا ڈر عبادہ کے بارے تھا وہی تیرے متعلق بھی ہے (اور اس دوستی اور ہم پیمانی کا خطرہ اس کی نسبت تیرے لیے بہت زیادہ ہے)۔

عبداللہ کہنے لگا: اگر ایسی بات ہے تو میں بھی قبول کرتا ہوں اور ان سے رابطہ منقطع کر لیتا ہوں۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ سے دوستی کرنے سے ڈرایا گیا۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیات مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی دوستی اور ہم کاری سے شدت کے ساتھ ڈراتی ہیں۔ پہلی آیت میں

Marfat.com

فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا سہارا اور ہم پیمان نہ بناؤ (یعنی خدا پر ایمان کا تقاضا ہے کہ مادی مفاد کے لیے ان سے ہم کاری اور دوستی نہ کرو) (یا یھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیھود و النصارٰی اولیاء)۔

"اولیاء" "ولی" کی جمع ہے اور "ولایت" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے دو چیزوں کے درمیان بہت زیادہ قُرب، نزدیکی اور دوستی۔ نیز اس میں ہم پیمان ہونے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے لیکن آیت کی شانِ نزول اور باقی موجود قرائن کو مدنظر رکھا جائے تو پھر اس سے مراد یہاں یہ معنی نہیں کہ مسلمان یہود و نصاریٰ سے کوئی تجارتی اور سماجی رابطہ نہ رکھیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ان سے عہد و پیمان نہ کریں اور دشمنوں کے مقابلے میں ان کی دوستی پر بھروسہ نہ کریں۔

عہد و پیمان کا مسئلہ اس زمانے میں عربوں میں بہت رائج تھا اور اسے "ولاء" سے تعبیر کرتے تھے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہاں "اہلِ کتاب" نہیں کہا گیا بلکہ یہود و نصاریٰ کہا گیا ہے۔ شاید یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ اپنی آسمانی کتاب پر عمل کرتے تو پھر تمھارے اچھے ہم پیمان ہوتے لیکن ایک دوسرے سے ان کا اتحاد آسمانی کتاب کی رُو سے نہیں ہے بلکہ سیاسی اور نسلی اغراض پر مبنی ہے۔

اس کے بعد ایک مختصر سے جملے سے اس نہی کی دلیل بیان فرمائی گئی ہے:

ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک اپنے ہم مسلک لوگوں کے دوست اور ہم پیمان ہیں (بعضھم اولیاء بعض) یعنی جب تک ان کے اپنے اور ان کے دوستوں کے مفادات بیچ میں ہیں وہ تمھاری طرف ہرگز متوجہ نہیں ہوں گے۔ لہٰذا تم میں سے جو کوئی بھی ان سے دوستی کرے اور عہد و پیمان باندھے وہ اجتماعی اور مذہبی تقسیم کے لحاظ سے انھی کا جزء شمار ہوگا (و من یتولھم منکم فانہ منھم)۔

اور اس میں شک نہیں کہ خدا ایسے ظالم افراد کو جو اپنے ساتھ اور اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ خیانت کریں اور دشمنوں پر بھروسہ کریں، ہدایت نہیں کرے گا (ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین)۔

بعد والی آیت میں ان بہانہ تراشیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بیمار فکر افراد غیر سے اپنے غیر شرعی روابط کے لیے پیش کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ اصرار کرتے ہیں کہ انھیں اپنے لیے سہارا سمجھیں اور انھیں اپنا ہم پیمان بنائیں اور ان کا عُذر یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ قدرت طاقت ان کے ہاتھ میں آجائے اور پھر ہم مصیبت میں گرفتار ہو جائیں (فتری الذین فی قلوبھم مرض یسارعون فیھم یقولون نخشٰی ان تصیبنا دائرۃ)[1]۔

---

[1] "دائرۃ" کا مادہ "دور" ہے اس کا معنی ہے ایسی چیز جو گردش میں ہو اور چونکہ تاریخ میں حکومت و سلطنت ہمیشہ گردش میں رہی ہے، اس لیے اسے دائرۃ کہتے ہیں۔ اسی طرح مختلف حوادث زندگی میں جو افراد کے گرد رہتے ہیں انھیں "دائرۃ" کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: جیسے انھیں اس بات کا احتمال ہے کہ کسی دن طاقت یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھ آجائے گی اسی طرح انھیں یہ خیال بھی آنا چاہیے کہ آخر کار ہو سکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کو کامیاب کرے اور قدرت وطاقت ان کے ہاتھ آجائے اور یہ منافق اپنے دلوں میں جو کچھ چھپائے ہوئے ہیں اس پر پشیمان ہیں (فعسی اللہ ان یأتی بالفتح او امر من عندہ فیصبحوا علی ما اسروا فی انفسھم نادمین)۔

اس آیت میں درحقیقت انھیں دو طرح سے جواب دیا گیا ہے: پہلا یہ کہ ایسے خیالات بیمار دلوں سے اٹھتے ہیں اور ان لوگوں کے دلوں سے کہ جن کا ایمان متزلزل ہے اور وہ خدا کے بارے میں بدگمانی رکھتے ہیں ورنہ کوئی صاحب ایمان ایسے خیالات کو اپنے دل میں راہ نہیں دیتا اور دوسرا یہ کہ فرض کریں کہ ان کی کامیابی کا احتمال ہو بھی تو کیا مسلمانوں کی کامیابی کا احتمال نہیں ہے؟

جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس کی بنا پر "عسیٰ" کا مفہوم ہے "احتمال" اور "امید" اس سے اس لفظ کا ہر جگہ استعمال ہونے والا اصلی معنی برقرار رہتا ہے۔ لیکن عام طور پر مفسرین نے یہاں خدا کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ایک قطعی وعدہ مراد لیا ہے جو کہ لفظ "عسیٰ" کے ظاہری مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتا۔

لفظ "فتح" کے بعد "او امر من عندہ" کے جملے سے مراد یہ ہے کہ ممکن ہے مسلمان آئندہ زمانے میں اپنے دشمنوں پر جنگ اور اس میں کامیابی کی وجہ سے غالب آجائیں یا جنگ کے بغیر ان میں اتنی قدرت پیدا ہو جائے کہ دشمن جنگ کیے بغیر گھٹنے ٹیک دے دوسرے لفظوں میں لفظ "فتح" مسلمانوں کی فوجی کامیابیوں کی طرف اشارہ ہے اور امر من عندہ اجتماعی، اقتصادی اور دیگر کامیابیوں کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خدا یہ احتمال بیان کر رہا ہے اور وہ آئندہ کی وضع وکیفیت سے آگاہ ہے لہٰذا یہ آیت مسلمانوں کی فوجی، اجتماعی اور اقتصادی کامیابیوں کی طرف اشارہ ہی سمجھی جائے گی۔

آخری آیت میں منافقین کے انجام کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب سچے مسلمانوں کو فتح وکامرانی نصیب ہو جائے اور منافقین کا معاملہ اُلم نشرح ہو جائے تو "مومنین تعجب سے کہیں گے کہ کیا یہ منافق لوگ وہی نہیں ہیں کہ دعویٰ کرتے تھے اور قسمیں کھاتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ ہیں اب ان کا یہ انجام کیوں ہوا ہے" (و یقول الذین اٰمنوا اھٰؤلاء الذین اقسموا باللہ جھد ایمانھم انھم لمعکم)[1] اور اسی نفاق کی وجہ سے ان کے تمام اعمال باطل اور نابود ہو گئے کیونکہ ان کا سرچشمہ پاک اور خالص نیک نہ تھی اور "اسی بنا پر وہ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی خسارے میں ہیں" (حبطت اعمالھم فاصبحوا خاسرین)۔

دراصل آخری جملہ سوال مقدر کے جواب کی طرح ہے گویا کوئی پوچھتا ہے کہ ان کا انجام کار کیا ہوگا تو ان کے جواب میں کہا گیا ہے کہ ان کے اعمال بالکل برباد ہو گئے ہیں اور انھیں خسارا اٹھانا پڑا ہے۔ یعنی اگر انھوں نے نیک اعمال خلوص سے

---

[1] مندرجہ بالا آیت میں "ھٰؤلاء" مبتدا ہے اور "الذین اقسموا باللہ" اسکی خبر ہے اور "جھد ایمانھم" "مفعول مطلق ہے۔

Marfat.com

بھی انجام دیئے ہوں لیکن آخرکار انھوں نے چونکہ نفاق اور شرک اختیار کیا ہے لہذا ان کے اعمال برباد ہوگئے ہیں جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد دوم (ص۔۔۔ اردو ترجمہ) سورہ بقرہ آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں بیان کیا جاچکا ہے۔

غیروں پہ تکیہ

شانِ نزول میں تو عبادہ بن صامت اور عبداللہ بن ابی کی گفتگو آئی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ آیات صرف دو تاریخی شخصیتوں کے مابین ہونے والی گفتگو کے حوالے ہی سے نہیں دیکھی جاسکتیں بلکہ وہ دونوں دو معاشرتی مکاتبِ فکر کی نمائندگی کررہے ہیں۔ ایک مکتب کہتا ہے کہ دشمن سے الگ رہنا چاہیے اور اپنی مہار اس کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہیے اور اس کی امداد پر اطمینان نہیں کرنا چاہیے۔ جبکہ دوسرا مکتبِ فکر کہتا ہے کہ اس ہنگامہ خیز دنیا میں ہر شخص اور ہر قوم کو ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ غیروں میں سے کسی کو سہارا بنا لیا جائے اور غیروں کی دوستی بھی قدر و قیمت کی حامل ہے اور ایک دن وہ ثمر بخش ثابت ہوگی۔

قرآن دوسرے مکتب کی شدت سے سرکوبی کرتا ہے اور مسلمانوں کو اس طرزِ فکر سے تاکیداً ڈراتا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مسلمان یہ عظیم خدائی حکم بھلا چکے ہیں اور غیروں میں سے بعض پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کی بہت سی بدبختیوں کا سرچشمہ یہی چیز ہے۔

اُندلس اس کی زندہ نشانی ہے۔ کل کے اندلس اور آج کے اسپانیہ میں مسلمانوں نے کیسے اپنی قوت و طاقت کے بل پر ایک درخشاں تمدن کی بنیاد رکھی اور پھر غیروں پر بھروسہ کرکے کیسے اس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس کی دوسری دلیل عظیم عثمانی بادشاہت ہے جو تھوڑی ہی مدت میں گرمیوں میں پگھل جانے والی برف کی طرح بہہ گئی۔

دورِ حاضر میں اس مکتب سے منحرف ہونے سے مسلمانوں نے جو کاری ضربیں کھائی ہیں وہ بھی کم نہیں ہیں لیکن تعجب ہے کہ ہم اب بھی کیوں بیدار نہیں ہوتے۔

غیر ہر حال غیر ہی ہے۔ مشترک مفادات کی خاطر اگر کوئی غیر چند قدم ہمارے ساتھ چلے بھی تو آخرکار حساس لمحات میں نہ صرف یہ کہ وہ ساتھ چھوڑ دے گا بلکہ ہم پر کاری ضربیں بھی لگائے گا۔ چاہیے یہ کہ آج کا مسلمان اس قرآنی صدا پر سب سے زیادہ کان دھرے اور اپنی طاقت کے علاوہ کسی پر بھروسہ نہ کرے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جنگ اُحد کے موقع پر جب بہت سے یہودی مشرکین کے خلاف جنگ کے لیے آپ سے آملے تو آپ نے دورانِ راہ ہی انھیں واپس کردیا اور ان کی مدد قبول نہ فرمائی۔ حالانکہ یہ تعداد جنگ اُحد میں ایک مؤثر کردار ادا کرسکتی تھی آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ جنگ کے حساس لمحات میں دشمن سے مل جاتے اور بچے کھچے لشکرِ اسلام کو بھی ختم کردیتے۔

Marfat.com

۵۴۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ
یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ٘
یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىٕمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ
یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○

ترجمہ

۵۴۔ اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا (وہ خدا کا کوئی نقصان نہیں کرے گا) خدا آئندہ ایک ایسا گروہ لے آئے گا جسے وہ دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ (بھی) اسے دوست رکھتے ہیں۔ جو مومنین کے سامنے متواضع اور کفّار کے مقابلے میں طاقت ور ہیں وہ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور سرزنش کرنے والوں کی سرزنش سے نہیں ڈرتے۔ یہ خدا کا فضل و کرم ہے، وہ جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) عطا کرتا ہے اور (خدا کا فضل وسیع ہے، اور خدا جاننے والا ہے۔

تفسیر

منافقین کے بارے میں بحث کے بعد مرتدین کے سلسلے میں گفتگو ہے کہ جو قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق اس دین سے خارج ہو جائیں گے۔ لیکن خدا، اس کے دین نیز مسلمانوں اور اسلامی معاشرے کی تیز رفتار پیش رفت کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ کیونکہ خدا آئندہ اس دین کی حمایت کے لیے ایک اور گروہ کو مبعوث کرے گا (یا ایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یأتی اللہ بقوم)۔

اس کے بعد ان لوگوں کی جو یہ عظیم کار رسالت انجام دیں گے، یہ صفات بیان فرمائی گئی ہیں:

پہلی یہ کہ وہ خدا کے عاشق ہوں گے اور اس کی خوشنودی کے سوا انھیں کوئی فکر دامن گیر نہ ہوگی "خدا انھیں پسند کرتا ہے اور وہ خدا سے محبت کرتے ہیں" (یحبھم و یحبونہ)

دوسری اور تیسری صفت ان لوگوں کی یہ ہے کہ وہ مومنین کے لیے منکسر المزاج اور مہربان ہیں جبکہ دشمنوں اور ستم گروں کے مقابلے میں مضبوط، سخت اور طاقت ور ہیں (اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین)۔

چوتھی صفت ان کی یہ ہے کہ راہِ خدا میں جہاد کرنا ان کے مسلسل پروگرام میں شامل ہے (یجاھدون فی سبیل اللہ)۔

Marfat.com

پانچویں خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ فرمان الٰہی کی انجام دہی اور دفاعِ حق کی راہ میں کسی ملامت کرنیوالے کی ملامت سے نہیں ڈرتے (ولا یخافون لومة لائم)۔

درحقیقت وہ جسمانی طاقت کے علاوہ ایسا عزم رکھتے ہیں کہ غلط رسومات کو توڑنے اور انحراف کرنے والی اکثریت کو خاطر میں نہیں لاتے کثرت کے زعم میں دوسروں کا مذاق اڑانے والوں کی پرواہ نہیں کرتے۔

ہم ایسے بہت سے افراد کو جانتے ہیں کہ جو ممتاز صفات کے حامل ہیں لیکن معاشرے کی خلاف، عوام کے افکار و نظریات اور منحرف اکثریت کے سامنے بہت محتاط ہو جاتے ہیں اور ان کے سامنے بزدلی اور کم ہمتی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں بہت جلد میدان سے ہٹ جاتے ہیں حالانکہ ایک مصلح اور رہبر اور اس کے افکار کی تبلیغ و ترویج کے لیے میدان میں اترنے والوں کے لیے ہر چیز سے پہلے شہامت و جراءت کی ضرورت ہے۔ عوام اور ماحول سے ڈر جانے سے اصلاح نہیں ہو سکتی اور ان سے خوفزدہ ہونا بلند روحانی امتیاز کے منافی ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے: ان امتیازات و خصوصیات کا حصول (انسانی کوشش کے علاوہ) خدا کے فضل و کرم کا مرہونِ منت ہے وہ جسے چاہتا اور اہل پاتا ہے عطا کرتا ہے (ذٰلك فضل الله یؤتیه من یشآء)۔

وہی ذات ہے جس کا دائرہ فضل و کرم بہت وسیع ہے اور جو اس کی لیاقت و اہلیت رکھتے ہیں، ان سے آگاہ ہے (والله واسع علیم)

اس سلسلے میں کہ مندرجہ بالا آیت کن یاورانِ اسلام کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور خدا تعالیٰ یہاں کن افراد کی خصوصیات بیان فرما رہا ہے روایاتِ اسلامی اور اقوالِ مفسرین میں اس سلسلے میں بڑی بحث کی گئی ہے۔ تاہم شیعہ سنی طرق سے وارد ہونے والی بہت سی روایات میں ہے کہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں فتح خیبر کے موقع پر یا ناکثین، قاسطین اور مارقین سے ان کی جنگ کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔[1]

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ لشکرِ اسلام کے بعض کمانڈر جب خیبر کو فتح نہ کر سکے تو اس کے بعد ایک رات پیغمبر اسلامؐ نے مرکز فوج میں ان کی طرف رُخ کر کے فرمایا:

> لاعطین الرایة غدًا رجلا، یحب الله ورسوله ویحبه الله ورسوله، کرارًا غیر فرار، لایرجع حتی یفتح الله علی یده۔
>
> بخدا کل علم ایسے مرد کو دوں گا جو خدا اور رسول سے محبت رکھتا ہے اور خدا اور رسول بھی اس سے محبت رکھتے ہیں۔ وہ بڑھ بڑھ کر دشمنوں پر حملہ کرنے والا ہے اور کبھی پشت نہیں دکھاتا اور وہ اس میدان سے اس وقت تک پلٹ کر نہیں آئے گا، جب تک خدا اس کے ہاتھ سے مسلمانوں کو فتح نصیب نہیں

[1] یاد رہے کہ ناکثین جنگ جمل کی آگ بھڑکانے والوں کو، قاسطین معاویہ کی فوج کو اور مارقین خوارج کو کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

کردیتا۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ سے لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تو آپ نے سلمان کے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا:

اس سے یہ، اس کے یار و انصار اور ہم وطن لوگ مراد ہیں۔

اس طرح آپؐ نے اہلِ ایران کے اسلام لانے اور اسلام کی پیش رفت کے لیے ان کی ثمر بخش کاوشوں اور جستجو کی پیش گوئی فرمائی ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے مزید فرمایا:

"لو کان الدین معلقاً بالثریا لتناوله رجال من ابناء الفارس"

اگر دین ثریا پر جا ٹھہرتا اور آسمانوں میں جا پہنچتا تو بھی فارس کے لوگ اسے دستیاب کر لیتے[2]

ایک اور روایت میں "دین" کی جگہ "علم" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

بعض اور روایات میں ہے کہ آیت حضرت مہدی علیہ السلام کے یار و انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنی پوری طاقت سے ان لوگوں کے مقابلے میں قیام کریں گے جو دینِ حق و عدالت سے مرتد ہو جائیں گے اور وہ دنیا کو ایمان و عدل سے معمور کر دیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ روایات جو اس آیت کی تفسیر کے بارے میں مروی ہیں باہم کوئی تضاد نہیں رکھتیں کیونکہ یہ آیت قرآن کی سیرت کے مطابق ایک کلی اور جامع مفہوم بیان کرتی ہے اور اس کے اہم مصادیق میں حضرت علی علیہ السلام، سلمان فارسی اور وہ لوگ شامل ہیں جو اس پروگرام کے مطابق چلیں گے چاہے روایات میں ان کا ذکر نہ بھی ہو۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس آیت کے بارے میں بھی قومی تعصبات کے باعث جو لوگ اہلبیتؑ نہیں رکھتے تھے اور آیت میں مذکورہ صفات میں سے کوئی بھی ان میں نہ تھی انھیں بھی آیت کا مصداق ٹھہرایا گیا اور انھیں بھی شانِ نزول کا عنوان بنا لیا گیا یہاں تک کہ ابو موسیٰ اشعری کو بھی آیت کے مصادیق میں شمار کر لیا گیا جس نے اپنی بے مثال تاریخی حماقت سے اسلام کو ہلاکت کے گڑھے تک پہنچا دیا اور علمدارِ اسلام حضرت علی علیہ السلام کو[3]

---

[1] تفسیر برہان اور نور الثقلین میں آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے اس بارے میں کئی ایک روایات نقل کی گئی ہیں۔ اہلِ سنت کے علماء میں سے ثعلبی نے ان روایات کو نقل کیا ہے (کتاب احقاق الحق ج ۳، ص ۲۰۰ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

[2] مجمع البیان جلد ۳ ص ۲۰۸، نور الثقلین جلد ۱ ص ۶۴۲۔ ابو نعیم اصفہانی نے حلیۃ المتقین جلد ۶ ص ۶۴ میں حدیث کی یہ عبارت نقل کی ہے:

"لو کان العلم منوطاً بالثریا لتناوله رجال من ابناء الفارس"

لیکن ابن عبد البر نے استیعاب جلد ۲ ص ۵۷۰ میں یہ عبارت نقل کی ہے:

"لو کان الدین عند الثریا لناله سلمان......

[3] تفسیر طبری جلد ششم صفحہ ۱۸۴۔ لیکن بعض روایات میں صرف ابو موسیٰ کی قوم کا نام آیا ہے جو کہ اہلِ یمن کی طرف اشارہ ہے۔ جنہوں نے نہایت حساس موقع پر اسلام کی مدد کی اور ابو موسیٰ اس میں شامل نہیں ہے جبکہ حضرت سلمان کے بارے میں جو روایات ہیں ان کے مطابق وہ خود اور ان کی قوم اس آیت کی مصداق ہیں۔

Marfat.com

ایک سخت، تنگ موڑ پر پہنچا دیا۔

اس جلد کے آخری حصے کی اصلاح کا کام میں نے مکہ مکرمہ میں جوار خانہ خدا میں انجام دیا جب کہ وہاں عمرہ کے پر شکوہ مراسم بھی انجام پا رہے تھے۔ اس وقت میرے ہاتھ میں درد تھا اور قلم تک پکڑنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے میں میں نے محسوس کیا کہ وہی تعصبات جو علمی کتب میں دکھائی دیتے ہیں آج بھی شدید پیمانے پر یہاں عوام میں بلکہ ان علماء میں دکھائی دیتے ہیں اور ایسے لگتا ہے جیسے کوئی ہاتھ درمیان میں کام کر رہا ہے تاکہ مسلمان کبھی متحد نہ ہوں۔ یہاں تک کہ یہ تعصب تاریخ اسلام سے پہلے کے ایام تک بھی جا پہنچا ہے۔ خانہ کعبہ کے نزدیک جس شاہراہ کا نام اس وقت شارع ابوسفیان ہے وہ شارع ابراہیم الخلیل جو بانی مکہ کے نام پر ہے سے زیادہ شکوہ مند ہے۔

آج یہاں مسلمانوں کی طرف "شرک" کی نسبت دینا ایک متعصب گروہ کے لیے پانی کا گلاس پینے کے برابر ہے، ادھر آپ نے اپنے جسم کو حرکت دی اُدھر "مشرک" "مشرک" کی صدا بلند ہونے لگی۔ گویا اسلام ان کے گھر کی باندی ہے اور وہی قرآن کے متولی ہیں اور بس۔ اور دوسروں کا اسلام و کفران کی پسند اور ناپسند پر منحصر ہے کہ ایک لفظ کے ساتھ جسے چاہیں مشرک اور جسے چاہیں مسلمان کہہ دیں۔

حالانکہ مندرجہ بالا آیات کے ذیل میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جب اسلام کی غربت کا دور ہوگا خدا تعالیٰ سلمان جیسے بزرگ عظمت دین کے لیے بھیجے گا اور یہ پیغمبرؐ کی دی ہوئی بشارت ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ مسئلہ توحید جسے وحدت مسلمین کی بنیاد ہونا چاہیے۔ آج مسلمانوں کی صفوں میں انتشار اور انھیں مشرک و کافر قرار دینے کے لیے دستاویز بن چکا ہے۔ یہاں تک کہ ایک آگاہ شخص نے ان کے بعض متعصبین سے کہا تھا:

> ذرا دیکھو! ہمارا اور تمھارا معاملہ کہاں تک جا پہنچا ہے کہ اگر اسرائیل ہم پر مسلط ہو جائے تو تم میں سے کچھ لوگ خوش ہوں گے اور اگر تمھاری سرکوبی کرے تو ہم میں سے بعض لوگ خوشی منائیں گے۔ کیا یہی وہ (اسرائیل اور اس کے سرپرست) نہیں چاہتے؟

انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ان کے بعض علماء سے جو میں نے متعدد بار ملاقات کی ہے اس سے یہ واضح ہوا ہے کہ اکثر بافہم اور سمجھدار حضرات اس کیفیت پر پریشان ہیں۔ ایک مرتبہ ایک مِنی عالم حدود شرک کے بارے میں بحث کے سلسلے میں بہت سے بزرگ مدرسین حرم کے سامنے کہنے لگے:

> اہل قبلہ کو شرک کی نسبت دینا بہت بڑا گناہ ہے جسے گذشتہ لوگ زیادہ اہمیت دیتے رہے ہیں۔ یہ کیا ہے کہ نافہم لوگ ہر وقت لوگوں پر شرک کی تہمت لگاتے رہتے ہیں کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اس طرح اپنے اوپر کتنی بڑی ذمہ داری لے رہے ہیں۔

۵۵۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ

Marfat.com

يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُونَ ○

ترجمہ

۵۵۔ تمہارا سرپرست اور رہبر صرف خدا، اس کا پیغمبر اور وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں، انھوں نے نماز قائم کی ہے اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کی ہے۔

شانِ نزول

آیۂ ولایت

تفسیر مجمع البیان اور دوسری کتب میں عبداللہ ابن عباس سے منقول ہے:

ایک روز میں چاہِ زمزم کے پاس بیٹھا تھا اور لوگوں کو ارشاداتِ رسولؐ سنا رہا تھا کہ اچانک ایک شخص قریب آیا۔ اس کے سر پر عمامہ تھا۔ اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ جب میں پیغمبر اسلامؐ سے کوئی حدیث نقل کرتا تو وہ بھی "قال رسول اللہ" کہہ کر دوسری حدیثِ رسولؐ بیان کر دیتا۔

ابن عباس نے اس شخص کو قسم دی کہ وہ اپنا تعارف کروائے تو اس نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی اور پکار کر کہا اے لوگو!

جو شخص مجھے نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں ابوذر غفاری ہوں۔ ان کانوں سے میں نے خود رسولؐ اللہ سے سنا ہے اور اگر میں جھوٹ بولوں تو میرے دونوں کان بہرے ہو جائیں، رسول اللہ نے فرمایا:

"علی قائد البررة و قاتل الکفرة منصور من نصره مخذول من خذله"

یعنی ـــــ علی نیک اور پاک لوگوں کے قائد ہیں اور کفار کے قاتل ہیں جو ان کی نصرت و مدد کرے خدا اس کی مدد کرے گا اور جو شخص ان کی نصرت و مدد سے ہاتھ کھینچ لے خدا بھی اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لے گا۔

اس کے بعد ابوذر نے مزید کہا:

اے لوگو! ایک دن میں رسولؐ خدا کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک سائل مسجد میں داخل ہوا اور لوگوں سے مدد طلب کی لیکن کسی نے اسے کچھ نہ دیا تو اس نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے کہا: خدایا! گواہ رہنا کہ میں نے تیرے رسولؐ کی مسجد میں مدد طلب کی ہے

Marfat.com

لیکن کسی نے مجھے جواب تک نہیں دیا۔ ایسی حالت میں جبکہ حضرت علی رکوع میں تھے اپنے دائیں ہاتھ کی چھنگلی سے اشارہ کیا۔ سائل قریب آیا اور انگوٹھی آپ کے ہاتھ سے اتار لی پیغمبر خدا نے جو حالتِ نماز میں تھے اس واقعہ کو دیکھا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو سر آسمان کی طرف بلند کیا اور اس طرح کہا :

خدایا! میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے سوال کیا تھا کہ ان کی روح کو وسعت دے اور ان کے کام ان پر آسان کر دے اور ان کی زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ ان کی گفتار کو سمجھ سکیں۔ نیز موسیٰ نے سوال کیا کہ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر اور یاور و مددگار قرار دے اور ان کے ذریعے ان کی قوت میں اضافہ فرما اور انھیں ان کے کاموں میں شریک کر دے خداوندا! میں محمد تیرا رسول اور برگزیدہ ہوں میرے سینہ کو کھول دے، میرے کام مجھ پر آسان کر دے اور میرے خاندان میں سے علی کو میرا وزیر بنا دے تاکہ اس کی وجہ سے میری کمر مضبوط اور قوی ہو جائے۔

ابوذر کہتے ہیں :

ابھی پیغمبرؐ خدا کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ جبرئیل نازل ہوئے اور رسول اللہؐ سے کہا :

پڑھیے!

حضورؐ نے فرمایا:

کیا پڑھوں ؟

تو جبرئیل نے کہا :

پڑھیے! انما ولیکم اللہ و رسولہ و الذین اٰمنوا ۔۔۔۔۔۔

یہ شانِ نزول (جیسا کہ بیان کیا جائے گا) تفصیلات کے کچھ اختلاف کے ساتھ مختلف طرق سے نقل ہوئی ہے البتہ اصل اور بنیاد سب روایات کی ایک ہی ہے۔

تفسیر

یہ آیت لفظ " انما " سے شروع ہوتی ہے۔ یہ لفظ لغتِ عرب میں حصر و انحصار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : تمھارے ولی، سرپرست اور تمھارے امور میں حق تصرف رکھنے والی تین ہستیاں ہیں، خدا، اس کا رسول اور وہ جو ایمان لائے، نماز قائم کی اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں (انما ولیکم اللہ و رسولہ و الذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ و یؤتون الزکوٰۃ و ھم راکعون)۔

اس میں شک نہیں کہ لفظ "رکوع" اس آیت میں نماز کے رکوع کے معنی میں ہے نہ کہ خضوع و خشوع کے معنی میں

Marfat.com

کیونکہ عرفِ شریعت اور اصطلاحِ قرآن میں جب رکوع کہا جائے تو اسی مشہور معنی میں یعنی نماز کے رکوع کے معنی میں ہوگا۔ نیز آیت کی شانِ نزول اور متعدد روایات جو حضرت علیؑ کے حالتِ رکوع میں انگوٹھی عطا فرمانے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ جنھیں ہم تفصیل سے ذکر کریں گے کے علاوہ "یقیمون الصلٰوۃ" بھی اس بات پر شاہد ہے۔ قرآن میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ جس میں یہ ہو کہ زکوٰۃ خضوع سے ادا کرو بلکہ زکوٰۃ کو خلوصِ نیت سے اور احسان جتلائے بغیر ادا کرنا چاہیے۔

اسی طرح اس میں بھی شک نہیں کہ لفظ "ولی" اس آیت میں دوست یا مددگار کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ دوستی اور مدد کرنے کے معنی میں ولایت نماز پڑھنے والوں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کرنے والوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک عمومی حکم ہے جو تمام مسلمانوں پر محیط ہے۔ تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے سے دوستی رکھیں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ یہاں تک کہ وہ بھی جن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جن کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس پر زکوٰۃ ادا کریں چہ جائیکہ وہ حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کریں انھیں بھی چاہیے کہ ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہوں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں "ولی" سے مراد ولایت بمعنی سرپرستی، تصرف اور مادی و روحانی رہبری اور قیادت ہے خصوصاً جبکہ یہ ولایت ولایتِ الٰہی اور ولایتِ پیغمبرؐ کے ہم پلّہ قرار پائی ہے اور تینوں کو ایک ہی لفظ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

اس طرح سے یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو حضرت علیؑ کی امامت و ولایت پر نصِ قرآنی کی حیثیت سے دلالت کرتی ہیں۔

اس موقع سے متعلق کچھ اہم بحثیں ہیں جن پر ہم علیحدہ علیحدہ تحقیق کرتے ہیں۔

احادیث، مفسّرین اور مؤرخین کی شہادت

جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ بہت سی اسلامی کتب اور اہل سنت کے منابع میں اس ضمن میں متعدد روایات موجود ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے ان میں سے بعض روایات میں حالتِ رکوع میں انگوٹھی دینے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جب کہ بعض میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ فقط اس آیت کے حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے کا ہی مذکور ہے۔

اس روایت کو ابن عباس، عمار ابن یاسر، عبداللہ بن سلام، سلمہ بن کہیل، انس بن مالک، عتبہ بن حکیم، عبداللہ ابی، عبداللہ بن غالب، جابر بن عبداللہ انصاری اور ابو ذر غفاری نے بیان کیا ہے[1]

ان مذکورہ دس افراد کے علاوہ اہلِ سنت کی کتب میں یہ روایت خود حضرت علیؑ سے بھی نقل ہوئی ہے[2]

---

[1] احقاق الحق ج ۲ ص ۳۹۹ تا ۴۱۰ سے رجوع کریں۔

[2] المراجعات ص ۱۵۵

Marfat.com

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ کتاب غایۃ المرام میں اس بارے میں ۲۴ احادیث کتبِ اہل سنت سے اور ۱۹ احادیث طرقِ شیعہ سے نقل کی گئی ہیں[1]

مشہور کتب کہ جن میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے تیس سے متجاوز ہیں جو کہ سب اہل سنت کے منابع و مصادر میں سے ہیں، ان میں سے یہ بھی ہیں:

۱۔ ذخائر العقبیٰ ص ۸۸ از محب الدین طبری
۲۔ تفسیر فتح القدیر ج ۲ ص ۵۰ از علامہ قاضی شوکانی
۳۔ جامع الاصول ج ۹ ص ۴۷۸
۴۔ اسباب النزول ص ۱۴۸ از واحدی
۵۔ لباب النقول ص ۹۰ از سیوطی
۶۔ تذکرۃ ص ۱۸ از سبط ابن جوزی
۷۔ نور الابصار ص ۱۰۵ از شبلنجی
۸۔ تفسیر طبری ص ۱۶۵
۹۔ الکافی الشاف ص ۵۶ از ابن حجر عسقلانی
۱۰۔ مفاتیح الغیب ج ۳ ص ۴۳۱ از رازی
۱۱۔ در المنثور ج ۲ ص ۲۹۲ از سیوطی
۱۲۔ کنز العمال ج ۶ ص ۳۹۱
۱۳۔ مسند ابن مردویہ
۱۴۔ مسند ابن الشیخ
۱۵۔ صحیح نسائی
۱۶۔ الجمع بین الصحاح الستۃ

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتب ہیں اس ضمن میں احادیث موجود ہیں[2]

ان حالات میں کیسے ہو سکتا ہے کہ ان تمام احادیث کی پرواہ نہ کی جائے جبکہ دیگر آیات کی شانِ نزول کے لیے ایک یا دو روایات پر قناعت کر لی جاتی ہے لیکن شاید تعصب اجازت نہیں دیتا کہ اس آیت کی شان نزول کے لیے ان سب روایات اور ان سب علماء کی گواہیوں کی طرف توجہ دی جائے۔

---

[1] منہاج البراعۃ ج ۲ ص ۲۵۰

[2] مزید تفصیل کے لیے احقاق الحق ج ۲، الغدیر ج ۲ اور المراجعات کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

اگر بنا یہ ہو کہ کسی آیت کے سلسلے میں اس قدر روایات کی بھی پرواہ نہ کی جائے تو پھر ہمیں قرآنی آیات کی تفسیر میں کسی بھی روایت کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ بہت کم آیات ایسی ہیں جن کی شانِ نزول میں اسقدر روایات وارد ہوئی ہوں۔

یہ مسئلہ اس قدر واضح و آشکار تھا کہ زمانۂ پیغمبرؐ کے مشہور شاعر حسان بن ثابت نے حضرت علیؑ کی شان میں روایت کے مضمون کو اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے :

فانت الذی اعطیت اذ کنت راکعا
زکاتا فدتک النفس یاخیر راکع
فانزل فیک اللہ خیر ولایۃ
وبینھا فی محکمات الشرایع

یعنی ـــــ آپ وہ ہیں کہ جنھوں نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دی۔ آپ پر جان فدا ہو۔ اے بہترین رکوع کرنے والے۔
اور اس کے بعد خدا نے بہترین ولایت آپ کے بارے میں نازل کی اور قرآن مجید میں اسے ثبت کر دیا[1]

اعتراضات کا جواب

بعض متعصب اہلِ سنت نے اس آیت کے حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے سے انکار کیا ہے اور اسی طرح "ولایت" کی تفسیر سرپرستی، تصرف اور امامت کرنے پر بھی اعتراض کیا ہے۔ ان میں سے اہم اعتراضات پر ہم یہاں تحقیق کرتے ہیں۔

۱۔ "الّذین" جمع کا صیغہ ہے : ایک اعتراض یہ ہے کہ آیت میں "الّذین" جمع کا صیغہ ہے لہٰذا اس آیت کو ایک شخص پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کہتی ہے کہ تمھارے "ولی" وہ اشخاص ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عربی ادبیات میں ایسا بارہا دکھائی دیتا ہے کہ مفرد کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں :

آیۂ مباہلہ میں لفظ "نسائنا" جمع کی صورت میں ہے جبکہ اس سے مراد جناب فاطمہ زہراؑ ہیں جیسا کہ اس ضمن میں مروی

---

[1] حسان بن ثابت کے اشعار تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بہت سی کتب میں نقل ہوئے ہیں۔ ان میں تفسیر روح المعانی از شہاب الدین محمود آلوسی اور کفایۃ الطالب از گنجی شافعی وغیرہ شامل ہیں۔

متعدد شانِ نزول گواہی دیتی ہیں۔

• آیہ مباہلہ ہی میں لفظ " انفسنا " جمع کی صورت میں ہے جبکہ مباہلہ کے لیے جانے والوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ صرف حضرت علیؑ تھے۔

• جنگ اُحد کے ایک واقعہ کے سلسلے میں سُورہ آلِ عمران آیہ ۱۷۲ میں ہے :

" الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانًا "

تیسری جلد میں اس آیہ کی تفسیر میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ بعض مفسّرین نے اس کی شانِ نزول نقل کی ہے جس میں " الذین " سے ایک ہی شخص نعیم بن مسعود مراد لیا گیا ہے۔

• سورہ مائدہ کی آیہ ۵۲ میں ہے۔

" یقولون نخشی ان تصیبنا دائرۃ "

اس میں بھی جمع کے صیغے ہیں۔ حالانکہ یہ آیت عبداللہ بن ابی کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔ جس کی تفسیر گزر چکی ہے۔

• علاوہ ازیں : ممتحنہ - آیہ ۱

منافقون آیہ ۸

بقرہ آیہ ۲۱۵ ، ۲۷۴ ، وغیرہ

میں ایسی تعبیرات موجود ہیں جو جمع کی شکل میں ہیں، لیکن ان کی شانِ نزول کے مطابق ان سے ایک ہی شخص مراد تھا۔

ایسی تعبیرات یا تو اس شخص کی حیثیت اور مقام کی اہمیت اور اس کے کام کے نقش مؤثر واضح کرنے کے لیے ہوتی ہیں یا اس لیے کہ حکم کو کلی صورت میں پیش کیا جائے اگرچہ اس کا مصداق ایک ہی فرد ہو۔

خدا کہ جو اکیلا ہے اس کے لیے قرآن مجید میں بہت سی آیات میں جمع کی ضمیر تعظیم کے طور پر ہی استعمال ہوئی ہے۔

البتہ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بغیر قرینہ کے خلاف ظاہر مفرد کے لیے جمع کا استعمال جائز نہیں ہے لیکن آیت کی شانِ نزول میں وارد ہونے والی تمام روایات ہمارے پاس واضح قرینہ کے طور پر موجود ہیں جبکہ دوسرے مواقع پر اس سے کم قرینہ پر بھی قناعت کرلی جاتی ہے۔

۲۔ حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ؟ : فخرالدین رازی اور بعض دوسرے متعصبین نے اعتراض کیا ہے کہ حضرت علیؑ تو نماز میں مخصوص توجہ رکھتے تھے اور پروردگار سے مناجات میں مستغرق رہتے تھے یہاں تک کہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حالتِ نماز میں تیر کا پھل آپ کے پاؤں سے نکالا گیا اور آپ متوجہ نہیں ہوئے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ آپ نے سائل کی آواز سن لی اور اس کی طرف متوجہ ہوگئے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اعتراض کرنے والے اس نکتہ سے غافل ہیں کہ سائل کی آواز سننا اور اس کی مدد کرنا اپنی طرف

Marfat.com

متوجہ ہونا نہیں ہے بلکہ عین خدا کی طرف توجہ ہے۔ حضرت علیؑ حالت نماز میں اپنے آپ سے غافل تھے نہ کہ خدا سے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ مخلوق خدا سے غفلت اور بیگانگی دراصل خدا سے غفلت اور بے گانگی ہے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حالتِ نماز میں زکوٰۃ دینا عبادت کے اندر عبادت ہے نہ کہ عبادت کے دوران ایک عمل مباح کی انجام دہی۔ ایک اور عبارت میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ بات جو روح عبادت سے مناسبت نہیں رکھتی یہ ہے کہ کوئی شخص عبادت کے دوران مادی اور شخصی زندگی سے مربوط ہو جائے۔ لیکن ان امور کی طرف متوجہ ہونا جو رضائے الٰہی کا ذریعہ ہیں روحِ عبادت کیلیے سازگار ہیں بلکہ عبادت کے لیے بلند مرتبے کا باعث ہیں۔

اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ خدا کی طرف توجہ اور استغراق کا یہ مطلب نہیں کہ انسان بے اختیار ہو کر اپنا احساس کھو بیٹھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے قصد و ارادہ سے اپنی توجہ ایسی ہر چیز سے پھیر لیتا ہے جو راہ خدا میں اور خدا کے لیے نہیں ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ فخرالدین رازی کا تعصب یہاں تک آپہنچا ہے کہ اس نے سائل کو حضرت علیؑ کے اشارہ کرنے کو کہ وہ خود آکر انگشتری اتارلے "فعل کثیر" قرار دیا ہے جو ان کی نظر میں نماز میں درست نہیں۔ حالانکہ وہ نماز میں ایسے کام انجام دینا جائز سمجھتے ہیں جو اس اشارہ سے کئی درجہ زیادہ ہیں اور اس کے باوجود وہ نماز کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ حشرات الارض مثلاً سانپ یا بچھو کو مارنا، بچے کو اٹھانا اور بٹھانا یہاں تک کہ شیر خوار بچے کو دودھ پلانے کو تو وہ نماز میں فعل کثیر نہیں سمجھتے پھر صرف ایک اشارہ فعل کثیر کس طرح ہو گیا لیکن جب کسی کی دانش مندی طوفانِ تعصب میں پھنس جاتی ہے تو پھر ایسے تعصبات اس کے لیے باعثِ تعجب نہیں رہتے۔

۲۔ لفظ "ولی" کا مفہوم: آیت پر ایک اور اعتراض لفظ "ولی" کے معنی کے بارے کیا گیا ہے اور اس سے مراد "دوست اور مدد کرنے والا" لیا گیا ہے نہ کہ "متصرف، سرپرست اور صاحب اختیار"۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ ہم آیت کی تفسیر کے بارے میں اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ لفظ "ولی" سے یہاں دوست اور مدد کرنے والا مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ صفت تو تمام مومنین کے لیے ثابت ہے نہ کہ ان مخصوص مومنین کے لیے جو آیت کے مطابق نماز قائم کریں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیں۔ دوسرے لفظوں میں دوستی اور مدد ایک عام حکم ہے، جبکہ آیت ایک خصوصی حکم بیان کر رہی ہے اسی لیے تو ایمان کا ذکر کرنے کے بعد خاص صفات بیان کی جارہی ہیں کہ جو ایک شخص کے ساتھ مخصوص ہیں۔

۴۔ حضرت علیؑ پر واجب زکوٰۃ: کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ پر کون سی زکوٰۃ واجب تھی جبکہ وہ مالِ دنیا میں سے اپنے لیے کچھ فراہم ہی نہ کرتے تھے اور اگر اس سے مراد مستحب صدقہ ہے تو اسے زکوٰۃ نہیں کہا جاسکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ:

اوّل تو تواریخ گواہی دیتی ہیں کہ حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے بہت سا مال کمایا تھا اور اسے راہ خدا میں صرف کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ مرقوم ہے کہ آپ نے ایک ہزار غلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے آزاد کرایا۔ علاوہ ازیں آپ کو مختلف جنگوں کے

Marfat.com

مال غنیمت میں سے بھی بہت کچھ ملا تھا۔ لہٰذا کچھ ایسا مال یا کوئی چھوٹا سا کھجوروں کا باغ جس کی زکوٰۃ ادا کرنا آپ پر واجب ہو اس وقت ہونا کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زکوٰۃ فوراً ادا کرنے کے وجوب کی فوریت "عرفی فوریت" ہے جو نماز پڑھتے ہوئے ادا کرنے کے منافی نہیں ہے۔

دوم یہ کہ مستحب زکوٰۃ کو قرآن مجید میں بہت مرتبہ زکوٰۃ کہا گیا ہے بہت سی مکی سورتوں میں یہ لفظ زکوٰۃ آیا ہے جس سے مراد مستحب زکوٰۃ ہی ہے کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ واجب زکوٰۃ کا حکم پیغمبر اسلام کی ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوا (نمل ۔ ۲، روم ۔ ۳۹، لقمان ۔ ۴، فصلت ۔ ۷ وغیرہ)۔

۵۔ آیت میں " ولایت بالفعل" کا ذکر ہے: اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر ہم حضرت علیؑ کی خلافتِ بلافصل پر ایمان بھی لے آئیں تب بھی یہ بات قبول کرنا پڑے گی کہ اس کا تعلق زمانۂ پیغمبرؐ کے بعد سے ہے لہٰذا حضرت علیؑ نزول آیت کے وقت ولی نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت ان کے لیے " ولایت بالقوۃ " تھی " ولایت بالفعل" نہ تھی جبکہ آیت ظاہراً " ولایت بالفعل" کا ذکر کر رہی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ روزمرہ کی گفتگو میں ایسی ادبی تعبیرات بہت دکھائی دیتی ہیں۔ لوگوں کے لیے ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں جو وہ "بالقوۃ" ہیں مثلاً انسان اپنی زندگی میں وصیت کرتا ہے اور کسی شخص کو اپنے بچوں کے لیے وصی اور قیم معین کرتا ہے اور اسی وقت سے "وصی" اور "قیم" کے الفاظ اس شخص کے لیے بولے جانے لگتے ہیں جبکہ وصیت کرنے والا ابھی زندہ ہوتا ہے۔

شیعہ سنی طرق سے پیغمبر اکرمؐ سے جو روایات حضرت علیؑ کے بارے میں مروی ہیں ان میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے انہیں "میرے وصی" اور "میرے خلیفہ" کہہ کر خطاب کیا جبکہ ایسا زمانۂ پیغمبرؐ میں نہ تھا۔

قرآن مجید میں بھی ایسی تعبیرات دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ کے بارے میں ہے کہ انہوں نے خدا سے یہ درخواست کی:

"ھب لی من لدنک ولیا یرثنی ویرث من اٰل یعقوب" (مریم ۔ ۵)

حالانکہ مسلّم ہے کہ "ولی" سے یہاں مراد "سرپرست" ہے جو ان کی وفات کے بعد ہوگا۔

بہت سے لوگ اپنے جانشین اپنی زندگی میں معین کرتے ہیں اور اسی وقت سے اسے جانشین کہنے لگتے ہیں حالانکہ وہ "بالقوۃ" ہی ہوتے ہیں "بالفعل" نہیں۔

۶۔ حضرت علیؑ نے اس آیت سے خود استدلال کیوں نہیں کیا؟: کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ نے اس واضح دلیل سے خود استدلال کیوں نہیں کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ آیت کی شانِ نزول کے بارے میں وارد شدہ روایات کی بحث کے ضمن میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہ حدیث متعدد کتب میں خود حضرت علیؑ سے بھی نقل ہوئی ہے جیسا کہ مسند ابن مردویہ، مسند ابی شیخ اور کنز العمال میں ہے یہ بات درحقیقت اس آیت سے آپ کا استدلال ہی ہے۔

کتاب نفیس "الغدیر" میں کتاب سلیم بن قیس ہلالی سے ایک مفصل حدیث نقل کی گئی ہے جس کے مطابق حضرت علیؑ نے

Marfat.com

میدانِ صفین میں کچھ لوگوں کی موجودگی میں اپنی حقانیت پر دلائل پیش کیے ان میں سے ایک استدلال اسی آیت سے تھا۔[1]

غایۃ المرام میں ابوذر سے منقول ہے:

حضرت علیؑ نے شوریٰ کے دن بھی اس آیت سے استدلال کیا تھا۔[2]

۷۔ **قبل اور بعد کی آیات سے آیۂ ولایت کا ربط:** یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قبل اور بعد کی آیات سے ولایت و امامت والی تفسیر مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ ان میں ولایت دوستی کے معنی میں آئی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ قرآنی آیات چونکہ تدریجاً اور مختلف واقعات میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا ان کا تعلق ان حوادث اور واقعات سے ہے جن کے سلسلے میں وہ نازل ہوئی ہیں نہ یہ کہ ایک سورت کی آیات یا یکے بعد دیگرے آنے والی آیات ہمیشہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں یا مفہوم و معنی کے اعتبار سے ہمیشہ نزدیکی تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو آیات ایک دوسرے کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ لیکن ان کا تعلق دو مختلف واقعات سے ہے۔ مختلف واقعات سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دونوں معانی و مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہیں۔

جیسا کہ شانِ نزول شاہد ہے آیت "انما ولیکم الله" حضرت علی علیہ السلام کے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس سے قبل اور بعد کی آیات جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں اور پڑھیں گے دوسرے واقعات کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا ان کے ایک دوسرے سے تعلق کی بات کا زیادہ سہارا نہیں لیا جاسکتا۔

علاوہ ازیں اتفاق کی بات ہے کہ زیر بحث آیت گذشتہ اور پیوستہ آیات سے مناسبت بھی رکھتی ہے کیونکہ دوسری آیات میں ولایت بمعنی دوستی اور مدد کے گفتگو ہے جبکہ زیر بحث آیت میں ولایت رہبری اور سرپرستی کے مفہوم میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ ولی، سرپرست اور متصرّف اپنے پیروکاروں کا دوست اور یار و مددگار بھی ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دوست اور مددگار ہونا ولایت مطلقہ کے کوائف اور اوصاف میں سے ہے۔

۸۔ **ایسی قیمتی انگشتری کہاں سے آئی تھی؟:** کہا جاتا ہے کہ ایسی گراں قیمت انگوٹھی جو تاریخ نے بیان کی ہے حضرت علیؑ کہاں سے لائے تھے؟ علاوہ ازیں ایسی غیر معمولی قیمت کی انگوٹھی پہننا اسراف بھی ہے، تو کیا یہ بات اس کی دلیل نہیں کہ مذکورہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس انگوٹھی کی قیمت کے بارے میں جو مبالغے کیے گئے ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں اور اس کے بہت قیمتی ہونے کی ہمارے پاس کوئی قابلِ قبول دلیل نہیں ہے۔ یہ جو ایک ضعیف روایت[3] میں اس کی قیمت خراج شام کے

---

۱ الغدیر جلد ۱ ص ۱۹۶

۲ منقول از منہاج البراعۃ جلد ۲ ص ۳۶۳

۳ یہ ضعیف روایت بطور مرسل تفسیر برہان ج ۱ ص ۴۸۵ پر مذکور ہے۔

Marfat.com

برابر بیان کی گئی ہے۔ حقیقت سے زیادہ ایک افسانے سے مشابہت رکھتی ہے اور شاید اس اہم واقعے کی اہمیت ختم کرنے کے لیے اسے گھڑا گیا ہے۔ صحیح اور معتبر روایات جو آیت کی شانِ نزول کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں ایسے کسی افسانے کا کوئی ذکر نہیں لہٰذا ایسی باتوں سے ایک تاریخی واقعے اور حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔

۵۶۔ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۵۶۔ اور جو لوگ اللہ، اس کے پیغمبر اور صاحبانِ ایمان کی ولایت قبول کرلیں (وہ کامیاب ہیں کیونکہ) خدا کی حزب اور پارٹی ہی کامیاب ہے۔

تفسیر

یہ آیت گذشتہ آیت کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے اور اسی کے ہدف کی تاکید و تعقیب کرتی ہے اور مسلمانوں کو بتاتی ہے کہ جنھوں نے خدا، اس کے رسول اور ان صاحبانِ ایمان کی ولایت، سرپرستی اور رہبری کو قبول کرلیا ہے کہ جنکی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ کیا جاچکا ہے وہ کامیاب ہوں گے کیونکہ وہ حزبِ خدا میں داخل ہوجائیں گے اور حزبِ خدا کامیاب و کامران ہے (ومن یتول اللہ و رسولہ والذین اٰمنوا فان حزب اللہ ھم الغالبون)۔

اس آیت میں "ولایت" کے اس معنی پر ایک اور قرینہ موجود ہے جس کا ذکر گذشتہ آیت کے ذیل میں کیا گیا ہے یعنی "ولایت" بمعنی "سرپرستی، تصرف اور رہبری" کیونکہ "حزب اللہ" اور اس کا غلبہ حکومتِ اسلامی سے مربوط ہے نہ کہ ایک عام اور معمول کی دوستی سے اور یہ خود اس بات پر دلیل ہے کہ آیت میں "ولایت" سرپرستی، حکومت نیز اسلام اور مسلمانوں کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے معنی میں ہے کیونکہ "حزب" کے مفہوم میں ایک طرح کی تشکیل، وابستگی اور مشترک اہداف و مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک اجتماع کا تصور پوشیدہ ہے۔

توجہ رہے کہ "الذین اٰمنوا" سے اس آیت میں تمام صاحبِ ایمان مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد وہی شخص ہے جس کی طرف معین اوصاف کے ساتھ گذشتہ آیت میں اشارہ ہوچکا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آیت میں حزب اللہ کی کامیابی سے مراد صرف معنوی کامیابی ہے یا اس میں ہر طرح کی معنوی و مادی کامیابی شامل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آیت کا اطلاق حزب اللہ کی عام محاذوں پر مطلق کامیابی کی دلیل ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی جمعیت حزب اللہ میں شامل ہو یعنی ایمانِ محکم، تقویٰ، عمل صالح، اتحاد، کامل باہمی اعتماد، آگاہی اور علم رکھتا ہو

Marfat.com

اور کافی تیاری کیے ہوئے ہو تو بلا تردید وہ تمام معاملات میں کامیاب ہوگا۔ آج اگر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایسی کامیابی میسر نہیں ہے تو اس کا سبب واضح ہے کیونکہ حزب اللہ کی مذکورہ شرائط میں سے زیادہ تر آج مسلمانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو توانائیاں اور صلاحیتیں دشمن کو شکست دینے کے لیے استعمال ہونا چاہییں، زیادہ تر ایک دوسرے کو کمزور کرنے پر صرف ہو رہی ہیں۔

سورہ مجادلہ آیہ ۲۲ میں بھی حزب اللہ کی کچھ صفات بیان ہوئی ہیں جس کی تعبیر انشاء اللہ متعلقہ مقام پر آئے گی۔

۵۷۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

۵۸۔ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

۵۷۔ اے ایمان والو! اہل کتاب اور مشرکین میں سے ان لوگوں کو اپنا دوست اور سہارا نہ سمجھو جو تمھارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں اور اگر ایمان دار ہو تو خدا سے ڈرو۔

۵۸۔ جب (تم اذان کہتے ہو اور لوگوں کو) نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل تماشہ سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسا گروہ ہیں جو عقل و ادراک نہیں رکھتے۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان، تفسیر ابوالفتوح رازی اور تفسیر فخرالدین رازی میں منقول ہے:

رفاعہ اور سوید مشرکین میں سے تھے۔ انھوں نے اظہار اسلام کیا اور پھر وہ منافقین کے ہم کار دل میں داخل ہو گئے۔ بعض مسلمان ان دونوں سے میل جول رکھتے تھے اور اظہار دوستی کرتے تھے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انھیں اس راہ و رسم کے خطرے سے آگاہ کیا گیا تاکہ وہ اس عمل سے پرہیز کریں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں ولایت بمعنی دوستی ہے نہ کہ ولایت بمعنی سرپرستی و تصرف جو کہ گذشتہ آیات

Marfat.com

میں تھی، کیونکہ اس آیت کی شانِ نزول ان آیات سے مختلف ہے۔ لہٰذا انھیں ایک دوسرے کے لیے قرینہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

دوسری آیت جو پہلی کا ضمیمہ ہے، اس کی شانِ نزول یہ منقول ہے:

یہودیوں کا ایک گروہ اور کچھ عیسائی جب مؤذن کی اذان کی آواز سنتے اور نماز کے لیے مسلمانوں کا قیام دیکھتے تو تمسخر اور استہزاء شروع کر دیتے۔ لہٰذا قرآن مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے دوستی کرنے سے پرہیز کا حکم دیتا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں خداوندِ عالم دوبارہ مومنین کو حکم دے رہا ہے کہ منافقوں اور دشمنوں کی دوستی سے بچو، البتہ انکے جذبات و میلانات کو متحرک کرنے کے لیے یوں فرماتا ہے: اے ایمان والو! جو لوگ تمھارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین و منافقین میں سے ان میں سے کسی کو بھی دوست نہ بناؤ (یا یھا الذین اٰمنوا لاتتخذوا الذین اتخذوا دینکم ھزوًا ولعبًا من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم والکفار اولیاء)۔

آیت کے آخر میں " واتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین " فرما کر تاکید کی گئی ہے کہ تقویٰ اور ایمان سے ایسے لوگوں کی دوستی مناسبت نہیں رکھتی۔

توجہ رہے کہ " ھزو " (بروزن " قفل ") کا معنی ہے " تمسخر آمیز باتیں یا حرکات جو کسی چیز کو بے وقعت ظاہر کرنے کے لیے کی جائیں " جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے استہزاء ایسے مذاق کو کہتے ہیں جو کسی کی عدم موجودگی میں اور پس پشت کیا جائے اگرچہ کبھی کبھار کسی کے سامنے اس کا تمسخر اڑانے پر بھی یہ لفظ بطور نادر بولا جاتا ہے۔

" لعب " عام طور پر ایسے کاموں کو کہا جاتا ہے جن کے انجام دینے میں کوئی صحیح غرض کارفرما نہ ہو یا جو بالکل بغیر ہدف اور مقصد کے انجام پائیں۔ بچوں کے کھیل کود کو بھی " لعب " اسی بنا پر کہتے ہیں۔

گذشتہ آیت میں منافقین اور اہل کتاب کی ایک جماعت سے دوستی کرنے سے روکا گیا ہے کیونکہ وہ لوگ احکام اسلام کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب اگلی آیت میں شاہد کے طور پر ان کے ایک عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ: جب تم مسلمانوں کو نماز کی دعوت دیتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں (واذا نادیتم الی الصلوٰۃ اتخذوھا ھزوًا ولعبًا)[1]

---

[1] مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ " اتخذوھا " کی ضمیر نماز کی طرف لوٹتی ہے یا اذان کی طرف۔ جو شانِ نزول اس سلسلے میں ذکر کی گئی ہیں ان میں بھی یہ دونوں احتمالات موجود ہیں، کیونکہ منافقین اور کفار اذان کی روح پرور ندا کا مذاق بھی اڑاتے تھے اور نماز کا بھی۔ لیکن آیت کا ظہور زیادہ تر اس احتمال کی تائید کرتا ہے کہ یہ ضمیر " صلوٰۃ " کی طرف لوٹتی ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد ان کے عمل کی علت بیان کی گئی ہے، ایسا اس لیے ہے کہ وہ ایک نادان گروہ ہے اور حقائق کا ادراک کرنے کی منزل سے دور ہے (ذلك بانهم قوم لا يعقلون)۔

اذان اسلام کا عظیم شعار ہے

ہر دور میں ہر ملت کا کوئی ایسا شعار ہوتا ہے جو وہ اپنے لوگوں کے احساسات و جذبات کو ابھار کر انھیں ذمہ داریوں کی طرف دعوت دینے کے لیے استعمال کرتی ہے اور یہ بات دور حاضر میں زیادہ وسعت سے دکھائی دیتی ہے۔

گذشتہ اور موجودہ زمانے میں عیسائی ناقوس کی ناموزوں آواز کے ذریعے اپنے پیروکاروں کو کلیسا کی طرف دعوت دیتے ہیں، لیکن اسلام میں اس دعوت کے لیے اذان کو اپنایا گیا ہے جو صدائے ناقوس سے کئی درجے مؤثر اور دلآویز ہے۔ اس اسلامی شعار کی جاذبیت اور کشش اتنی زیادہ ہے کہ صاحب "المنار" کے بقول جب متعصب عیسائی بھی اسے سنتے ہیں تو سننے والوں پر اس کی گہری تاثیر کا اعتراف کرتے ہیں اس کے بعد موصوف نے نقل کیا ہے کہ مصر کے ایک شہر میں کچھ عیسائیوں کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں کی اذان کے وقت اس سرودِ آسمانی کو سننے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔

اس سے بہتر شعار کون سا ہوگا، جس کی ابتداء خدائے بزرگ و برتر کے نام سے ہوتی ہے، جو خالقِ عالم کی وحدانیت اور اس کے پیغمبر کی رسالت کے اعلان کے ساتھ بلند ہوتا ہے اور کامیابی، فلاح، نیک عمل اور یادِ خدا پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ شعار اللہ کے نام سے شروع ہوتا اور اللہ ہی کے نام پر تمام ہوتا ہے۔ اس میں موزوں جملے، مختصر عبارات، واضح محتویات اور اصلاح کنندہ اور آگہی عطا کرنے والا مضمون ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں اذان کہنے کے لیے بہت تاکید کی گئی ہے اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ سے ایک مشہور حدیث منقول ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا:

روز قیامت اذان کہنے والے دوسروں سے سر اور گردن کی مقدار کے برابر بلند تر ہوں گے۔

یہ بلندی درحقیقت وہی مقام رہبری ہے اور دوسروں کو خدا کی طرف اور نماز جیسی عبادت کی طرف دعوت دینے کے سبب سے ہے۔

اسلامی شہروں میں وقت نماز جب اذان کے نغمے گلدستہ اذان سے گونجتے ہیں تو ان کی آواز سچے مسلمانوں کیلیے پیام آزادی اور استقلال و عظمت کی حیات بخش نسیم کی مانند ہوتی ہے۔ یہ آواز بدخواہوں کے تن بدن میں رعشہ اور اضطراب ڈال دیتی ہے۔ یہ صدا بقائے اسلام کی ایک رمز ہے انگلستان کے ایک مشہور شخص کا ایک اعتراف اس پر گواہ ہے۔ وہ عیسائیوں کے ایک گروہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام گلدستہ ہائے اذان سے بلند ہو رہا ہے، خانہ کعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور قرآن مسلمانوں کا رہنما اور پیشوا ہے، اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ اسلامی سرزمینوں پر ہماری سیاست کی

Marfat.com

بنیادیں استوار ہوسکیں۔[1]

لیکن بعض بے چارے اور بے نوا مسلمانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس عظیم اسلامی شعار کو ترک کرکے اس کی جگہ فضول سے پروگرام رکھ دیئے ہیں جبکہ یہ اسلامی شعار ان کے دین اور ثقافت کے قیام کی صدیوں پر حاوی تاریخ کی سند ہے۔ خدا ایسے افراد کی ہدایت کرے اور انھیں مسلمانوں کی صفوں میں پلٹا دے۔

واضح ہے کہ جیسے اذان کا باطن اور اس کے مفاہیم خوبصورت ہیں اسی طرح اسے ادا بھی اچھی آواز میں کرنا چاہیے اور اس کے باطنی حسن کو نامرغوب طریقے سے ظاہر کرکے پامال نہیں کردینا چاہیے۔

اذان وحی کے ذریعے پہنچی

اہل سنت کے طرق سے منقول کئی ایک روایات میں اذان کی تشریع کے بارے میں عجیب و غریب باتیں منقول ہیں جو منطق اسلام سے بالکل مطابقت نہیں رکھتیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

> پیغمبر خدا (ص) سے اصحاب نے درخواست کی کہ وقت نماز بتانے کے لیے کوئی نشانی ہونا چاہیے۔ اس پر آپ (ص) نے اپنے صحابہ سے مشورہ کیا۔ ہر ایک نے کوئی نہ کوئی تجویز پیش کی۔ کسی نے کہا مخصوص علم لہرانا چاہیے، کسی نے کہا آگ روشن کرنا چاہیے اور کسی نے کہا ناقوس بجانا چاہیے۔ لیکن رسول اللہؐ نے ان میں سے کوئی بات قبول نہ کی۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن زید اور عمر بن خطاب نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص انھیں حکم دے رہا ہے کہ نماز کا وقت بتانے کے لیے اذان کہیں اور اس نے ان دونوں کو اذان سکھائی اور رسول اللہؐ نے اسے قبول کرلیا۔[2]

یہ جعلی روایت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین معلوم ہوتی ہے کہ جس کے مطابق آپ وحی پر انحصار کرنے کی بجائے کچھ افراد کے خوابوں کا سہارا لیتے تھے اور کچھ لوگوں کے خوابوں کی بنیاد پر اپنے دین کے احکام پیش کرتے تھے۔

درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ روایات اہل بیتؑ میں ہے کہ اذان پیغمبر اسلام کو وحی کے ذریعے تعلیم دی گئی تھی امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ جب جبرئیل اذان لے کر آئے تو پیغمبر خداؐ کا سر حضرت علیؑ کی گود میں تھا اور جبرئیل نے آپ کو اذان و اقامت بتائیں۔ جب رسول اللہؐ نے اپنا سر اٹھایا تو حضرت علیؑ سے پوچھا:

> کیا تم نے جبرئیل کی اذان کی آواز سنی ہے۔

حضرت علیؑ نے کہا:

---

[1] یہ الفاظ گلاڈسٹون کے ہیں جو اپنے زمانے میں انگریزوں کا پہلے درجے کا سیاستدان تھا۔

[2] تفسیر قرطبی

Marfat.com

جی ہاں

رسول اللہؐ نے پھر پوچھا:

کیا اسے یاد کر لیا ہے؟

حضرت علیؑ نے کہا:

جی ہاں

پیغمبر خداؐ نے فرمایا:

بلال (جن کی آواز اچھی تھی) کو بلاؤ اور اسے اذان واقامت سکھا دو۔

حضرت علیؑ نے بلال کو بلا کر اسے اذان سکھا دی[1]

اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے کتاب "النص والاجتہاد" ص ۱۲۸ کی طرف رجوع کریں۔

۵۹۔ قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ هَلۡ تَنۡقِمُوۡنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاَنَّ اَكۡثَرَكُمۡ فٰسِقُوۡنَ ○

۶۰۔ قُلۡ هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِكَ مَثُوۡبَةً عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيۡهِ وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوۡتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ○

ترجمہ

۵۹۔ کہہ دو: اے اہل کتاب! کیا تم ہم پر اعتراض کرتے ہو (مگر ہم نے کیا کیا ہے) سوائے اس کے کہ ہم خدائے یکتا پر، جو کچھ اس نے ہم پر نازل کیا ہے اس پر اور جو کچھ اس سے پہلے نازل ہو چکا ہے اس پر ایمان لائے ہیں اور یہ اس بنا پر ہے کہ تم میں سے اکثر راہِ حق سے منحرف ہو گئے ہیں (لہٰذا حق تمھیں اچھا نہیں لگتا)۔

۶۰۔ کہہ دو: کیا میں تمھیں ایسے لوگوں کے بارے میں آگاہ کروں جن کا ٹھکانا اور جزا اس سے بدتر ہے وہ لوگ کہ جنھیں خدا نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان پر اپنا غضب نازل کیا ہے (اور انھیں مسخ کر دیا ہے) اور ان میں سے بندر اور خنزیر بنائے اور جنھوں نے بت پرستی کی ہے ان کا ٹھکانا بُرا ہے اور وہ راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

[1] وسائل، ج ۴ ص ۶۱۲

Marfat.com

شانِ نزول

عبداللہ بن عباس سے منقول ہے :

کچھ یہودی رسول اللہؐ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ اپنے عقائد انھیں بتائیں ۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: میں خدائے بزرگ و یگانہ پر ایمان رکھتا ہوں اور جو کچھ ابراہیم ، اسماعیل اسحاق ، یعقوب ، موسیٰ ، عیسیٰ اور دوسرے پیغمبران خدا پر نازل ہوا ہے اسے حق سمجھتا ہوں اور ان میں تفریق نہیں کرتا ۔

وہ کہنے لگے : ہم عیسیٰ کو نہیں مانتے اور اس کی نبوّت کو قبول نہیں کرتے ۔

انھوں نے مزید کہا : ہم کسی دین کو تمھارے دین سے بدتر نہیں سمجھتے ۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انھیں جواب دیا ۔

تفسیر

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ اہلِ کتاب سے پوچھیے اور کہیے کہ ہم سے کون سا کام سرزد ہوا ہے کہ تم ہم میں عیب نکالتے ہو اور ہم پر تنقید کرتے ہو، سوائے اس کے کہ ہم خدائے یگانہ پر ایمان لائے ہیں اور جو ہم پر اور گذشتہ انبیاء پر نازل ہوا ہے اس کے سامنے ہم سرِ تسلیم خم کرتے ہیں (قل یا اهل الکتاب هل تنقمون منا الا ان اٰمنا باللّٰه وما انزل الینا وما انزل من قبل)[1]

یہ آیت یہودیوں کی بے محل ضد، ہٹ دھرمی اور تعصبات کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ وہ لوگ اپنے اور اپنے تحریف شدہ دین کے خلاف کسی کی کچھ وقعت کے قائل نہیں تھے اور اسی شدید تعصب کی بنا پر حق ان کی نظر میں باطل اور باطل ان کی نگاہ میں حق بن چکا ہے ۔

آیت کے آخر میں ایک جملہ ہے جو درحقیقت پہلے جملے کی علت اور سبب ہے ۔ اس میں کہا گیا ہے ، اگر تم توحیدِ خالص اور تمام آسمانی کُتب کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر ہم پر اعتراض کرتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فسق اور گناہ سے آلودہ ہو چکے ہیں اور اگر کچھ لوگ پاکیزگی اور حق کا راستہ اپناتے ہیں تو یہ تمھاری نظر میں عیب ہے (وان اکثرکم فاسقون) ۔

فسق و گناہ سے آلودہ انسانوں کی کثرت سے تشکیل پانے والے آلودہ ماحول میں اصولی طور پر حق و باطل کا معیار اسقدر دگرگوں ہو جاتا ہے کہ اس میں پاکیزہ عقیدہ اور صالح عمل کو برا سمجھا جانے لگتا ہے اور اسے ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے اور غلط

---

[1] "تنقمون" مادہ "نقمت" سے ہے ۔ یہ دراصل کسی چیز کا انکار کرنے کے معنی میں ہے چاہے وہ انکار زبان سے ہو یا عمل سے اور سزا دینے کے ذریعے سے ہو ۔

Marfat.com

عقائد و اعمال کو اچھا سمجھا جاتا ہے اور انہیں بنظرِ تحسین دیکھا جاتا ہے ۔ یہ مسخ شدہ فکر کی خاصیت ہے ۔ جب کوئی گناہ میں ڈوب جاتا ہے اور اس کا عادی ہو جاتا ہے تو اُس کی یہی حالت ہو جاتی ہے ۔

توجہ رہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ آیت تمام اہل کتاب پر تنقید نہیں کر رہی بلکہ صالح اور نیک اقلیت کا حساب لفظ " اکثر " استعمال کر کے الگ کر دیا گیا ہے ۔

دوسری آیت میں اہلِ کتاب کے تحریف شدہ عقائد، غلط اعمال اور جو سزائیں انہیں دامن گیر ہوئیں ان کا موازنہ سچے مومنین اور مسلمین کی حالت و کیفیت سے کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان دونوں گروہوں میں سے کون سا تنقید اور سرزنش کا مستحق ہے ۔ یہ دراصل متعصب اور ہٹ دھرم افراد کو متوجہ کرنے کے لیے ایک منطقی جواب ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے ! اے پیغمبرؐ ! ان سے کہہ دو کیا خدائے یکتا اور آسمانی کتُب پر ایمان لانا باعثِ سرزنش اور وجہِ اعتراض ہے یا پھر خود ان کے بُرے اعمال جن کے سبب وہ خدائی سزاؤں میں گرفتار ہوئے ہیں ۔ انہیں کہہ دو : کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں آگاہ کروں جن کا معاملہ بارگاہِ الٰہی میں اس سے بدتر ہے (قل ھل انبئکم بشر من ذٰلک مثوبۃ عند اللّٰہ)[1] ۔

اس میں شک نہیں کہ خدا تعالیٰ اور آسمانی کتاب پر ایمان لانا کوئی بُری بات نہیں ہے ۔ یہ جو زیرِ نظر آیت میں اس کا موازنہ اہلِ کتاب کے اعمال و افکار سے کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ " ان میں سے بدتر کون ہے " درحقیقت ایک کنایہ ہے ۔ جیسے اگر کوئی ناپاک شخص کسی پاکیزہ انسان پر تنقید کرے تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ پاکدامن بدتر ہیں یا گناہ سے آلودہ لوگ ۔

اس کے بعد اس مطلب کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : وہ لوگ جو اپنے اعمال کی وجہ سے پروردگار کی آفت اور غضب کا شکار ہوئے ہیں انہیں بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا ہے اور وہ کہ جنہوں نے طاغوت اور بُت کی پرستش کی ہے یقیناً ایسے لوگوں کی دنیا میں حیثیت و مقام اور آخرت میں ٹھکانا بدتر ہو گا اور وہ راہِ راست اور جادۂ مستقیم[2] سے بہت گمراہ ہیں (من لعنہ اللّٰہ وغضب علیہ وجعل منھم القردۃ والخنازیر وعبد الطاغوت ط اولٰئک شر مکاناً واضل عن سواء السبیل) ۔

---

[1] " مثوبۃ " اور " ثواب " دراصل پہلی حالت کی طرف رجوع کرنے اور پلٹنے کے معنی میں ہے اور یہ لفظ ہر طرح کی جزا اور سرزنش کے لیے بھی بولا جاتا ہے لیکن زیادہ تر اچھی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے بعض اوقات سزا کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مندرجہ بالا آیت میں یہ لفظ انجام یا جزا و سزا کے معنی میں ہے ۔

[2] " سواء " لغت میں مساوات، اعتدال اور برابری کے معنی میں ہے اور یہ جو آیتِ بالا میں جادۂ مستقیم کو سواء السبیل کہا گیا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہر طرف سے برابر، مساوی اور ہموار ہے ۔ اور ہر معتدل، منظم اور انحراف سے خالی روش اور طریقے کو سیدھا راستہ کہا جاتا ہے ۔ ضمناً توجہ رہے کہ " عبد الطاغوت " کا عطف " من لعنہ اللّٰہ " ہے اور " عَبَدَ " فعل ماضی ہے اور عبد کی جمع نہیں ہے جیسا کہ بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے ۔ اور اہلِ کتاب کی طرف طاغوت کی پرستش کی نسبت یہودیوں کی گوسالہ پرستی کی طرف اشارہ ہے یا منحرف اور کجرو پیشواؤں کے سامنے بے چون و چرا سرِ تسلیم خم کرنے کی طرف اشارہ ہے ۔

Marfat.com

مسخ اور بعض انسانوں کے چہروں کے متغیر ہونے کے بارے میں اور یہ کہ مسخ سے مراد جسمانی چہرے کا تغیر ہے یا فکری و اخلاقی چہرے کی تبدیلی، اس سلسلے میں انشاء اللہ سورۂ اعراف آیہ ۱۶۲ کے ذیل میں تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

۶۱۔ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ۝

۶۲۔ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

۶۳۔ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۱۔ اور وہ جب تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں (لیکن) وہ کفر کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور کفر کے ساتھ ہی نکل جاتے ہیں اور جو کچھ وہ چھپائے ہوئے ہیں خدا اس سے آگاہ ہے۔

۶۲۔ تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ وہ گناہ، تجاوز اور مالِ حرام کھانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں جو کام وہ انجام دیتے ہیں کس قدر بُرا ہے۔

۶۳۔ عیسائی اور یہودی علماء انھیں گناہ آمیز باتوں اور مالِ حرام کھانے سے کیوں منع نہیں کرتے۔ کس قدر بُرا ہے وہ عمل جو وہ انجام دیتے ہیں۔

تفسیر

پہلی آیت میں اہل کتاب منافقین کے بارے میں بحث مکمل کرتے ہوئے اور ان کے چہروں سے نفاق کے پردے ہٹاتے ہوئے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ: جس وقت وہ تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن کفر سے معمور دل کے ساتھ آتے ہیں اور اسی حالت میں تمھارے پاس سے اٹھ جاتے ہیں اور منطقی استدلال اور تمھاری باتیں ان کے دل پر کچھ اثر نہیں کرتیں (واذا جاءوکم قالوا اٰمنا وقد دخلوا بالکفر وھم قد خرجوا بہ)۔

Marfat.com

لہٰذا وہ جو ظاہراً حمایت حق میں باتیں کرتے ہیں، اظہار ایمان کرتے ہیں اور تمھاری باتوں کی ریاکارانہ پذیرائی کرتے ہیں، اس سے تھیں دھوکا نہ ہو۔

آیت کے آخر میں انھیں خطرے سے آگاہ کرتا ہے کہ ان تمام پردہ پوشیوں کے باوجود جو کچھ تم چھپاتے ہو خدا اس سے آگاہ اور باخبر ہے (واللہ اعلم بما کانوا یکتمون)۔

بعد والی آیت میں ان کے نفاق کی کچھ اور نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ گناہ، ظلم اور حرام خوری کی راہ میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں (وتری کثیراً منھم یسارعون فی الاثم والعدوان واکلھم السحت[1])۔

یعنی گناہ اور ظلم کے راستے میں یوں قدم بڑھاتے ہیں گویا باعث فخر اہداف کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بغیر کسی شرم کے کوشش کرتے ہیں کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔

توجہ رہے کہ لفظ "اثم" کفر کے معنی میں بھی آیا ہے اور ہر قسم کے گناہ کے مفہوم میں بھی آیا ہے۔ لیکن یہاں "عدوان" کے مقابلے میں آیا ہے۔ لہٰذا بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے: ایسے گناہ جن کا نقصان صرف کرنے والے ہی کو پہنچے بخلاف "عدوان" کے، جس کا نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے۔

یہ احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ "عدوان" کا ذکر "اثم" کے بعد اصطلاح کے مطابق خاص کے بعد عام کا ذکر ہے اور ان کے بعد حرام کھانے کا تذکرہ "ذکر اخص" کے طور پر ہے۔ اس طرح پہلے تو ان کی ہر قسم کے گناہ کی بنا پر مذمت کی گئی ہے اس کے بعد اہمیت کی وجہ سے دو عظیم گناہوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی ایک ظلم و ستم اور دوسرا حرام خوری چاہے وہ رشوت کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں۔

مختصر یہ کہ قرآن اہل کتاب کے ان منافق افراد کو آشکار کرتا ہے اور ان کی مذمت کرتا ہے جو بڑی لاپرواہی سے ہر طرح کا گناہ سرانجام دیتے ہیں، خصوصاً ظلم و ستم کرتے ہیں اور بالخصوص ناجائز مال کھاتے ہیں مثلاً رشوت اور سود کھاتے ہیں۔

آیت کے آخر میں ان کے اعمال کی برائی تاکیداً ظاہر کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: یہ لوگ کیسا برا اور قبیح عمل انجام دیتے ہیں (لبئس ما کانوا یعملون)۔ "کانوا یعملون" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال کو وہ اتفاقیہ نہیں بجا لاتے بلکہ وہ ان پر ڈٹے رہتے ہیں اور بار بار ان کا ارتکاب کرتے ہیں۔

تیسری آیت میں ان کے علماء پر حملہ کیا گیا ہے جو اپنی خاموشی کے ذریعے انھیں گناہ کا شوق دلاتے تھے، ارشاد ہوتا ہے: عیسائی اور یہودی علماء انھیں گناہ آلودہ باتوں اور حرام خوری سے کیوں نہیں روکتے (لولا ینھٰھم الربٰنیون والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت)۔

---

[1] "سحت" کے معنی کے بارے میں اس سورہ کی آیہ ۴۲ کے ذیل میں "یسارعون" کے بارے میں اسی سورہ کی آیہ ۴۱ کے ذیل میں اور "اثم" کے متعلق سورہ بقرہ آیہ ۲۱۹ کے ذیل میں جلد دوم میں بحث کی جاچکی ہے۔

Marfat.com

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے " ربانیون " " ربانی " کی جمع ہے اور یہ لفظ " رب " سے لیا گیا ہے ۔ اس کا مطلب ہے ایسے علماء جو لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں ، لیکن زیادہ تر یہ لفظ عیسائی مذہبی علماء کے لیے استعمال ہوتا ہے " احبار " " حبر " (بروزن " ابر ") کی جمع ہے ۔ اس کا مطلب ہے ایسے علماء جو معاشرے پر اچھا اثر مرتب کریں ، لیکن زیادہ تر یہ لفظ یہودی مذہبی علماء کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔

ضمناً سوال پیدا ہوتا ہے کہ گذشتہ آیت میں لفظ " عدوان " تھا لیکن اس آیت میں نہیں ہے ۔ بعض نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ " اثم " اسی وسیع مفہوم ہے جس میں " عدوان " بھی داخل ہے ۔

اس آیت میں گذشتہ آیت کے برخلاف " قولھم الاثم " آیا ہے ۔ یہ تعبیر ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو گناہ آلود باتوں سے بھی روکیں اور اعمال گناہ سے بھی ۔ یا پھر قول یہاں اعتقاد کے معنی میں ہے یعنی علماء ایک فاسد معاشرے کی اصلاح کے لیے پہلے ان کے غلط افکار اور عقائد کی اصلاح کریں کیونکہ جب تک افکار و نظریات میں انقلاب نہیں آتا یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ان کے عمل میں کوئی گہری اصلاح ہو سکے ۔ اس طرح سے آیت فاسد اور بُرے معاشرے کی اصلاح کے لیے علماء کو نشاندہی کرتی ہے کہ کام فکری انقلاب سے شروع کیا جائے ۔

جیسے اصلی گناہ گاروں کی مذمت کی گئی ہے آیت کے آخر میں خاموش رہنے والے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ترک کر دینے والے علماء کی بھی مذمت کی گئی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : کتنا بُرا ہے وہ کام جو یہ انجام دیتے ہیں (لبئس ما کانوا یصنعون) اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عظیم ذمہ داری کو پورا نہیں کرتے خاص طور پر علماء اور دانشندان کا انجام بھی اصلی گناہ گاروں کا سا ہو گا ۔ درحقیقت یہ لوگ ان کے جرم میں شریک شمار ہوں گے ۔

مشہور مفسر ابن عباس سے منقول ہے ، وہ کہتے ہیں :

> اپنی ذمہ داریوں کی بیان نہ کرنے والے اور خاموش رہنے والے علماء کی مذمت میں یہ سخت ترین آیت ہے ۔

واضح ہے کہ یہ حکم خاموش رہنے والے یہودی اور عیسائی علماء سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان تمام صاحبانِ فکر و نظر ، راہبروں اور علماء کے بارے میں ہے جو لوگوں کو گناہ سے آلودہ ہوتا دیکھیں اور انھیں ظلم و ستم کی راہ پر تیز گام پائیں اور خاموش بیٹھے رہیں ، کیونکہ خدا کا حکم تو سب کے لیے برابر ہے ۔

امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا :

> گذشتہ قومیں اس بنا پر ہلاک اور نابود ہوگئیں کہ وہ گناہ کی مرتکب ہوتی تھیں اور ان کے علماء سکوت اختیار کر لیتے تھے اور نہی عن المنکر نہیں کرتے تھے ۔ اس حالت میں ان پر خدا کا عذاب ، سزائیں اور مصیبتیں نازل ہوتی تھیں ۔ پس اے لوگو ! تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرو تاکہ تمھارا بھی وہی انجام نہ ہو [1]

---

[1] نور الثقلین جلد ۱ ص ۶۴۹

Marfat.com

یہی مضمون نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ (خطبہ ۱۹۲) میں بھی ہے، آپؑ نے فرمایا:

"فان الله سبحانه لم یلعن القران الماضی بین ایدیکم الا لترکهم الامر بالمعروف والنهی عن المنکر فلعن السفهاء لرکوب المعاصی والحکماء لترك التناهی"

گزشتہ زمانے کے لوگوں کو خدا تعالیٰ نے صرف اس لیے اپنی رحمت سے دور کر دیا کہ انھوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دیا۔ اس نے عوام کو گناہ کے ارتکاب اور علماء کو نہی عن المنکر ترک کرنے پر اپنی لعنت کا حق دار قرار دیا اور انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ آیت میں عام لوگوں کے بارے میں لفظ "یعملون" آیا ہے اور زیر نظر آیت میں علماء کے لیے "یصنعون" استعمال ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ "یصنعون"، "صنع" کے مادہ سے ہے۔ اس کا مطلب ہے ایسے کام جو بڑی توجہ اور مہارت سے انجام دیئے جائیں جبکہ "یعملون"، "عمل" کے مادہ سے ہے اور ہر کام کے لیے بولا جاتا ہے اگر نادان لوگ اور عوام بُرے کام انجام دیتے ہیں تو ان میں سے کچھ نادانی اور بے خبری کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں لیکن علماء اور دانشور جو اپنی ذمہ داری پر عمل نہیں کرتے تو واضح ہے کہ وہ جانتے ہوئے اور ماہرانہ طور پر غلط کام انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے عالم کے لیے جاہل سے زیادہ سخت سزا ہے۔

۶۴۔ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ○

ترجمہ

۶۴۔ اور یہودی کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ تو زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ انھی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ اس بات کی وجہ سے رحمتِ الٰہی سے دور ہیں جبکہ اس (کی قدرت) کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح سے چاہے (بخشتا اور

Marfat.com

خرچ کرتا ہے اور یہ آیات جو تجھ پر تیرے پروردگار کی نازل ہوئی ہیں ان میں سے بہت سوں کے طغیان اور کفر کو بڑھا دیتی ہیں اور ان کے درمیان ہم نے قیامت تک کے لیے دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے اور جب بھی انھوں نے جنگ کی آگ روشن کی خدا نے اسے خاموش کر دیا اور وہ زمین میں فساد کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور خدا فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر

اس آیت میں یہودیوں کی ناروا اور گناہ آلود باتوں کی ایک مثال پیش کی گئی ہیں جبکہ گذشتہ آیت میں کلی طور پر ان کی ایسی باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ تاریخ نشاندہی کرتی ہے کہ یہودی ایک زمانے میں اوجِ قدرت میں تھے۔ اس وقت کی اہم آباد دنیا کے ایک حصے پر ان کی حکومت تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان بن داؤد کے زمانے کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ بعد میں بھی زور و شور سے ان کی قدرت و طاقت موجود رہی لیکن ظہورِ اسلام کے ساتھ ہی خصوصاً حجاز میں ان کی قدرت کا آفتاب ڈوب گیا۔ بنی نضیر، بنی قریظہ اور خیبر کے یہودیوں سے پیغمبر اکرمؐ کی جنگوں کے باعث وہ انتہائی کمزور ہو گئے۔ اس موقع پر ان میں سے بعض نے اپنی گذشتہ قدرت و عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے استہزاء اور مذاق کے طور پر کہا کہ خدا کا ہاتھ تو زنجیر سے بندھا ہوا ہے اور وہ ہم پر بخشش و نوازش نہیں کرتا (بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بات کہنے والا فنحاص بن عاذورا تھا جو بنی قینقاع کا سردار تھا اور بعض نے نباش بن قیس کا نام لکھا ہے) چونکہ دوسرے بھی اس کی گفتگو سے راضی تھے لہٰذا قرآن نے اس بات کی ان سب کی طرف نسبت دی ہے اور فرمایا ہے یہودیوں نے کہا کہ خدا کا ہاتھ زنجیر سے بندھا ہوا ہے (وقالت الیهود ید الله مغلولة)۔

توجہ رہے کہ "ید" عربی میں کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ایک معنی "ہاتھ" ہے۔ دوسرا "نعمت"، تیسرا "قدرت"، چوتھا "سلطنت و حکومت" اور پانچواں "تسلّط" ہے۔ البتہ اس کا حقیقی معنی "ہاتھ" ہی ہے اور چونکہ انسان اہم ترین کام ہاتھ سے انجام دیتا ہے لہٰذا یہ لفظ کنایہ کے طور پر دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فارسی میں "دست" بھی اسی طرح مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

طریق اہلِ بیتؑ سے مروی بعض روایات میں ہے کہ یہ بات یہودیوں کے مسئلہ قضا و قدر اور سرنوشت و تفویض کے بارے میں عقیدے کی طرف اشارہ ہے، ان کا نظریہ تھا کہ ابتدائے خلق میں خدا نے تمام امور کا تعین کر دیا ہے اور جسے انجام پانا چاہیے وہ گویا انجام پا چکا ہے اور خدا خود بھی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا[1] البتہ آیت کے ذیل میں "بل یداه مبسوطتان" بھی ہے جیسا کہ آگے آئے گا، یہ عبارت پہلے معنی کی تائید کرتی ہے، البتہ دوسرا معنی بھی پہلے معنی کی طرف ہی

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱ ص ۶۴۹، تفسیر برہان جلد ۱ ص ۴۸۶

Marfat.com

ایک راستہ ہے کیونکہ جب ان کی زندگی درہم برہم ہوگئی اور ان کے اقبال کا ستارہ ڈوب گیا تو ان کا خیال تھا کہ یہ ان کی تقدیر میں تھا جسے بدلا نہیں جاسکتا کیونکہ یہ انجام تو شروع سے معین ہو چکا ہے اور عملی طور پر خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔

خدا تعالیٰ ان کے جواب میں پہلے تو اس عقیدے کی مذمت کرتا ہے، فرمایا گیا ہے: ان کے ہاتھ زنجیر سے بندھے ہوں اور اس ناروا بات کی وجہ سے وہ رحمت سے دُور ہوں (غلت ایدیھم ولعنوا بما قالوا)

اس کے بعد اس غلط عقیدے کے بطلان کے لیے ارشاد ہوتا ہے: خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے اور جس پر چاہتا ہے لطف و عنایت کرتا ہے (بل یداہ مبسوطتان ینفق کیف یشاء) اس کام میں کوئی مجبوری ہے نہ وہ عواملِ طبعی و فطری کے جبر کا محکوم ہے اور نہ وہ جبرِ تاریخی کا پابند ہے بلکہ اس کا ارادہ ہر چیز سے بالاتر اور ہر چیز میں نافذ ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہودیوں نے لفظ "ید" مفرد استعمال کیا ہے لیکن خدا نے "ید" کو تثنیہ کے طور پر استعمال کیا ہے، فرماتا ہے: اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ یہ دراصل تاکیدِ مطلب بھی ہے اور خدا تعالیٰ کے انتہائی جود و بخشش کے لیے لطیف کنایہ بھی۔ کیونکہ جو ذات زیادہ سخی ہو دونوں ہاتھ سے بخشش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں دو ہاتھوں کا ذکر قدرتِ کاملہ کے لیے بھی کنایہ ہو سکتا ہے اور شاید یہ مادی و معنوی یا دنیوی و اُخروی نعمتوں کی طرف بھی اشارہ ہو۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: یہاں تک کہ ان کی گفتار اور عقائد سے پردہ کشائی کرنے والی یہ آیات اُن پر مثبت اثر مرتب کرنے کی بجائے اور انہیں غلط راستے سے باز رکھنے کی بجائے ان میں سے بہت سوں کو ہٹ دھرمی کے چکر میں ڈال دیتی ہیں اور ان کا طغیان و کفر مزید بڑھ جاتا ہے (ولیزیدن کثیرًا منھم ما انزل الیك من ربك طغیانًا وکفرًا)۔

لیکن ان کی ان ناروا باتوں، عقائد اور طغیان و کفر میں ہٹ دھرمی کے بدلے خدا نے اس جہان میں ان کے لیے سخت سزا مقرر کی ہے اور وہ یہ کہ ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے (والقینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیٰمۃ)۔

"عداوت" اور "بغضاء" سے یہاں کیا مُراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن اگر ہم یہودیوں کی موجودہ استثنائی اور ناپائیدار صورتِ حال سے قطع نظر کرلیں اور تاریخ میں ان کی دربدر اور پراگندگی کی زندگی کو ملحوظِ نظر رکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس خاص تاریخی کیفیت کا ایک اہم عامل ان میں اتحاد، عزم اور ارادے کی پختگی کا فقدان تھا کیونکہ اگر ان میں اتحاد اور عزم صمیم ہوتا تو اتنی طویل تاریخ میں وہ اس طرح سے دربدر، منتشر اور بدبخت نہ رہتے۔

اسی سورہ کی آیہ ۱۴ کے ذیل میں اہلِ کتاب کے درمیان دائمی عداوت و دشمنی کے مسئلہ پر ہم نے مزید وضاحت کی ہے۔

آیت کے آخر میں آتشِ جنگ بھڑکانے کے لیے یہودیوں کی کوششوں اور خدا کی طرف سے مسلمانوں کو اس نابود کرنے والی آگ سے رہائی اور لطف و کرم کے بارے میں اشارہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب انھوں نے آتشِ جنگ بھڑکائی تو خدا نے اسے خاموش کردیا اور تمھیں اس سے محفوظ رکھا (کلما اوقدوا نارًا للحرب اطفأھا اللہ)۔ یہ حقیقت ہیں

Marfat.com

پیغمبر اسلام کی پُر اعجاز زندگی کا ایک نکتہ ہے۔ کیونکہ یہودی حجاز کے تمام لوگوں کی نسبت زیادہ طاقتور اور جنگی امور سے زیادہ آشنا تھے۔ ان کے پاس نہایت محکم قلعے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے پاس مالی وسائل بھی بہت تھے جن سے وہ جنگوں میں کام لیتے تھے۔ یہاں تک کہ قریش ان کی مدد حاصل کرنے میں کوشش کرتے تھے۔ اوس و خزرج میں سے ہر قبیلہ ان سے پیمان دوستی اور جنگی معاہدے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے باوجود ان کی طاقت کا زعم اس طرح ٹوٹا کہ کوئی اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع کے یہودی خاص حالات کی وجہ سے جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ خیبر کے قلعوں میں رہنے والے اور فدک کے یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہاں تک کہ حجاز کے بیابانوں میں رہنے والے یہودیوں نے بھی عظمت اسلام کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ نہ صرف یہ کہ وہ مشرکین کی مدد نہ کر سکے بلکہ خود بھی مقابلے سے کنارہ کش ہو گئے۔ قرآن مزید کہتا ہے: وہ ہمیشہ روئے زمین میں فتنہ فساد کے بیج بونے کی کوشش کرتے ہیں (و یسعون فی الارض فسادًا) جبکہ خدا فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (و اللہ لا یحب المفسدین)۔

اس بنا پر قرآن ان پر کبھی نسلی اور خاندانی حوالے سے کوئی اعتراض نہیں کرتا بلکہ قرآن کی تنقید اور سرزنش کا معیار اور نمونہ وہ اعمال ہیں جو ہر شخص اور گروہ انجام دیتا ہے۔ بعد کی آیات میں ہم دیکھیں گے کہ ان تمام چیزوں کے باوجود قرآن نے ان کے لیے راہ حق کی طرف لوٹ آنے کی راہ کھلی رکھی ہے۔

۶۵۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝

۶۶۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۵۔ اور اگر اہل کتاب ایمان لائے اور انھوں نے تقویٰ اختیار کیا تو ہم ان کے گناہ بخش دیں گے اور انھیں نعمات سے معمور باغات بہشت میں داخل کر دیں گے۔

۶۶۔ اور اگر وہ تورات، انجیل اور جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے (قرآن کی صورت میں) نازل ہوا ہے اسے قائم رکھیں تو آسمان اور زمین سے رزق کھائیں گے۔ ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر بُرے اعمال انجام دیتے ہیں۔

Marfat.com

تفسیر

گذشتہ آیات میں اہلِ کتاب کے طور طریقوں اور طرزِ عمل پر تنقید کی گئی ہے۔ اب ان دو آیات میں تربیتی اصول کے مطابق خدا تعالیٰ اہل کتاب میں سے منحرفین کو راہِ راست پر لانے، انھیں حقیقی راستے کی نشاندہی کرنے اور ان میں سے اقلیت جو ان کے غلط افعال میں ہم قدم نہ تھی کی تعریف کرنے کے لیے کہتا ہے: اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان کے گذشتہ گناہوں پر پردہ ڈال دیں گے اور ان سے صرفِ نظر کریں گے (ولو ان اھل الکتاب اٰمنوا واتقوا لکفرنا عنھم سیئاتھم) نہ صرف ان کے گناہ بخش دیں گے بلکہ انھیں طرح طرح کی نعمتوں سے پُر باغاتِ جنت میں داخل کردیں گے (ولادخلناھم جنات النعیم) یہ تو معنوی اور اخروی نعمتوں کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد ایمان و تقویٰ کے گہرے اثر حتیٰ مادی زندگی میں اس کے اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھیں اور زندگی کے دستور العمل کے طور پر انھیں اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں اور جو کچھ پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اس سب پر عمل کریں چاہے وہ گذشتہ آسمانی کتب ہوں یا قرآن اور ان میں تفریق و تعصّب کو راہ نہ دیں تو آسمان و زمین کی نعمتیں انھیں گھیر لیں گی (ولو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم)۔

اس میں شک نہیں کہ تورات اور انجیل کو قائم اور برپا رکھنے سے مراد ان کا وہ حقیقی حصّہ ہے جو اس زمانے میں ان کے پاس موجود تھا نہ کہ ان کے تحریف شدہ حصّے جو کم و بیش قرائن سے پہچانے جاتے تھے اور "ما انزل الیھم من ربھم" سے مراد تمام آسمانی کتب اور خدائی احکام ہیں کیونکہ یہ جملہ مطلق ہے اور درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ قومی تعصبات کو دینی اور الٰہی مسائل کے ساتھ نہیں ملانا چاہیے۔ یہاں عربوں اور یہودیوں کی آسمانی کتب کی بات نہیں ہے۔ اصل بات تو خدائی احکام کی ہے۔ یہ کہہ کر قرآن چاہتا ہے کہ جس قدر ہو سکے ان کے تعصب کو کم کیا جائے اور ان کے قلب و روح کی گہرائیوں میں بات اثر کر سکے۔ اسی لیے تمام ضمیریں انھیں کی طرف لوٹتی ہیں (الیھم، من ربھم، من فوقھم، من تحت ارجلھم) یہ سب کچھ اس بنا پر ہے تاکہ وہ ہٹ دھرمی کی سواری سے اُتر پڑیں اور یہ تصور نہ کریں کہ قرآن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا مطلب ہے کہ یہودیوں نے عربوں کے سامنے سر جھکا دیا بلکہ اس کا مطلب تو خدائے عظیم کے سامنے سر جھکانا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تورات و انجیل کے احکام کو قائم کرنے سے مراد ان کے اصول پر عمل کرنا ہے کیونکہ جیسے ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ تعلیماتِ انبیاء کے اصول تمام جگہ ایک جیسے ہیں اور ان کے درمیان صرف کامل و اکمل کا فرق ہے اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ گذشتہ دین کے بعض احکام بعد والے دین کے بعض احکام کے ذریعے منسوخ ہو جائیں۔

مختصر یہ کہ مندرجہ بالا آیت ایک مرتبہ پھر اس بات پر زور دے رہی ہے کہ آسمانی تعلیمات کی پیروی صرف بعد از موت کی زندگی کے اسباب مہیا کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ انسانوں کی تمام مادی زندگی کے لیے بھی مفید ہے۔ یہ پیروی جماعتوں اور گروہوں کی صفوں کو منظم کرتی ہے، توانائیوں کو مجتمع کرتی ہے، نعمتوں کو بابرکت کرتی ہے، وسائل کو وسعت دیتی ہے، زندگی کو

Marfat.com

خوش حال بناتی ہے اور امن وامان پیدا کرتی ہے۔

ان عظیم مادی وسائل اور فراواں انسانی توانائیوں پر ایک نظر ڈالی جائے کہ جو آج کی دنیائے انسانیت میں تعلیماتِ انبیاء سے انحراف کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ سب تباہ کن ہتھیاروں، بے سبب کشمکشوں اور ویران کن مساعی پر صرف ہو رہی ہیں۔ آج دنیا کی جتنی دولت اور وسائل دنیا کی تباہی کے لیے استعمال ہو رہے ہیں وہ اصلاح و فلاح کے لیے استعمال ہونے والے وسائل سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ آج کس قدر دماغی صلاحیتیں جو جنگی ہتھیاروں کی تیاری اور استعماری و سامراجی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی ہیں، جو وسائل و ذرائع، صلاحیتیں اور توانائیاں فضول اور بے کار صرف ہو رہی ہیں ان کی نوعِ انسانی کس قدر ضرورت مند اور محتاج ہے۔ یہ سب نہ ہوتا تو دنیا آج خوب صورت، زیبا اور رہنے کے قابل ہوتی۔

ضمنی طور پر توجہ رہے کہ "من فوقهم" اور "من تحت ارجلهم" سے مراد یہ ہے کہ آسمان و زمین کی تمام نعمتیں انھیں گھیر لیں گی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس بات کے لیے کنایہ ہو کہ یہ نعمات عمومیت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ عربی اور غیر عربی ادب میں کہا جاتا ہے کہ "فلاں شخص سرتاپا نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہے"، یعنی ہر طرف سے نعمتیں اسے گھیرے ہوئے ہیں۔

یہ آیت یہودیوں کی اس گفتگو کا جواب بھی ہے جو گذشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ یعنی اگر تم دیکھتے ہو کہ خدا کی نعمتیں تم سے منقطع ہو چکی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ذاتِ مقدسِ خدا میں بخل آگیا ہے یا اور اس کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، بلکہ یہ تو تمھارے اعمال ہی ہیں جو تمھاری مادی اور معنوی زندگی میں منعکس ہوئے ہیں اور تمھارے اعمال ہی نے تمھاری ہر طرح کی زندگی کو تاریک کر دیا ہے اور جب تک تم نہیں پلٹو گے یہ تاریکیاں بھی نہیں پلٹیں گی۔

آیت کے آخر میں ان میں سے ایک نیک اقلیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے، اگرچہ ان میں سے زیادہ تر تو بدکار ہی ہیں لیکن پھر بھی کچھ میانہ رو اور معتدل افراد ان میں موجود ہیں (جن کا معاملہ خدا کے نزدیک اور مخلوقِ خدا کے نزدیک دوسروں سے مختلف ہے (منهم امة مقتصدة وکثیر منهم ساء ما یعملون)۔

اہلِ کتاب میں سے نیک اور صالح اقلیت کے بارے میں سورۂ اعراف آیہ ۱۵۹ اور ۱۸۱ اور سورہ آلِ عمران آیہ ۷۵ میں بھی ایسی تعبیر دکھائی دیتی ہے۔

تفسیر نمونہ جلد چہارم اختتام کو پہنچی

Marfat.com

تفسیر نمونہ

جلد چہارم ــــــــــــــ کا ترجمہ

۸ رجب المرجب ۱۴۰۳ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۹۸۳ء

جمعۃ المبارک، ساڑھے سات بجے صبح

سیٹھ نوازش علی کے مکان ۱۸/ای ماڈل ٹاؤن لاہور میں

از قلم حقیر پر تقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم

اختتام پذیر ہوا

Marfat.com